قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2019 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

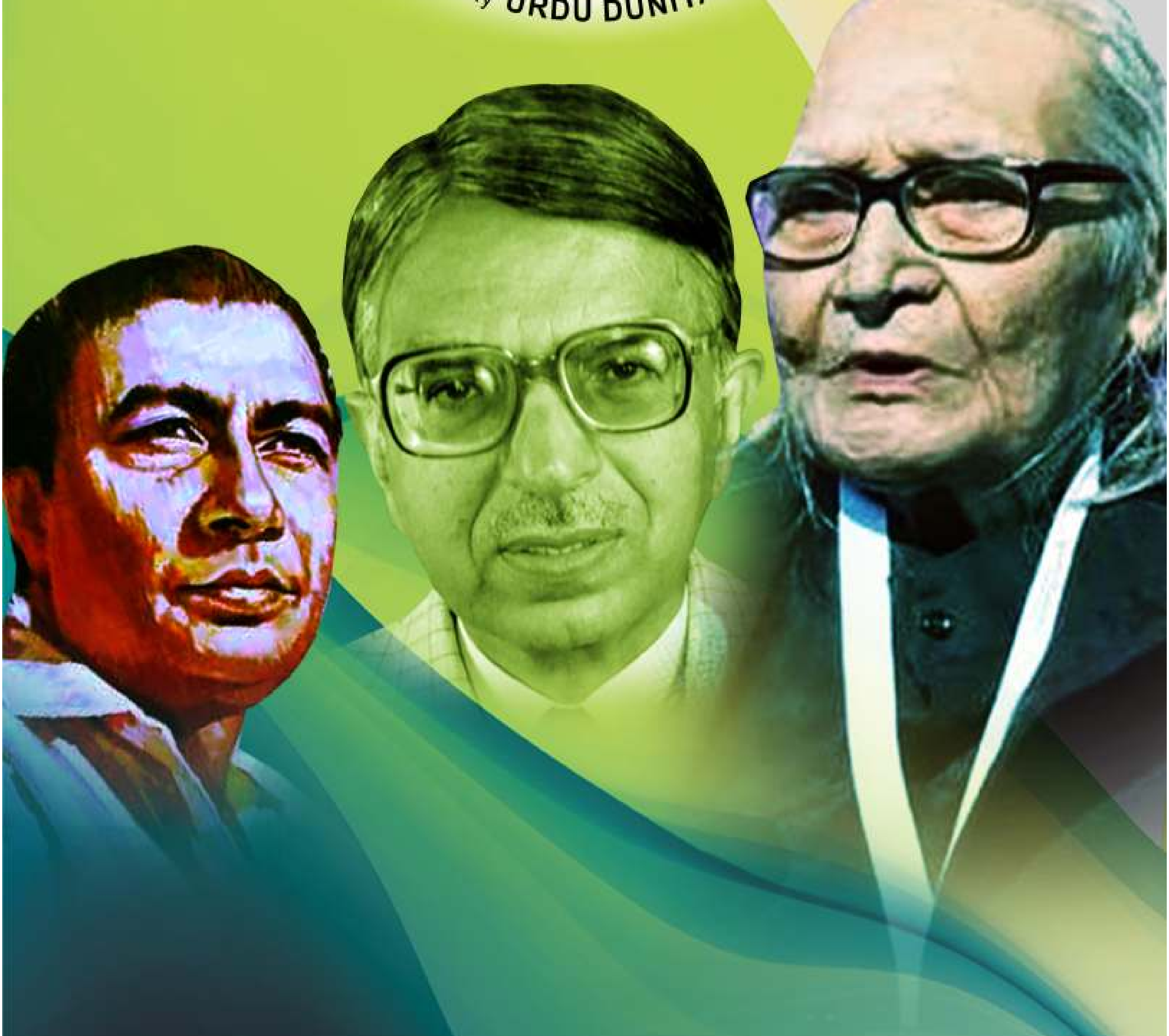

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

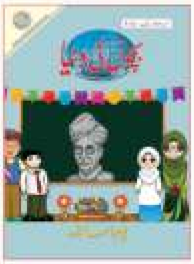

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

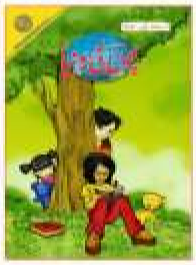

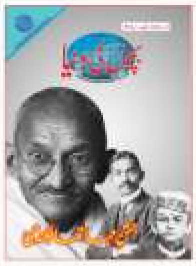

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 21، شمارہ: 03، مارچ 2019

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،۔

نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورت حال

جو زبانیں حالات کا سامنا نہیں کر پاتیں مردہ ہوجاتی ہیں — محمود شیخ 8

نقد و نگاہ

ولی دکنی — ابن کنول 12

سیماب اکبرآبادی — اسلم آزاد 15

رامائن کا منظوم اردو ترجمہ — نسیم احمد نسیم 18

خودآگہی کا سفر: نسائی شعری آواز — شاذیہ عمیر 20

اردو غزل اور علم کونیات — ای آر احمد عادل 23

یادِ رفتگاں

قاضی عبدالستار کا

ایک شاہکار تاریخی افسانہ — مظفر حسین سید 26

قاضی عبدالستار کا اسلوب — احمد خاں 29

حامدی کاشمیری: شخصیت اور شاعری — پریمی رومانی 33

ساحر لدھیانوی ایک عظیم فنکار — ناظمہ انصاری 36

بابِ تجزیہ

سیتا ہرن کی سیتا — ذکیہ مشہدی 39

سریندر پرکاش کا افسانہ آرٹ گیلری — احسن ایوبی 43

سلسلۂ صحافت

اردو صحافیوں کی پیشہ ورانہ تربیت — ضیاء الرحمٰن غوثی 46

روزنامہ 'منصف' کی ادبی خدمات — شیخ عمران 49

اردو ادب اور عالمی مسائل

اردو فکشن میں عالمی مسائل — شہناز رحمٰن 51

اردو سفرناموں میں عالمی امن اور

انسان دوستی کا پیغام — الطاف احمد 57

اردو زبان و ادب اور عالمی امن — شاہد اقبال 61

گمنام فنکار

پنڈت ماتر دت مشر کیف

واصفی ردولوی — انور حسین خاں 63

فنونِ لطیفہ

فلم میکنگ اور ڈراما — مزمل سرکھوت 65

خصوصی گفتگو

شاعری ہر دور میں حالات کی ترجمان

رہی ہے: وقار مانوی — عبدالحی 68

کمپیوٹر

دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنا 70

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 72

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

اردو زبان و ادب کے حوالے سے جو مباحث برسوں سے جاری ہیں زیادہ تر انہی مسائل پر اب بھی ارتکاز ہے۔ جبکہ دوسری زبانوں میں مسائل اور مباحث تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی زبان اور ادب کے مستقبل پر بھی غور و فکر کر رہے ہیں۔ مگر ہماری سوچ کی سوئی شاید ایک ہی نقطے پر ٹھہری ہوئی ہے۔ اس لیے ہم ان لسانی اور ادبی مباحث کی طرف توجہ نہیں دے پاتے جن سے زبان کو نئی زندگی ملے اور ادب کو نئی تازگی حاصل ہو۔

دراصل ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہ ذہنی زوال اور انحطاط کا دور ہے۔ اس دور میں ہم میں سے بیشتر لوگ فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ جو مسائل ہمارے لیے مرکزیت کے حامل ہیں ان پر مکالمے کے دروازے شاید بند ہو چکے ہیں اور ہم ان مباحث میں محصور ہیں جن کا کوئی افادی پہلو نہیں ہے۔ جبکہ ہمیں ان مسائل پر زیادہ غور و فکر کرنا چاہیے جو معاشرے کی بہتری اور فلاح و بہبود کے لیے لازمی ہیں۔ ہمیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ گلوبلائزیشن کے اس عہد میں ہمارے معاشرے کے مسائل اور تقاضے کیا ہیں۔ جب تک ہم معاشرے کے بنیادی مسائل اور تقاضوں کو نہیں سمجھ پائیں گے تب تک ہمیں زبان و ادب کے مسائل کا صحیح ادراک بھی نہیں ہو پائے گا۔

آج منظرنامہ بدل چکا ہے اس لیے بدلتے ہوئے عہد میں ہمیں اپنی سوچ کے زاویے کو بدلنا ہوگا اور جدید معاشرے سے ہم آہنگ ہو کر مسائل پر سوچنا ہوگا۔ آج ہمیں جہاں تحفظ اردو کے حوالے سے نکات پر غور کرنے کی ضرورت ہے وہیں ہمیں تہذیبی وجود کے تحفظ پر بھی سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کیونکہ ہماری زبان اور تہذیب ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی زبان اور تہذیب کے تحفظ کے لیے ان تمام منفی نظریات کو مسترد کریں جن سے سماج میں انتشار یا خلفشار پیدا ہوتا ہے اور ان افکار کی تبلیغ و تشہیر کریں جن سے معاشرے میں توازن اور اعتدال پیدا ہو کیونکہ ادب کا بنیادی کام عظیم انسانی اقدار اور کردار کی تشکیل ہے۔ اس محاذ پر شاید ہمیں زیادہ کامیابی اس لیے نہیں مل پاتی ہے کہ ہم نے اپنی توجہ کا مرکز و محور تبدیل کر دیا ہے۔ آج عالمی سطح پر نظریاتی انتہاپسندی اور ادعائیت کے جو مسائل ہیں ان پر بھی ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ سماج کی بہتری کے لیے بھی سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کیونکہ ادب سے ہی بہتر معاشرے کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ اگر ادب نہیں ہوگا تو یہ پورا معاشرہ ایک وحشی سماج میں تبدیل ہو جائے گا۔

ادب کے تعلق سے ہماری یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ہم عصر حاضر سے ہم آہنگ نئے موضوعات کی جستجو کریں اور رسائل اور جرائد میں ایسی تخلیقات کی اشاعت ترجیحی طور پر کریں جن میں سائنسی، تکنیکی، اخلاقی اور معاشرتی مضامین ہوں یا اقتصادیات، آثارِ قدیمہ یا دیگر اہم موضوعات اور معلومات پر تحریریں ہوں اور ہمیں اپنی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے رسائل و جرائد کی اشاعت میں بھی تعاون کرنا چاہیے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ آج ادبی رسائل فروخت نہیں ہو پاتے۔ لکھنؤ اور دلی جیسے مراکز میں بھی ادبی رسالے خریدنے والوں کی تعداد کم ہے۔ یہ بہت حیرت کی بات ہے کہ ایک زمانے میں اردو کے ایک اہم رسالے کے خریداروں کی تعداد صرف تین تھی۔ آج بھی تقریباً صورتِ حال کم و بیش یہی ہے کہ اردو رسالوں سے لوگوں کا رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ جبکہ یہی رسائل زبان و ادب کے فروغ کا سب سے بہتر وسیلہ ہیں۔ ہم اپنی زبان کے تئیں اتنے بے حس ہیں کہ نہ اپنے بچوں کو اردو پڑھا رہے ہیں اور نہ ہی اردو کے رسائل اور اخبارات خرید کر پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں اب اپنی زبان کے تعلق سے ہندوستان کے طول و عرض میں ایک سروے کی ضرورت ہے تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے۔ قومی اردو کونسل اس تعلق سے بہت سنجیدہ ہے اور مختلف علاقوں میں رابطوں کے ذریعے اردو زبان کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر رہی ہے تاکہ اس کی روشنی میں ایک لائحہ عمل مرتب کیا جائے اور اردو کے فروغ اور تحفظ کی کوششوں کو تیز تر کیا جائے۔ اسی مقصد کے تحت جہاں مختلف علاقوں میں رابطہ تقریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے وہیں ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'سوال نامہ' کے ذریعے اردو سے تعلق رکھنے والے ہر فرد سے اردو زبان کی زمینی صورتِ حال کے تعلق سے رابطے کی کوشش کی جا رہی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو سے محبت کرنے والوں کا بہت مثبت ردِ عمل مل رہا ہے۔ اگر اس طرح ہندوستان کے ہر علاقے کے باشعور افراد نے اس سلسلے میں تعاون کیا تو یقیناً اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگہی بھی ہوگی اور ہم یہ جان پائیں گے کہ اپنی زبان اردو کے فروغ کے لیے ہمیں کن کن سطحوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

✍ اردو دینا کا تازہ شمارہ کل ملا۔ وہی 'عادتاً' ورق پلٹے۔ اب ذرا صحت بہتر ہو رہی ہے اس لیے ایک آدھ صفحہ پڑھ بھی لیتا ہوں۔ صفحہ 23 دیکھ کر کوئی حیرت سی حیرت ہوئی!! سچ تو یہ ہے کہ خوشی بھی ہوئی۔ اس میں اس حقیر، فقیر و ناچیز کا 'چرچا' ہے۔ بہت دن پہلے کہیں لکھا تھا کہ وہ کون سا آدمی ہے جسے آئینہ میں اپنا چہرہ اور تحریر (چھاپہ) میں اپنا نام دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی؟ حقیقت بیان کر رہا ہوں اس قول کے اصل معنی پھر سے عیاں ہوئے۔ ایک افسانہ 'پتھر نہیں مرتے' کوئی 44 / 45 سال پہلے لکھا تھا اس افسانے پر دہلی کے رکن الدین صاحب نے بھرپور تاثر لکھا ہے۔ کہ الفاظ نہیں مرتے!!

❖ **مقصود الٰہی شیخ**: بریڈفورڈ، برطانیہ

✍ 'اردو دنیا' جنوری 2019 کا اداریہ پڑھنے کے بعد ہمیں آپ کی علمی، ادبی اور باطنی صلاحیتوں کا علم ہوا۔ 'ہماری بات' میں کچھ موثر عمل پیرا باتیں ہمیں پڑھنے کو ملیں اور اردو کے فروغ کے لیے آپ کے تازہ جذبات و اقدامات سے بھی ہمیں آگاہی ہوئی۔ بقول آپ کے اردو زبان ایک نئی راہ سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے درآنحالیکہ اردو رسم الخط دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہے اس کے باوصف شعر و ادب کی دنیا نئی نسلوں کو متوجہ اور راغب کرنے پر کامیاب ہے۔

محترمہ قمر جمالی کا مضمون 'داغ کی شاعری میں خوف کی جمالیات' مطالعہ کا مرکز بنا۔ قمر جمالی نے اپنے نام کے ساتھ جو جمالی رکھا ہے اسی جمالی حسن کو داغ کی شاعری میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور جہاں تک موصوفہ نے اس موضوع سے منسلک اشعار دیے ہیں ان میں کہیں بھی خوف و تردد کا شائبہ تک نظر نہیں آتا بلکہ خوف و تردد تعیش کی وادیوں میں رقص فرما نظر آتا ہے۔

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

بقول قمر جمالی خوفِ خدا کا عنصر بھی ڈھونڈنے ہی سے مل پاتا ہے۔ گناہوں سے شرمسار ہونے کا خوف اسی کو لاحق ہوگا جبکہ ان کے اشعار میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں جو قمر جمالی کی نظر سے نہیں گزرے۔

روزہ رکھو، نماز پڑھو، حج ادا کرو
اللہ یہ ثواب بھی ہے کس عذاب کا

داغ دہلوی

میں تو توبہ کر کے اور گناہ گار ہوگیا
.... پریشان ہوگیا

وغیرہ وغیرہ

الحاصل تاثراتِ قمر جمالی کے مضمون میں خوف کے تعلق سے لغاتی معنوں کا خلاصہ تو ہے لیکن داغ کی شاعری میں نہ خوف دکھائی دیتا ہے نہ خوف کی جمالیات — داغ کا دیوان جمالیاتی نقش و معاشقے سے لبریز ہے جس کے قائل بیشتر نقاد و مبصر ہو چکے ہیں۔

مرحوم یوسف ناظم کے طنز و مزاح پر رفیق اشفاق کا مضمون بعنوان 'اردو طنز و مزاح کا یوسف گم گشتہ' ہی کافی تھا۔ مضمون نگار نے یوسف گم گشتہ کو مزید یوسف ناظم کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔ یوسف ناظم کی تصنیفات کا مطالعہ کرتے ہوئے جو انھوں نے ترتیب وار یوسف ناظم کی نثر نگاری اور خاکہ نگاری کا احاطہ کیا ہے وہ برحق و من و عن ہے کیونکہ یوسف ناظم گر بسیار گو نہ ہوتے تو کم از کم مشتاق یوسفی عظیم ظرافت نگاری کی صف میں نہ سہی ان کے پس پشت تو دکھائی دیتے۔ میں رفیق اشفاق سے اس عنوان کو مزید گم گشتگی کا حاصل قرار دیتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یوسف ناظم فرقت کاکوروی، برق آشیانوی، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن اور فکر تونسوی کی سطح تک کو بھی چھوتے دکھائی نہیں دیتے۔ الحاصل تاثرات اس رو سے یوسف ناظم گم گشتگی کا ہی حصہ بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی پر منظور احمد کا، ماجد الہ آبادی پر ندیم احمد کا، مہجری ادب برطانیہ اور حبیب حیدر آبادی پر عزیز سہیل کے مضامین معلوماتی دریچوں میں خوشبو کی طرح پھیل گئے ہیں۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

✍ اردو دنیا فروری 2019 نظر نواز ہوا۔ سرورق پر تحریر کردہ جملہ 'قومی کونسل بین الاقوامی جریدہ' ادبی و ثقافتی دنیا کا معیار لیے ہوئے ہے شاید ہی اردو کا کوئی رسالہ ایسا شائع ہوتا ہو۔ اردو اکادمیوں کے پاس بجٹ ہونے کے باوجود اس معیار کا رسالہ شائع نہیں کر سکتے۔ مرزا خلیل احمد بیگ کا انٹرویو عبدالحی صاحب نے خوب لیا۔ انھوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ جوابات دیے۔ ان کا یہ کہنا کہ نوجوان نسل اردو رسم الخط سے ناواقف ہوتی جا رہی ہے۔ اور آخر میں یہ پیام کہ اپنے احباب اور ملنے جلنے والوں کو اردو پڑھائیں اور اردو رسائل کا مطالعہ کرائیں۔ ہماری بات میں آپ نے عصری ٹکنالوجی کی بات کی ہے اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو ترقی نہیں کر پائی۔ اس کی وجہ کیا ہے اردو زبان و ادب کو قائم رکھنے کے لیے کم از کم اپنے خاندان کے ایک فرد کو اس قابل بنائیں کہ وہ آپ کا

اثاثہ سنبھال کر رکھیں۔ ورنہ وہ دیمک یا کباڑی کے حوالے ہو جائے گا۔ تمام مواد اپنی جگہ ہے مگر یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ جنوبی ہند میں کئی اردو یونیورسٹیاں ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں شعبہ ہائے اردو بھی ہیں۔ یہاں کے وہی اساتذہ شائع ہوتے ہیں جو شمال کے ہیں۔ جب کبھی بھی کسی بھی موضوع پر مضامین لکھے جاتے ہیں تو جنوبی ہند کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یا پھر سرسری ذکر کیا یہاں کے ادیب وشعراء کا ایک قافلہ ہے۔ مگر...

خان حسنین عاقب نے اردو کے معاصر غیر مسلم شعرا و ادبا کا اچھا جائزہ لیا اور جنوب کے وہ نام ہیں جو شمال میں رہتے ہیں۔ نواب میر عثمان علی خان آصف جاہ (سلطان العلوم) نے ہمیشہ شمالی ہند کے ادبا وشعرا کی پذیرائی کی دکن میں جو غیر مسلم شعرا ہیں اس کا ذکر نہیں۔ کیونکہ یہ شعرا و ادبا صاحب کتاب ہیں۔ اسلم جمشید پوری کا مضمون 2018 کا فنکشن اور فنکشن تنقید ایک جائزہ بھی کچھ اسی طرح ہے۔ صرف حمید سہروردی کا حوالہ ہے۔ جنوب کی یونیورسٹی کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس کو قلم اٹھانا چاہیے۔ سوال نامہ برائے انٹرویو کے ذریعہ آپ نے اردو کی خدمت کرنے والوں کو ایک اچھا موقع دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کے ادبا وشعرا شائع ہونا نہیں چاہتے یا پھر وہ اس قابل نہیں۔

❖ **ڈاکٹر م ق سلیم**: صدر شعبۂ اردو شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

✍ اردو دنیا فروری کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ انٹرویو کے کالم کی تھوڑی تبدیلی خوش آئند ہے جاری رکھنا بھی ضروری ہے تاکہ معلومات میں اضافہ بھی ہوتا رہے اور نئی ترجیحات کے ساتھ نئے خیالات ونظریات بھی سامنے آتے رہیں۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ سے لیا گیا انٹرویو بھی پچھلی روایات کے ساتھ نئے افکار و آرا پر مشتمل ہے۔ نئی نسل اگرچہ اردو رسم الخط سے کم واقف ہے مگر اردو زبان میں دلچسپی ضرور رکھتی ہے اور زبان کا استعمال بھی عام گفتگو میں کرتی رہتی ہے۔ اردو کو دیوناگری میں بھی خوب بڑھاوا مل رہا ہے اور سوشل میڈیا نے بھی اس پیش رفت میں خاطر خواہ کردار ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے 2018 کا فکشن اور فکشن تنقید کا بہت ہی باریکی کے ساتھ تحقیقی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔ جس سے فکشن اور اس کے متعلقات کا پورا عالمی منظر نامہ ہمارے سامنے آگیا ہے۔ سات صفحات پر مشتمل یہ نہ صرف افسانوی ادب پر تبصرہ یا تجزیہ ہے بلکہ افسانے کی معنویت اس کی اہمیت افسانہ نگاروں کی فکری نفسیاتی اور ادبی رجحانات کے ساتھ افسانوی ادب میں گرانقدر اضافے کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ افسانوی مجموعوں کی اشاعت نے کئی نئے اور اہم ناموں کو بھی ادبی دنیا میں متعارف کرایا ہے۔

❖ **ڈاکٹر رضوان الرضا رضوان**: طبیہ کالج کٹولی ملیح آباد لکھنؤ

✍ مکرمی! ماہِ جنوری 2019 کا شمارہ ہمدست ہوا۔ جنوری کے شمارے میں صفحہ نمبر 8 اور 9 پر ڈاکٹر انور ادیب صاحب کا مضمون 'اردو زبان اور مولوی عبدالحق' شائع ہوا جس میں مولوی صاحب کی اردو خدمات کا اعتراف کیا گیا جبکہ قیام اورنگ آباد (مہاراشٹر) اسی طرح انگریزی اردو لغت کے ترتیب دینے میں مولوی صاحب کے عزیزی شاگرد شیخ چاند پٹنی کا تذکرہ نظروں سے اوجھل رہا۔ بموجب تحقیقی مقالہ 'شیخ چاند حیات اور ادبی خدمات' محقق ڈاکٹر سحر سعیدی کے، مولوی صاحب کے زندگی کا سنہری دور اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے قیام کا تھا، مولوی صاحب کی جدوجہد اور ادبی خدمات میں اورنگ آباد کو ایک خاص مقام حاصل ہے جس کا خود مولوی صاحب کو بھی اعتراف تھا۔ مولوی عبدلحق صاحب تقریباً 27 برس 1911 تا 1938 اورنگ آباد میں رہے، اورنگ آباد ہی وہ شہر ہے جہاں مولوی صاحب کی کایا پلٹ ہوئی اور وہ اردو والے عبدالحق کہلائے۔ اورنگ آباد میں ان کا قیام شہر سے باہر رابعہ درّانی کے مقبرے (بی بی کا مقبرہ) کے احاطے سے متصل بنگلے کے ایک حصے میں تھا اور دوسرے حصے میں انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا۔ مولوی صاحب اردو کے تھے اور اردو ان کی تھی۔ اورنگ آباد کو دو دیوانوں نے خوب چاہا ایک اورنگ زیب عالمگیر اور دوسرے مولوی عبدالحق 24-1923 میں عثمانیہ کالج اورنگ آباد کا قیام عمل میں آیا جس کے پہلے پرنسپل کی حیثیت سے مولوی صاحب نے اپنی خدمات انجام دیں آج بھی وہ گورنمنٹ کالج اورنگ آباد کے نام سے مشہور ہے۔ انگریزی اردو لغت کے ترتیب دینے میں مولوی صاحب کے عزیز و لائق شاگرد شیخ چاند پٹنی کا بھی ساتھ رہا۔ شیخ چاند پٹنی نے اردو میں سب سے پہلا علمی و تحقیقی مقالہ سودا مولوی صاحب کی زیر نگرانی تکمیل کیا۔ ماہ نومبر 2018 کے شمارے میں ہماری بات اداریہ میں مدیر ڈاکٹر عقیل احمد نے جو نظریہ پیش کیا ہے کہ "شخصی نوعیت کے انٹرویوز شائع کیے جاتے ہیں ان میں بے معنی اور بے جا تشہیری مواد ہوتا ہے۔ اس لیے اردو کے فروغ کے لیے ایک سوالنامے کی شکل میں جو قدم اٹھایا گیا وہ قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر قاضی نوید احمد صاحب کا مضمون 'اورنگ آباد کے صوفیائے عظام' قابل مبارکباد ہے جس میں انھوں نے صرف شہر اورنگ آباد کی معلومات دی ہے کاش وہ پورے ضلع اورنگ آباد کے صوفیائے عظام کے بارے میں معلومات فراہم کرتے تو ایک ضلع کا ریکارڈ بن جاتا۔

❖ **عبدالکریم خمار پٹنی**: رشید پورہ، حنا نگر، اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ اردو دنیا' جنوری کا شمارہ، بالخصوص، سرورق پر یوم جمہوریہ کی پریڈ، قومی پرچم کے دیدہ زیب رنگوں کی بوقلمونی اور معیاری مضامین سے مزین منصۂ شہود پر آیا۔ 'ہماری بات' کے تحت مدیر صاحب کا یہ اعلان کاملاً قابلِ تائید ہے کہ اردو ایک زبان ہی نہیں، یہ ایک تہذیب ہے۔ اس شمارے میں احمد علی جوہر صاحب نے اپنے مقالے میں اردو کے ارتقا کی طویل تاریخ کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آخر میں اردو و ہندی دو زبانوں کے باہمی مستحکم رشتے کی بھی بخوبی خط کشی ہوئی ہے۔ صفحہ 12 پر مروجہ ہو چکے ایک غلط لفظ کی صحیح صورت 'حب الوطن' ہی درکار تھی۔ اسی طرح صفحہ 11 پر 'وجہ' عربی اسم مؤنث لفظ کی ایک بار جمع 'وجوہ' ہو جانے کے بعد دوبارہ اعادہ کر کے 'وجوہات' (حالانکہ یہ لفظ بھی اردو ادب میں مروجہ ہو چکا ہے) لکھنا یکسر غلط ہے۔

اسی طرح قمر جمالی صاحب نے مرزا داغ کی شاعری میں 'خوف' کے جذبے کو نشان زد تو کرنے کا نصب العین ضرور طے کیا ہے، لیکن غائرانہ نظر سے دیکھیں تو وہ شعری حوالوں کے ساتھ، صحیح خط کشی ہرگز نہیں کر پائے ہیں۔ ہندی کے شہرۂ آفاق کوی گوسوامی تلسی داس جی نے اپنے ہندو صحیفہ گرنتھ 'شری رام چرِت مانس' میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ۔ ''بھے بنُو ہوئی نا پریتی۔'' 'معنی ڈر (خوف) کے بغیر محبت نہیں ہو سکتی ہے'۔ مضمون نگار کی تخلیقی صلاحیت دیدنی اور قابلِ مدح ہے۔

جناب محمد اکبر نے فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عورتوں کے مختلف مسائل نشان زد کیے ہیں، بالخصوص آزادی نسواں کی عصرِ حاضر میں اشد ضرورت کی جو صحیح خط کشی کی گئی ہے، وہ قابلِ صد ستائش ہے۔ 'اردو دنیا' کی دیگر جرائد سے ایک اہم انفرادیت یہ قائم ہو چکی ہے کہ اس میں پے در پے متنوع نظریات سے اعلیٰ و ارفع موضوعات پر مضامین کی اشاعت بدستور جاری ہے، جس سے مجلّے کا معیار بتدریج بالا سے بالاتر ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

❖ **کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک، پٹیالہ، پنجاب

✍ ماہ جنوری 2019 کا ماہنامہ 'اردو دنیا' موصول ہوا۔ انور ادیب صاحب کا مضمون 'اردو زبان اور مولوی عبدالحق' پڑھ کر مولوی عبدالحق صاحب سے متعلق ایک اہم واقعہ یاد آگیا۔ 61-1960 میں یہ خاکسار حلیم مسلم انٹر کالج، کانپور میں زیر تعلیم تھا۔ انجمن ترقی اردو ہند کے اس وقت کے سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور نے حلیم مسلم انٹر کالج کانپور میں انجمن ترقی اردو ہند کی ایک کانفرنس منعقد کی تھی۔ اس کانفرنس میں مولوی عبدالحق صاحب نے کراچی

(پاکستان) سے تشریف لاکر رونق بخشی تھی۔ حلیم کالج کے وسیع وعریض ہال میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب بحیثیت مہمانِ ذی وقار رونق افروز تھے۔ زندگی کی نو دہائیاں پار کرنے کے بعد بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب اردو زبان وادب کے لیے بہت کچھ کرگزرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اس کانفرنس میں ناچیز احمد مکرم نے بہ نفس نفیس مولوی عبدالحق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل کی۔ عہد سرسید میں عبدالحق ایم اے او کالج علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ سرسید احمد خاں کی نگاہِ کرم سے ہی وہ علم وعمل کے پیکر اور اردو تحریک کا سرچشمہ بنے۔ انجمن ترقی اردو ہند کی متذکرہ کانفرنس میں بحیثیت طالب علم اپنی حاضری اور بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے دیدار کے واقعہ کو راقم الحروف احمد مکرم اپنے دلی جذبات کے اظہار کے طور پر ان الفاظ میں تحریر کر رہا ہے۔ میری آنکھوں نے ان آنکھوں کو دیکھا ہے، جن آنکھوں نے سرسید کی آنکھوں کو دیکھا ہے۔

❖ **احمد مکرم**: بی۔195، آواس وکاس کالونی، جھانسی، یوپی

'اردو دنیا' جنوری 2019 یوم جمہوریہ اور نئے سال کی مبارکبادیوں کی مسحورکن سوغات لیے وصول ہوا۔ اداریہ میں 'ہماری بات' کے پس پردہ اس تہنیت میں ذمہ داریوں سے آگاہی کی کسک پوشیدہ ہے اور احتساب کیا گیا ہے۔ دیکھیں کہاں تک ہم لوگ ان واجبات سے عہدہ برآ ہوسکتے ہیں۔ آپ کی بات کے تحت چند مراسلوں میں ناانصافیوں اور محرومیوں کی سنجیدہ شکایات درج ہیں جن کا سدباب گوکہ دشوار ہے، پر ناممکن نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ 'اردو اور ہندی کا رشتہ' مضمون میں یہ لکھا ہے کہ ''ایک عام اندازے کے مطابق اردو میں 70 فیصدی الفاظ ہندی کے ہیں اور صرف بیس یا تیس فیصد الفاظ اردو میں عربی اور فارسی کے ہیں........'' اگر یہ بیان درست ہے تو پھر اردو کا وجود ہی کہاں باقی رہ جاتا ہے! وہ تو تقریباً معدوم ہوجائے گی۔ اب اس طرح کے غیر مدلل اندازے میں کوئی انتقاد کیا کرے۔ یہ تو بادی النظر میں غیر ذمہ دارانہ بیان لگتا ہے۔ اس لیے ایسے چاپلوس پلندے قابل اعتنا ہرگز نہیں۔ 'داغ کی شاعری میں خوف کی جمالیات' کے تحت ایک منطقی قضیہ (Premiss) قائم کیا گیا ہے، یعنی 'خوف کی جمالیات' (The Aesthetics of Apprehension) جس سے ایک شاعر یا عاشق بار بار نبرد آزما ہوتا ہے۔ مصنفہ نے جبر وقدر کے عقیدے، ہندوستانی تہذیب، لغوی مطالب، مشاہیر کی آرا اور ذاتی وضاحت کی مدد سے درج بالا قضیہ یعنی خوف کی جمالیات کی بلاشک وشبہ واضح تشریح کی ہے اور اس قضیہ کی مدد سے 'داغ کی شاعری میں خوف کی جمالیات' جیسے ادبی قضیہ کو اخذ کیا ہے۔ بس ذرا کنفیوژن کلام داغ سے متعلق حسرت موہانی اور مولانا حالی کی اختلافی بلکہ منفی آراء سے ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ علماء کی ادبی خدمات میں امن وآشتی کے عناصر خوش کن ہیں۔

ص 35 پر سوالنامہ برائے انٹرویو کے تحت ایسے 25 کارآمد سوالات دیے گئے ہیں جن کی مدد سے مشاہیر ادب سے درکار افادی معلومات کا حصول اور غیر ضروری مباحثوں سے اجتناب کیا جاسکتا ہے۔ ص 36 تا ص 55 تک اردو کے مشاہیر پر بیش بہا معلومات رقم کی گئی ہیں۔

مضمون کے اختتام بے سہارا مزدوروں کی بہبودی کے لیے کچھ سفارشات دی گئی ہیں جو مناسب تو ہیں لیکن دشوار گزار۔ انگریزی ادب کے شاہکار فن پارے بہت عمدگی سے لکھا ہوا مضمون ہے۔ کمپیوٹر کورس سے متعلق حسب سابق ایم-ایس ورڈ پر کام کرنا بہترین سلسلہ ہے۔

❖ **مصطفیٰ ندیم خان غوری**: اورنگ آباد، مہاراشٹر

آپ کی ادارت میں ماہنامہ 'اردو دنیا' مزید نکھرتا جارہا ہے۔ جنوری 2019 کے تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ پچھلے شمارے میں جو آپ نے زبانوں کے زوال کے تحت اداریہ لکھا تھا وہ غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آج اردو کے ساتھ ہمارا کیا رویہ ہے یہ سب جانتے ہیں۔ اردو کی روٹی کھانے والے ہی اردو میں اپنے بچوں کو پڑھانا پسند نہیں کرتے۔ یہ المیہ دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس شمارے میں آپ کے مطابق اردو کے فروغ کے لیے نئے امکانات پر غور کرنے سے اردو کی ترقی میں اہم رول ادا ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں، ہمارے ملک میں ادارہ 'قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو' کی خدمات سب سے بہتر ہیں اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ واضح رہے کہ میں 'وکرم یونیورسٹی اجین' سے 'اردو میں مہاتما گاندھی کی خدمات کا جائزہ' کے تحت پی ایچ ڈی کررہی ہوں۔

❖ **روشن آرا انصاری**: ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، وکرم یونیورسٹی، اجین، مدھیہ پردیش

ماہ جنوری 2019 کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ سرورق پر تصویر سے 26 جنوری یوم جمہوریہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ شیخ عقیل احمد نے نئے سال پر نئے انداز کا اداریہ لکھا ہے جس میں نئی امیدیں ونئی روشنی اردو کے تعلق سے پیدا ہوگی۔ مدیر صاحب نے اردو زبان وادب وثقافت کو فروغ دینے کے لیے عمدہ نظریہ پیش کیا ہے۔ انور ادیب نے اردو زبان اور مولوی عبدالحق کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون میں ان کی ادبی وعلمی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ قمر جمالی نے داغ کی شاعری میں خوف کی جمالیات مختلف اشعار کے ذریعے پیش کی ہے۔ فاروق اعظم قاسمی نے مضمون میں جدت وندرت پیدا کی ہے۔ انھوں نے فیض یافتگان دیوبند کی تصانیف وتخلیقات میں امن ویک جہتی کے عناصر تلاش کیے ہیں۔ محمد رکن الدین نے اردو کی نئی بستیوں کے کچھ نمائندہ افسانہ نگار میں صرف چند کا ذکر کیا ہے ورنہ اردو کی نئی بستیاں یوروپ امریکہ، خلیجی ممالک میں بھی ہیں وہاں بھی افسانہ نگار مل جائیں گے ان کا احاطہ ہونا ضروری ہے۔ نکہت امین نے سائنسی علوم کے ترجمے اور دارالترجمہ اور عثمانیہ یونیورسٹی میں بھرپور و تفصیل سے جائزہ لیا ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ میں کون کون سے سائنسی مضامین کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ عاتکہ ماہین نے بچوں کی نظموں میں جدید موضوعات پر اچھا لکھا ہے۔ سوال نامہ برائے انٹرویو اچھی شروعات ہے اس سے مختلف ذہنوں کی صلاحیت وقابلیت اردو کے تعلق سے ظاہر ہوگی اور نئی تجاویز حاصل ہوگی۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کا ذکر تفصیل سے ان کے شعری حوالوں سے کیا گیا ہے۔ 'مجری ادب برطانیہ اور حبیب حیدرآبادی' عزیز سہیل نے ان کی ادبی خدمات پر جو کچھ لکھا ہے معلومات آفریں مضمون ہے۔ 100 صفحات کا یہ شمارہ اپنے اندر گوناگوں صفات لیے ہوئے ہے۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**، سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ، نظام آباد، تلنگانہ

محبی، نئے سال کا نیا اداریہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی بنا پر پسند آیا، آپ کی تصویر کا نیا رخ بھی اچھا لگا۔ مرحوم وقارالحسن صدیقی صاحب پر بھائی پرویز اشرفی صاحب کا مضمون پڑھا اچھا لگا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ، اچھے لوگوں سے ہوئی جاتی ہے دنیا خالی۔ پرویز بھائی شروع سے ادبی ذوق کے دلدادہ رہے ہیں، وہ ہمارے بڑے بھائی، انوار احمد خان، سبکدوش ایس. او. کے ہم جماعت رہے ہیں۔ اشرفی صاحب ہمارے والد ماجد مرحوم مغفور، ماہر سہہ لسان، ہیڈ مولوی عبدالوحید خاں غازی شمسی کے شاگرد عزیز رہ چکے ہیں۔ جنوری 2019 کا پورا شمارہ مواد ومشمولات کے نقطۂ نظر سے انتہائی جامع شمارہ ہے، میں تمام قلمکاروں کو ان کی عمدہ تخلیقات نیز نئے سال کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

❖ **شکیل سہسرامی**: پٹنہ بہار

■

جو زبانیں حالات کا سامنا نہیں کرپاتیں مردہ ہو جاتی ہیں

محمود شیخ

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

ڈاکٹر محمود شیخ ادب کے ایک اچھے پارکھ، ناقد اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، عالمی ادبیات اور رجحانات پر ان کی گھری نظر ہے۔ انھوں نے ماہنامہ 'اردو دنیا' کے سوال نامے کے جواب میں جو باتیں تحریر کی ہیں وہ فکرانگیز اور چشم کشا ہیں۔ محبانِ اردو کو ڈاکٹر محمود شیخ کے معروضات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے تاکہ اردو زبان کے تعلق سے حقیقی منظرنامہ لوگوں کے سامنے آسکے۔

ماہنامہ اردو دنیا میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل و صورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
س: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی سوادگی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟
س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟
س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت نظر انداز کی گئی ہے؟
س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنے کالج یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟
س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: زبانوں کی موت کی کئی وجوہات ہوسکتی ہے: (1) یوں تو تہذیبی اور ثقافتی مسائل کے حل میں ناکام ہونے کے بعد کسی بھی زبان کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا لیکن موجودہ زمانے میں سیاسی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کو حل کرنے کی اضافی ذمےداری نے زبان کے سامنے اس کی بقا اور تحفظ کے مسائل کھڑے کردیے ہیں۔ فطری، جذباتی امیجری زوال پذیر ہے۔ زبانیں اپنے غیر جذباتی دائرۂ کار میں اضافہ کرنے پر مجبور رہیں تاکہ اپنا وجود برقرار رکھ سکیں۔ اردو بھی اسی جدوجہد میں شامل ہے۔ (2) سیاسی طور پر مفلوک الحال قوم کے لیے اپنی زبان کی حفاظت کرنا دشوار ہوتا ہے۔ (3) جہاں تک اردو زبان کا سوال ہے (الف) عوام کے دل میں اپنی ہی قومی زبان سے بےتوجہی عام ہے (ب) ناقدین ادب کی تنقیدیں عوام کے دل میں اردو زبان و ادب کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے میں ناکام ہیں (ث) اردو اداروں کو کشادہ ذہنی کے ساتھ اخلاقی بنیاد پر کام کرنے کی ضرورت ہے (ج) اردو زبان پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں اختیاری مضمون کی طرح پڑھائی جاتی ہے۔ دیگر کسی بھی ہندوستانی زبان کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ تمام مضامین اسی زبان میں مہیا کرائے جاتے ہیں۔ اردو زبان میں تمام سبجیکٹ (Subject) کا مطالعہ کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ معیار پر تعلیم حاصل کرنے والے طلبا پرائمری، مڈل اور ہائر سیکنڈری کلاسیز میں پڑھائے گئے اردو ادب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے مطالعے میں گہرائی بھی نہیں ہوتی۔ (چ) اردو زبان و ادب کی معروف شخصیتیں بھی بعض اوقات کچھ ایسی بات کہہ جاتی ہیں جس سے زبان کی وسعتِ بیانی کو ٹھیس لگتی ہے۔ مثلاً ایک بار کشور ناہید کا مضمون دہلی کے ایک رسالہ میں شائع ہوا جس میں Solo Living کا

متبادل اردو میں نہ ہونے کی بات کہی گئی تھی میں نے مدیر کو لکھا Solo Living کو اردو میں 'تنہا رہائش' کہیں گے۔ پھر یہ بھی لکھا کہ آپ اگر انگریزی زبان پر عبور رکھتی ہیں تو مجھے بتائیں کہ 'دامِ ہر موج'، 'خامۂ خونچکاں'، 'نقشِ فریادی' کا انگریزی کیا ہوسکتا ہے؟ لیکن میرا یہ خط شائع نہیں ہوا۔ اردو زبان و ادب پر ایسی طنز آمیز ذہنیت کو راہ نہیں دی جانی چاہیے۔ اردو ایک ترقی یافتہ خودکفیل زبان ہے اس کی وسعت بیانی کا اندازہ مولوی عبدالحق کے اس ایک جملے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''اگر اردو کے تمام الفاظ ایک چوراہے پر جمع کردیے جائیں اور تمام قومیں اپنے الفاظ چن کرلے جائیں تو کچھ دیر بعد وہاں کچھ نہیں بچے گا۔''

(ج) زبان تہذیب و ثقافت کی نمائندہ ہوتی ہے لیکن موجودہ دور میں سائنس و ٹکنالوجی 'معاش و معیشت' فلسفیانہ اور تجریدی موضوعات کی وضاحت کی ذمے داری بھی جذباتی زبانوں کے سرڈال دی گئی ہے اس لیے نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی سبھی زبانیں، انگریزی کے سوا، مشکلات سے دوچار ہیں۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: ع محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے...
زبان سے محبت اور اس کا استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ قومی تشخص واضح نہ ہوگا۔ احساس کمتری کی بجائے صاف طور پر زبان کی حرمت اور افادیت کا اقرار کرنا چاہیے۔ بعض لوگ اس معاملے میں بھی غیر دانشمندانہ روش اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً چند ماہ قبل لکھنؤ کے ایک اردو رسالہ میں اردو کے ایک پروفیسر کا خط انگریزی میں شائع ہوا تو میں نے مدیر کو لکھا کہ اردو کا کوئی خط کسی انگریزی رسالہ میں

> **زبان تہذیب و ثقافت کی نمائندہ ہوتی ہے لیکن موجودہ دور میں سائنس و ٹکنالوجی 'معاش و معیشت' فلسفیانہ اور تجریدی موضوعات کی وضاحت کی ذمے داری بھی جذباتی زبانوں کے سر ڈال دی گئی ہے اس لیے نہ صرف اردو بلکہ دنیا کی سبھی زبانیں، انگریزی کے سوا، مشکلات سے دوچار ہیں۔**

شائع نہیں ہوسکتا۔ پروفیسر صاحب اپنی انگریزی دانی کا سکہ اردو قارئین پر کیوں جمانا چاہتے ہیں؟ اس طرح قومی خود اعتمادی کو متزلزل نہیں کیا جانا چاہیے۔ آج کل اردو سمیناروں میں بجائے اردو کے انگریزی کے پوسٹر بینر لگانے کا رواج عام ہے۔ یہاں سرسید کی مثال پیش کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے 'اسباب بغاوت ہند' اردو میں لکھی اور وائسرائے ہند کے علاوہ تقریباً سبھی پانچ سو کاپیاں برطانیہ روانہ کردیں جہاں اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اخبارات میں شائع ہوا اور کتاب کے انگریزی ترجمہ پر برٹش پارلیمنٹ میں بحث ہوئی۔ یہ ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ سرسید چاہتے تو کتاب کا انگریزی ترجمہ وائسرائے ہند اور سرکارِ انگلشیہ کو بھیج سکتے تھے مگر ان کی قومی غیرت وحمیت اس قدر قوی تھی کہ انھوں نے اس مسئلے پر غور کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

چند ماہ قبل کئی ایشیائی ممالک کی یونیورسٹیز کی تقریبات کی رپورٹ خاکسار کی نظر سے گزریں جہاں تمام تقریبات ان کی اپنی قومی زبان میں انجام دی جاتی ہیں۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں مراٹھی، گجراتی، بنگلہ، تمل، تلگو، ملیالم زبانوں کے اساتذہ اپنی اپنی زبانوں میں ہی سمیناروں کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے اردو دانشوری احساسِ کمتری کا شکار ہوگئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے عام قارئین بھی اپنی زبان و ادب کی اہمیت وافادیت پر یقین کرنے سے قاصر ہیں۔ ان میں خود اعتمادی کا فقدان پیدا ہوگیا ہے۔ اردو کے تابناک مستقبل کے لیے ضروری ہے کہ دانشور اور عوام میں اپنی زبان وادب کے تئیں، خود اعتمادی کی فضا ہموار کی جائے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: مذکورہ سوالات کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ اس لیے دونوں کو ساتھ رکھ لیا ہے۔ تہذیب وثقافت کا زبان کے ساتھ شہ رگ کی طرح مضبوط رشتہ ہے۔ زبان کے ذریعے ہی تہذیب وثقافت کا اظہار ممکن ہے۔ متمدن زندگی کا تصور زبان کے بغیر استوار ہی نہیں ہوسکتا۔ زبانیں عموماً تہذیب وثقافت کی ترجمان ہوتی ہیں لیکن موجودہ صارفی، سیاسی اور نفسیاتی معاشرہ میں فطرت، جذبہ اور اخلاقی ذمے داریوں کا نباہ کرنا آدمی کے لیے مشکل ہوگیا ہے اس لیے تجارتی، زبان کا ایک نیا اسٹرکچر تیار کیا جارہا ہے جس میں جذبات انسانی کی بجائے دولت، شہرت اور نام ونمود کی خواہش کو مرکزیت حاصل ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جدید طرز حیات میں مجرم صفت افراد کے مقابلے نیک دل اور بااخلاق انسان کو وہ عزت وافتخار حاصل نہیں جس کا وہ مستحق ہے۔ علم اور دانائی کو نام ونمود، شہرت اور اقتدار سے منسلک

> **تہذیب و ثقافت کا زبان کے ساتھ شہ رگ کی طرح مضبوط رشتہ ہے۔ زبان کے ذریعے ہی تہذیب و ثقافت کا اظہار ممکن ہے۔ متمدن زندگی کا تصور زبان کے بغیر استوار ہی نہیں ہوسکتا۔ زبانیں عموماً تہذیب و ثقافت کی ترجمان ہوتی ہیں لیکن موجودہ صارفی، سیاسی اور نفسیاتی معاشرہ میں فطرت، جذبہ اور اخلاقی ذمے داریوں کا نباہ کرنا آدمی کے لیے مشکل ہوگیا ہے اس لیے تجارتی، زبان کا ایک نیا اسٹرکچر تیار کیا جارہا ہے جس میں جذبات انسانی کی بجائے دولت، شہرت اور نام و نمود کی خواہش کو مرکزیت حاصل ہے۔**

کرکے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا میں فطرت، جذبہ اور اخلاق علوم کی وہ قدر باقی نہ رہی جو کبھی تھی۔ تمام طاقتیں بداخلاق اور بے اصول افراد کو منتقل ہوگئی ہیں۔ تجارتی زبان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی زبان جو صارفی سماج کی تمام غیر جذباتی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔ اس ضمن میں دنیا کی سبھی زبانیں اپنا اپنا ہدف حاصل کرنا چاہتی ہیں جس نے روایتی افہام وتفہیم کے مسئلہ کو گہرا کردیا ہے۔ تہذیبی تصادم نے اس خلا کو مزید وسعت دے کر فنکار اور ناقد کو فطری، جذباتی اور اخلاقی صداقتوں پر تنقید کا حوصلہ دیا ہے۔ مشرقی ملکوں کی ادبی تونگری مغربی فلسفہ کی بے راہ روی کی شکار ہوگئی ہے جسے حقیقت پسندی کا نام دے کر متعارف کیا جاتا ہے۔ مغربی دانشور مشرقی تہذیب وثقافت کے منکر بھلے ہی نہ ہوں مگر وہ انھیں قبول بھی نہیں کرتے۔ مثلاً 'ہم جنسی' ہم شرقیوں کے نزدیک ایک غیر فطری اور غیر اخلاقی عمل ہے جسے تمام دنیا میں رائج کیا جارہا ہے۔ چونکہ معاشیاتی اداروں پر مغربیوں کا قبضہ ہے اس لیے قرضدار ملکوں کو ان کے متعین کردہ احکام سیاست ومعیشت پر عمل کرنا مجبوری ہے۔ تہذیب و ثقافت کے یہ چیلنجز (Chalanges) نہ صرف اردو زبان بلکہ تمام مشرقی زبانوں کے سامنے درپیش ہیں۔ اس لیے زبانیں خود کو محفوظ و مامون رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ جو زبانیں حالات کا سامنا نہیں کرپاتیں مردہ ہوجاتی ہیں اور وہ قومی وراثت بھی جو اس زبان سے وابستہ ہوتی ہے۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: ہندوستان کی تمام علاقائی زبانیں انگریزی کے سامنے اپنی افادیت ثابت کرنے میں ناکام ہوگئی ہیں

کیونکہ برسرِ اقتدار طبقہ دولت، شہرت اور امارت حاصل کرنے کے لیے انگریزی کا سہارا لینے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ غریب و نادار افراد کی سماج میں کوئی عزت بھی نہیں ہوتی اس لیے زبان وادب تو کیا کسی بھی تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی رشتہ سے منحرف ہوکر وہ اپنے وجود کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے شائقین بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیے جاسکتے۔ برسرِ اقتدار طبقات جن میں سیاست داں اور اعلیٰ افسران وغیرہ شامل ہیں انھیں زبان وادب سے ہمدردی تو ہوسکتی ہے مگر یہ لوگ بڑے بڑے اعلانات میں شریک ہوکر خود کو نمایاں طور پر پیش کرنا ہی اپنا مقصدِ زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کا دائرۂ کار ذاتی شخصیت کے اظہار تک محدود ہوتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ زبان و ادب کی حرکی قوتیں مضمحل اور کمزور ہوجاتی ہیں اور ادب کے تخلیقی وژن اور تخیلاتی محاکات پر زوال آجاتا ہے چونکہ شہرت پسند سربرآوردہ لوگ بار بار سامنے آتے رہتے ہیں اس لیے عوام رفتہ رفتہ ان سے مایوس اور بے زار ہوجاتے ہیں۔ ان میں وہ جوش اور ولولہ بھی قائم نہیں رہتا جو کسی بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

اعزازات و انعامات حاصل کرنے کی سرد جنگ نے ایک کاروباری صورت اختیار کرلی ہے۔ اکثر دانشور حضرات ایک گروپ کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کے گروپ سے منسلک نہ ہو تو اسے نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ یہ لوگ بظاہر بے حد مخلص ہوتے ہیں مگر بباطن ان کی شخصیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ ایک بار نوبل پرائز سائنسداں ڈاکٹر عبدالسلام نے ایسے لوگوں کی ذہنیت پر تنقید کرتے ہوئے پیرس کی ایک کانفرنس میں کہا تھا ''آئن اسٹائن اگر تھرورلڈ (Third World) میں پیدا ہوتا تو ضائع ہوجاتا۔''

مذکورہ حقائق بلاواسطہ طور پر زبان کے فروغ میں مانع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اہم مسئلہ اور بھی ہے وہ یہ کہ آج کل کثیر تعداد میں مذہبی لٹریچر ناگری رسم الخط میں شائع کیا جارہا ہے۔ حالانکہ اس لکھاوٹ میں اردو کے کئی حروف کا لکھا جانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ث، س، ص، ذ ز ظ ض، ع غ، ق، ء وغیرہ۔ ایسی صورت میں تلفظ درست نہ ہوگا اور زبان کا اسٹرکچر بھی متاثر ہوگا۔ اس معاملہ میں علمائے دین کو توجہ دینا ضروری ہے کیونکہ اگر تلفظ درست نہ ہو تو عبادت کیونکر درست قرار دی جائے گی۔

اردو زبان کو کسی قسم کے خطرات کا سامنا تو نہیں ہے لیکن اس کے سامنے مشکلات ضرور ہیں۔ مثلاً اردو کے تعلیمی نصاب کے مطابق کتابوں کا دستیاب نہ ہونا۔ اردو

اردو زبان کو کسی قسم کے خطرات کا سامنا تو نہیں ہے لیکن اس کے سامنے مشکلات ضرور ہیں۔ مثلاً اردو کے تعلیمی نصاب کے مطابق کتابوں کا دستیاب نہ ہونا۔ اردو اساتذہ کی تقرری کا نہ ہونا۔ اردو زبان میں دیگر زبانوں کی علمی کتابوں کے تراجم کا نہ ہونا۔ اردو کی سیاسی اور سماجی حیثیت کا کمزور ہونا وغیرہ مگر یہ تمام مسائل مقامی سطح پر حل ہوسکتے ہیں کیونکہ یہ سبھی مسائل ملکی سطح پر ہی اپنا وجود رکھتے ہیں۔ ان کی کوئی بین الاقوامی حیثیت نہیں ہے۔

اساتذہ کی تقرری کا نہ ہونا۔ اردو زبان میں دیگر زبانوں کی علمی کتابوں کے تراجم کا نہ ہونا۔ اردو کی سیاسی اور سماجی حیثیت کا کمزور ہونا وغیرہ مگر یہ تمام مسائل مقامی سطح پر حل ہوسکتے ہیں کیونکہ یہ سبھی مسائل ملکی سطح پر ہی اپنا وجود رکھتے ہیں۔ ان کی کوئی بین الاقوامی حیثیت نہیں ہے۔

س7: کیا اردو ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں؟

جواب: اس سوال کو کچھ اس طرح لکھا جائے تو بہتر ہوگا، 'کیا اردو ادارے تنظیمیں زبان سے زیادہ افراد پر توجہ دے رہی ہیں؟' اردو ادارے اور تنظیمیں زبان کے فروغ میں یقیناً پہلے سے زیادہ فعال ہیں لیکن یہاں بھی اصلاح کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ان اداروں اور تنظیموں میں کام کرنے والے افراد صرف چند لوگوں کی تحریر پر توجہ دیتے ہیں۔ انھیں حضرت علیؓ کے اس مقولے پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا: ''تم یہ مت دیکھو کہ بات کس نے کہی، تم یہ دیکھو کہ بات کیا ہے۔'' یہ لوگ فرد کو دیکھتے ہیں۔ بات پر توجہ نہیں دیتے جبکہ دیگر زبانوں کی انجمنیں فرد سے زیادہ بات پر توجہ دیتی ہیں۔ نتیجتاً ادب و زبان کے متعلق بہترین خیالات بھی ضائع ہوجاتے ہیں۔ پروفیسر صاحبان کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ Text کے باہر دیکھنا پسند نہیں کرتے اور اخبارات و رسائل کے مدیران پر بھی اپنا اثر و رسوخ قائم رکھتے ہیں [یہ لوگ کسی بھی مثبت اور تعمیری نظریے اور خیال کو قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ خاص طور پر دہلی کا کوئی بھی ادارہ اس وبا سے محفوظ نہیں ہے] زبان کی بقا اور فروغ میں جدید اصطلاحی نظام کو وسعت دینا ایک نہایت ضروری عمل ہے۔ غالب اور اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے پھر بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔ تفکراتِ ادب کی انفرادیت ہی نئی اصطلاحوں کے وضع کرنے اور زبان کے فروغ میں معاون ہوتی ہے۔

س8: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: اردو ادب میں کلاسیکیت پر بہت کم گفتگو کی جاتی ہے، بلکہ ناقدین ادب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ حالانکہ ظ انصاری، آل احمد سرور، پروفیسر عبدالمغنی، شکیل الرحمٰن، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے کئی مضامین مشرقی تہذیب و ثقافت کی بصیرت افروز نقد و نظر کے ترجمان ضرور ہیں۔ میر و غالب اور اقبال کے فن پر کئی عمدہ کتابیں اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن کلاسیکیت کا موضوع ایک مبسوط نقد و نظر کا متمنی ہے۔ اسے تحقیق کا موضوع بنایا جانا چاہیے تاکہ مشرقی ادبیات کے مثبت نظریات واضح ہوسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکیت کا دائرہ فطری، جذباتی اور اخلاقی امورِ زندگی سے وابستگی رکھتا ہے۔ اس لیے مذہب اور تاریخ کی انفرادیت و اہمیت کو قبول کرنا بھی لازمی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناقدین ادب خود کو سیکولر (Secular) ظاہر کرنے کے لیے اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ اس موضوع کو فطرت، جذبہ اور اخلاقی بصیرتوں کا ترجمان بنا کر ایک نیا بابِ تنقید استوار کیا جاسکتا ہے۔ سبب یہ کہ عالمِ انسانیت روزِ اول سے آج تک ایک ایسے ضابطۂ حیات کی پابند ہے جس پر تمام انسانوں کا اعتبار و یقین قائم ہے۔ مثلاً ماں کی محبت کا یقین اور عدل و انصاف کا

اردو ادب میں کلاسیکیت پر بہت کم گفتگو کی جاتی ہے، بلکہ ناقدین ادب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ حالانکہ ظ انصاری، آل احمد سرور، پروفیسر عبدالمغنی، شکیل الرحمن، گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی کے کئی مضامین مشرقی تہذیب و ثقافت کی بصیرت افروز نقد و نظر کے ترجمان ضرو رہیں۔ میر وغالب اور اقبال کے فن پر کئی عمدہ کتابیں اردو ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن کلاسیکیت کا موضوع ایک مبسوط نقد و نظر کا متمنی ہے۔ اسے تحقیق کا موضوع بنایا جانا چاہیے تاکہ مشرقی ادبیات کے مثبت نظریات واضح ہوسکیں۔

فطری تصور جسے انگریزی میں Natural Justice سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دونوں ہی بین الاقوامی سچائی ہیں۔ مذہب اور تاریخ بھی ان حقائق کے منکر نہیں ہیں۔ چوری، جھوٹ، مکر وفریب، دھوکا، ظلم اور استحصال کو دنیا کی تمام قومیں ناپسندیدہ قرار دیتی ہیں۔ اس اجتماعیت کو کلاسیکیت کے ذریعے برقرار رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ موجودہ ادب میں خواہشاتِ نفسانی کا تذکرہ تو بہت ملتا ہے لیکن جذبوں کی توقیر کا بیان کم ہوگیا ہے۔

جدید نظریاتِ فکر کی کمزوری یہی ہے کہ اس نے 'آزادی اور مساوات' کے سیاسی تصورات کے زعم میں فطری حقائق کو فراموش کیا ہے، سائنسداں اشیا کی حقیقت

روزِ اوّل سے ادب و فن کی تمام جہتیں فطری، جذباتی اور اخلاقی حقائق کی ترجمان رہی ہیں لیکن آج انہیں سیاسی، سماجی اور معاشی فلسفوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور کیا جارہا ہے حالانکہ ادب کبھی فلسفہ نہیں ہوسکتا اس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ تہذیب جدید میں ادب و فن کو سیاسی فلسفہ کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس نے امیجری کا زوال پیدا کردیا ہے۔ اس لیے میں سوچتا ہوں کلاسیکیت اور جدیدیت کا تقابلی مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ ادب و فن کے صحیح خد و خال واضح ہوسکیں۔

سے واقف ہونا چاہتے ہیں مگر اس کی فطرت کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ اسی طرزِ فکر پر مغربی مفکرین اور ناقدینِ ادب نے نقد ونظر کی جدید راہوں کو ہموار کیا ہے مثلاً Feminism ایک سیاسی تحریک ہے جسے سماجی نظریے کے طور پر متعارف کیا جاتا ہے تاکہ سیاسی اور صارفی سماج کی غیر فطری، غیر جذباتی اور غیر اخلاقی فکری بنیادوں کو ہموار کیا جاسکے۔ روزِ اوّل سے ادب وفن کی تمام جہتیں فطری، جذباتی اور اخلاقی حقائق کی ترجمان رہی ہیں لیکن آج انھیں سیاسی، سماجی اور معاشی فلسفوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور کیا جارہا ہے حالانکہ ادب کبھی فلسفہ نہیں ہوسکتا اس کی جڑیں ماضی میں پیوست ہوتی ہیں۔ تہذیبِ جدید میں ادب وفن کو سیاسی فلسفہ کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس نے امیجری کا زوال پیدا کردیا ہے۔ اس لیے میں سوچتا ہوں کلاسیکیت اور جدیدیت کا تقابلی مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ ادب وفن کے صحیح خدوخال واضح ہوسکیں۔

س10: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اردو کا مستقبل روشن ہے لیکن زبان کی ترقی اور بقا کے لیے ناقدینِ ادب اور فنکار کے ذہنی رویوں میں کچھ بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ زبان وادب کا وقار اور اعتماد بحال ہوسکے مثلاً اردو ادب کے ہندوستانی ناقدین اور فنکار ذہنی طور پر مغربی ادبیات سے مرعوب ہیں انھیں ہندوستانی ادب میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ممتاز شیریں نے اپنے ایک مضمون میں کرشن چندر، بیدی، منٹو اور دیگر افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو مغربی افسانہ نگاروں کی نقل قرار دیا ہے۔ مجنوں گورکھپوری سے وارث علوی تک سب کا یہی حال ہے۔ اس معاملہ میں کلیم الدین احمد بھی بہت آگے ہیں۔ ترقی پسندوں کے یہاں کارل مارکس اور لینن کا سیاسی شعور حاوی ہے۔ جدید ناقدین ادب پر فرائڈ کے نفسیاتی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ موجودہ دور میں مابعد جدید نظریات نے اردو زبان و ادب کے پروفیسر صاحبان کو نت نئی ذہنی موشگافیوں سے روشناس کیا ہے جس کی کوئی ادبی حیثیت بھی نہیں ہے۔

مغربی مصنّفین اور ناقدین مشرقی روایتوں کی مخالفت کے ذریعے اپنا تجزیاتی نقد ونظر تیار کرتے ہیں اور پھر اسے کتابی شکل دے کر تمام دنیا میں معروفیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں لیکن ہمارے یہاں ناقدین اپنی انفرادیت ثابت کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال نے مغربی فلسفہ کی نارسائیوں کی جانب توجہ ضرور مبذول کی تھی۔ سرسید اور شبلی نے مشرقی قدروں کی اہمیت کو واضح کرنے میں گرانقدر خدمات انجام دی تھیں۔ اردو زبان کے مستقبل کو تقویت دینے کے لیے اس روایت کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

جواب: اردو رسم الخط جسم و جان کی طرح لازم وملزوم ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا مطلب زبان کی موت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو رسم الخط کو بدلنے کا سوال ہندوستان کے نادان دانشوروں کی ذہنی اختراع ہے جس کا دائرہ ہندوستانی سرزمین تک محدود ہے۔ اس موضوع پر توجہ نہیں دی جانی چاہیے۔ وجہ یہ کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے اور اپنے رسم الخط کے ساتھ تمام دنیا میں فروغ حاصل کررہی ہے۔ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق اردو

اردو رسم الخط جسم و جان کی طرح لازم و ملزوم ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا مطلب زبان کی موت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو رسم الخط کو بدلنے کا سوال ہندوستان کے نادان دانشوروں کی ذہنی اختراع ہے جس کا دائرہ ہندوستانی سرزمین تک محدود ہے۔ اس موضوع پر توجہ نہیں دی جانی چاہیے۔ وجہ یہ کہ اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے اور اپنے رسم الخط کے ساتھ تمام دنیا میں فروغ حاصل کررہی ہے۔

پروفیسر حکم چند نیر کی کتاب 'اردو کے مسائل' کا مطالعہ کرنا بہتر ہوگا۔ یہ ایک بہترین تحقیقی کتاب ہے ممکن ہو تو اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا جانا چاہیے۔ یہاں ایک بار پھر میں اپنی بات کا اعادہ کرنا چاہوں گا وہ یہ کہ ث، س، ص کا کوئی نعم البدل کسی دوسری لکھاوٹ میں ہرگز نہیں مل سکتا۔ اسی طرح ذ ز ظ ض اور گ ع غ ق اور ہمزہ کا تلفظ بھی رومن یا ناگری رسم الخط میں حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے اردو زبان کا رسم الخط بدلنا ناممکن ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کے مطابق:

''رسم خط کی تبدیلی کی مخالفت محض جذباتی لگاؤ کی وجہ سے نہ ہوگی۔ شاندار ماضی رکھنے والی کسی بھی زبان کے لیے رسم خط کی تبدیلی بہت بڑی تبدیلی ہوگی کیونکہ وہ اس کے ادب کا اہم ترین اور عزیز ترین جزو بن جاتا ہے۔ رسم خط کو بدل دیکھیے تو صفحۂ قرطاس پر نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں گی۔ یہ نئی صورتیں، نئے خیالات اور نئی آوازوں کی حامل ہوں گی۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی ہوجائے گی۔ قدیم ادب اور قدیم زبان دونوں کی موت واقع ہوجائے گی۔ جس زبان کے پاس محفوظ کرنے کے لیے کوئی قابل قدر ادب نہیں، وہاں یہ خطرہ مول لیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا کیونکہ ہمارا ادب نہ صرف قابل قدر اور بیش قیمت ہے بلکہ اس کا ہماری تاریخ اور ہمارے خیالات سے گہرا تعلق ہے۔ عوام کی زندگی سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ اس قسم کی تبدیلی ظالمانہ غارت گری ہوگی جس سے عام تعلیمی ترقی کو سخت دھکا لگے گا۔'' (حکم چند نیر، اردو کے مسائل ص 162)

■

Dr. Mehmood Shaikh
592, Naya Mohala, Mirza Ghalib Marg
Jabalpur - 482002 (MP)

ولی دکنی

ابن کنول

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی زبان، کسی مذہب یا کسی تہذیب کی ابتدا ایک خاص مقام یا علاقہ میں ہوتی ہے، لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اسے فروغ دوسرے مقام پر ملتا ہے۔ اردو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ شمالی ہند میں اس کی ابتدا ہوئی، لیکن فروغ دکن میں ملا۔ کئی صدی بعد اردو کی وطن واپسی ہوئی اور وہ بھی ایک دکنی کے دوش پر۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

''دکن میں نثر کی ابتدا کو چار سو سال سے زیادہ گزر جاتے ہیں اور اس عرصہ میں وہ دو منازل ارتقا بھی طے کر لیتی ہے مگر شمالی ہند اس سے بے خبر رہتا ہے، صرف یہی نہیں کہ شمال والوں نے اس میں کوئی کام نہیں کیا بلکہ وہ اس امر سے بھی ناواقف رہے کہ اردو نثر میں کتابیں لکھی گئی ہیں یا لکھی جاسکتی ہیں۔''[1]

دکن میں نثر سے زیادہ اردو شاعری مقبول ہوئی۔ بہمنی سلطنت کے دور میں 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' لکھی گئی، پھر عادل شاہی، قطب شاہی ادوار میں اردو شاعری نے زرّیں تاریخ رقم کی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا، دکن کے ایک باشندے نے شمال والوں کے سامنے اپنا کلام پیش کیا جس کو سن کر اہل شمال اپنی کھوئی ہوئی زبان کی طرف متوجہ ہوئے۔ دکن کے اس باشندے کا نام ولی تھا۔ ولی کا تعلق گجرات سے تھا جو اس وقت دکن ہی کہا جاتا تھا۔ میر نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ریختہ گوئی یعنی اردو کی جانب شمالی ہند کے شعراء کی توجہ مبذول کرانے والا باشندہ ولی دکن ہی کا تھا۔ ولی خود بھی اپنے آپ کو دکنی کہتے ہیں۔

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

یہ شعر یوں بھی ہے۔

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور
وطن گو اس کا گجرات و دکن ہے

بہر حال یہ بات تو ثابت ہے کہ اٹھارہویں صدی میں اردو کو شمالی ہند میں دوبارہ متعارف یا مقبول کرانے میں ولی یا ان کے کلام نے اہم کردار ادا کیا۔

نظامی سے ولی اور سراج تک آتے آتے دکنی زبان میں کافی تبدیلیاں آگئیں، اس کی وجہ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کی مسلسل دکن میں مہمات جاری رکھنا تھیں۔ شمالی ہند کی فوج کے طویل قیام کے سبب دکنی زبان میں دکنیت کم ہوتی چلی گئی اور اس پر شمال کا اثر نمایاں ہونے لگا، جس کی مثال ولی اور سراج کے کلام میں نظر آتی ہے۔ ولی کے کلام ہی سے متاثر ہو کر اردو کو ریختہ کہنے والے اس زبان میں شاعری کرنے لگے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''ولی کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے شمال کی زبان کو دکھنی ادب کی طویل روایت سے ملا کر ایک کر دیا اور ساتھ ساتھ فارسی ادب کی رچاوٹ سے اس میں اتنی رنگا رنگ آوازیں شامل کر دیں اور امکانات کے اتنے سرے بھی اُبھار دیے کہ آئندہ دو سو سال تک اردو شاعری انہی امکانات کے ستاروں سے روشنی حاصل کرتی رہی، اس لیے ولی آئندہ دو سو سال کی شاعری کے نظام شمسی کا وہ سورج ہے، جس کے دائرۂ کشش میں اردو شاعری کے مختلف سیارے گردش کرتے ہیں۔''[2]

بلاشبہ ولی نے اردو کے لیے دکن اور شمال کے مابین ایک سفیر کا کام کیا، اسی لئے وہ اردو شاعری کے 'بابا آدم' بھی کہلائے۔

ولی کی زندگی سے متعلق صرف تذکروں کے بیان ہی پر اعتبار کرنا ہوگا جہاں ان کے اصل نام اور سفر دہلی یا تاریخ وفات پر بھی اختلافات ہیں۔ ولی کا نام کہیں ولی محمد لکھا ہوا ہے کہیں محمد ولی اور کہیں ولی اللہ۔ تمام مآخذ کے مطالعہ سے یہ بات یقینی ہے کہ تخلص ولی ہے جو نام کا حصہ بھی ہے، گجرات سے تعلق ہے۔ بعض مآخذ کی بنیاد پر ان کا وطن اورنگ آباد بھی کہا گیا ہے۔

ولی کا زمانہ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل کا ہے۔ ولی کی تعلیم احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ کے مدرسے میں ہوئی، جہاں شیخ نورالدین سہروردی موجود تھے۔ ولی کو ان کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ ولی کا انتقال احمد آباد ہی میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ولی دہلی آئے اور ان کی سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی، جنھیں شاعری میں ولی نے اپنا استاد لکھا ہے۔ شاہ گلشن کا وطن بھی گجرات ہی تھا، لیکن دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ولی کی دلّی آمد کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ ولی دو بار دہلی آئے، پہلی بار اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں، دوسری بار محمد شاہ کے عہد میں۔

ولی کے وطن، نام، تاریخ ولادت یا وفات وغیرہ میں کتنا ہی اختلاف سہی، لیکن اس صداقت سے نہ کسی کو انکار ہے اور نہ کوئی اختلاف کہ شمالی ہند میں اردو شاعری

کے فروغ میں ولی نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں اہل شمال فارسی ہی کی طرف راغب تھے، لیکن ولی کے کلام کی سادگی، سلاست، نفاست اور شستگی دیکھ کر اردو شعرگوئی کی جانب متوجہ ہوئے۔ اردو کو اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے بہتر پایا۔ دکن کے بیشتر شعرا نے مثنویاں لکھیں۔ ولی نے مثنوی کی جگہ غزل کی طرف توجہ دی اور اپنا تمام تر وقت اور صلاحیت غزل کے فن پر قدرت حاصل کرنے میں صرف کردی۔ ولی کی غزل نے صفائی اور سادگی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ایسی جگہ بنائی کہ وہ فارسی غزل کے رواج پر اثرانداز ہوئی۔ غزل شاعری کی وہ صنف ہے جس میں ہر طرح کے جذبات واحساسات کو پیش کرنے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ ولی کی شخصیت کے متعدد پہلو تھے، ان کی شاعری کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ ومشاہدہ نہایت وسیع تھا۔ ایک جانب وہ صوفیانہ سلسلہ سے قریب ہونے کے سبب انسانی افکار و اقدار کا بخوبی علم رکھتے تھے، دوسری طرف عوامی رابطوں کی وجہ سے ہندوستانی تہذیب سے بھی انھیں بھرپور واقفیت تھی۔ ہندوستانی تہذیبی عناصر کی جس قدر مختلف شکلیں ولی کے کلام میں نظر آتی ہیں وہ کسی دوسرے کے یہاں کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری عشق مجازی و حقیقی کا حسین امتزاج ہے جس عقیدت کا اظہار وہ خالق کائنات کی ثنا کے لیے کرتے ہیں اسی صداقت کے ساتھ صمیم قلب سے دنیاوی محبوب کی تعریف کرتے ہیں۔

دکن کی شعری روایت پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شاعری میں عشق کا تصور اور اس کا اظہار شمال کے مقابلے میں مختلف ہے۔ اوّل تو دکن میں

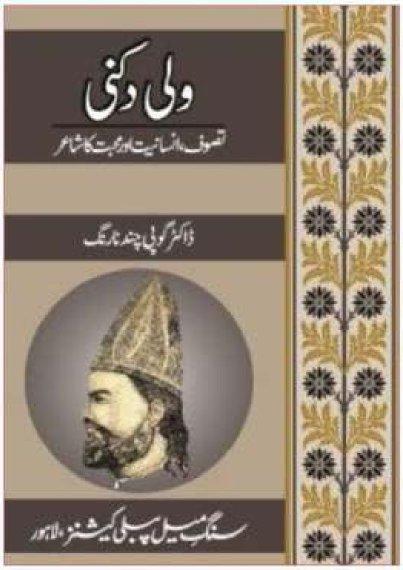

عشق کے موضوع کو فوقیت رہی ہے، ان کا محبوب بھی ہندوستانی ہے۔ دکن کی شاعری میں مقامی رنگ زیادہ نمایاں ہے، جبکہ شمال میں فارسی زبان وادب کا غلبہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی تہذیب، زبان اور ادب پر وسط ایشیا یا ایرانی تہذیب وادب کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ دکنی شعراء کا عشق بھی ہندوستانی ہے اور محبوب بھی۔ ولی کے یہاں جس قدر ہندوستانیت موجود ہے وہ بہت کم اردو شعرا کے یہاں دکھائی دے گی۔ ولی نے اگر ابوالمعالی کے لئے شعر کہے ہیں تو امرت لال، گوبند لال اور کھیم داس کو بھی اپنی شاعری میں یاد کیا ہے۔

شمع بزم وفا ہے امرت لال
سرو باغ ادا ہے امرت لال
ماہ نو کی نمن ہے سب کوں عزیز
اس سبب کم نما ہے امرت لال
جوں شمع گل پڑیں گے شرمندگی سے گل رو
جس انجمن میں حاضر گوبند لال ہوگا

ہے بس کہ آب و رنگ حیا کھیم داس میں
آتا نہیں کسی کے خیال و قیاس میں

ولی اپنی مٹی سے جڑا ہوا شاعر ہے، اس کی غزل میں اس کی مٹی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ اس کی شاعری وطن پرستی کی مثال ہے، ولی کا عشق بھی ہندوستانی ہے اور معشوق بھی ہندوستان ہی کا ہے۔ ظہیرالدین مدنی لکھتے ہیں:

''ولی نے ہندی مستعملہ عنصر یعنی ہندوستان کی مذہبی، معاشرتی، تاریخی تلمیحوں، تشبیہوں اور استعاروں، دریاؤں، پھلوں، پھولوں، موسیقی کے سازوں، راگوں، مذہبی زیارت گاہوں کے ناموں وغیرہ کو ہی قائم نہیں کیا بلکہ اپنے انداز میں تشبیہاً ورعایتاً اس طرح کام میں لیا کہ ان کی شاعرانہ اہمیت واضح کردی اور دوسری طرف اپنی وسیع المشربی، حب الوطنی اوردوربینی کا ثبوت دے دیا۔''[3]

ولی نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ کا استعمال انتہائی خوبی کے ساتھ کیا۔ اٹھارہویں صدی کے بیشتر شعراء فارسی سے متاثر تھے، فارسی لفظیات ہی کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔ اٹھارہویں صدی تک نثر تو فارسی ہی میں لکھی جاتی تھی۔ فضلی نے ضرورتاً 'کربل کتھا' کا ترجمہ کیا، نوطرز مرصع فارسی آمیز لکھی گئی۔ اردو شعرا نے اردو شاعروں کے تذکرے بھی فارسی میں لکھے، لیکن ولی کے مقامی لفظیات کے استعمال نے غزل کو نیا آہنگ عطا کیا۔ ولی اپنے کلام کو فارسی غزل سے کمتر نہیں سمجھتے تھے۔ خود کہتے ہیں۔

ہم پاس آگے بات نظیری کی مت کہو
رکھتے نہیں نظیر ریس کی سخن میں ہم

یہ ریختہ ولی کا جاکر اُسے سناؤ
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

جس طرح غالب یا دیگر شعراء نے عموماً اپنی شعرگوئی پر ناز کیا ہے، وہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں افضل سمجھتے ہیں۔ مثلاً غالب نے کہا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ولی بھی اپنے کلام کو نہ صرف فارسی شعرا سے بلکہ اپنے معاصرین کے کلام سے بہتر سمجھتے ہیں، اس احساس کو وہ بار بار ظاہر کرتے ہیں۔

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولا کوئی یک شعر خوشتر زیں نمط

شاعروں میں اپس کا نام کیا
جب ولی نے کیا یو دیوان جمع

ولی تجھ شعر کوں سن کر ہوئے ہیں مست اہل دل
اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا

یہ شاعرانہ تعلّی عام طور پر بھی شعرا کے یہاں نظر آتی ہے، لیکن غالب کے دعوے کی طرح ولی کا دعویٰ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح غالب اپنے منفرد انداز کے سبب ممتاز نظر آتے ہیں اسی طرح ولی کے منفرد انداز بیان کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک نئے طرز کا آغاز ہوتا ہے۔ ولی کا کلام اردو شاعری کی تاریخ کا ایک تاریخی موڑ ہے، جہاں سے ایک نیا باب وا ہوتا ہے۔ ولی کے کلام کی دلکشی معاصرین کو مسحور کرلیتی ہے۔ ولی نے دکنی شاعری کی روایت کے مطابق عشق ہی کو شاعری کا مرکز بنایا، لیکن ان کا عشق، عشق صادق نظر آتا ہے۔ بیان کی سادگی، نزاکت، لطافت اور غنائیت متاثر کیے بغیر نہیں رہ پاتی۔ احساس اور جذبے کی گرمی، لہجہ کی نرمی کلام میں بے جا حسن پیدا کردیتی ہے، جس کا سننے والے پر دیرپا اثر ہوتا ہے۔ دکن کی شاعری میں عورت سے عشق کا تصور واضح نظر آتا ہے۔ ولی کو صوفی مشرب ہونے کے باوجود عشق مجازی کے بیان میں کمال حاصل ہے۔ حسن وجمال کی جو کیفیات اور جزئیات ولی پیش کرتے ہیں وہ احساس میں نغمگی پیدا کردیتی ہے۔ وہ ابتذال اور عامیانہ پن سے گریز کرتے ہوئے انتہائی چابک دستی سے دل پر گزری ہوئی کیفیت کو شعری پیکر عطا کرنے کے ہنر سے بخوبی

واقف ہیں۔ محبوب کے حسن کے بیان میں جو نزاکت اور نفاست ولی کے یہاں نظر آتی ہے شاید ہی اردو شاعری میں اس کی دوسری مثال موجود ہو۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

دونوں جہاں کی عید کی ہے آرزو اگر
پتیم کے ابرواں میں دو شکل ہلال دیکھ

تری زلفاں کے حلقے میں رہے یوں نقش رخ روشن
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی میں

کتاب الحسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا
تیرے ابرو کے دو مصرعے سوں اس کا ابتدا دستا

مت آئینے کوں دکھلا اپنا جمال روشن
تجھ مکھ کا آب دیکھے آئینہ آب ہوگا

دیکھا ہے جس نے تیرے رخسار کا تماشا
نحیں دیکھتا سُرج کی جھلکار کا تماشا

جب لٹک چال سجن کی مجھے یاد آتی ہے
دل مرا رقص میں آتا ہے مثال رقاص

موج دریا کو دیکھنے مت جا
دیکھ اس زلف عنبریں کی ادا

ولی کی غزلوں میں حسن و جمال کا بیان شدت سے موجود ہے۔ لفظوں کا استعمال اور لہجہ کی نزاکت ومعصومیت اسے دلکش و دلفریب بنادیتی ہے۔ سراپا کے بیان میں ولی پاکیزگی کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اردو کے بیشتر شعراء ایسا نہیں کرسکے ہیں۔ ولی صرف محبوب کے قد اور چہرے پر نظر رکھتے ہیں، جس کے لیے انھوں نے اچھوتی تشبیہات اور استعارات کا سہارا لیا۔ نئی نئی تشبیہات واستعارات وضع کرنے میں ولی کو کمال حاصل ہے۔ محبوب کے حسن کی تعریف میں جن تشبیہات واستعارات کو ولی نے پیش کیا وہ کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتیں۔

ترا مکھ حسن کا دریا و موجاں چین پیشانی
اُپر ابرو کی کشتی کے یوتل جیوں ناخدا دستا

ترے لب ہیں برنگ حوضِ کوثر مخزنِ خوبی
یہ خالِ عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا

یوتل تجھ مکھ کے کعبے میں مجھے اسود حجر دستا
زنخداں میں ترے مجھ چاہ زمزم کا اثر دستا

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

زلف و رخ ہے ترا جو لیل و نہار
مجھ کوں واللیل والضحیٰ کی قسم

ولی کے کلام کا حسن صنائع بدائع کے استعمال میں پوشیدہ ہے۔ وہ بڑے فنکارانہ انداز میں مختلف صنعتوں کی مدد سے اشعار کو اس قدر دلکش بنادیتے ہیں کہ سماعتوں پر موسیقی کی ترنگ محسوس ہونے لگتی ہے۔ غزل کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے جذبات واحساسات کی نہ صرف ترجمانی کرتی ہے بلکہ روح میں اتر جاتی ہے۔ ولی کی غزل انسانی محسوسات کی مکمل ترجمان ہونے کے سبب ایک کیف پیدا کرتی ہے۔ ولی کی مقبولیت کی وجہ ان کی غزل کی وہ زبان بھی ہے جسے انھوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کی زبان سادہ اور سلیس بھی ہے اور اس پر مقامی رنگ بھی نمایاں ہے۔ وہ بڑی روانی سے ہندی الفاظ کا استعمال غزل میں کرتے ہیں، جو کلام میں مقامیت اور شعریت پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ہندی کے الفاظ غزل میں ناگوار نہیں گزرتے، بلکہ گیت کی سی جھنکار کا لطف دیتے ہیں۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
اس رین اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکار ستاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کی پجن ہاری ٹک اس کو پجاتی جا

مانند اس ولیؔ کے ہوا مست و بے خبر
تجھ نین سوں پیا ہے جو پیمانہ آئینہ

سجن مکتب میں جب آیا ہر اک کوں
ہورہے شوق تعلیم و تعلّم

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

ولی کے یہاں بار بار مکھ، نین، جگت، بھوں، سجن وغیرہ کا استعمال ہوا ہے۔ ان کی غزلیں سادہ اور سلیس ہونے کی وجہ سے عام فہم اور مقبول ہوئیں:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ہم کو برداشت نہیں غصے کی — بے سبب غصے میں آیا نہ کرو
خوب رو خوب کام کرتے ہیں — یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
ناز مت کر تجھے ادا کی قسم — بے تکلف ہو مل خدا کی قسم
ہے جدائی میں زندگی مشکل — آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر
ٹک ولی کی طرف نگاہ کرو — صبح سوں منتظر ہے درشن کا
دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا — ہے مطالعہ مطلع انوار کا
یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا — ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آہ پر آہ کھینچتا تھا میں — آج کی رات کچھ حساب نہ تھا

ولی نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں انتہائی سادگی کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار غزل کے پیرائے میں کیا ہے۔ وہ فارسی اور عربی الفاظ وتراکیب کا بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن وہ نہ ثقیل معلوم ہوتے ہیں نہ سماعت پر گراں گزرتے ہیں۔ ولی کی غزل شمال اور جنوب کی زبانوں اور تہذیبوں کا سنگم ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ولی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولی وہ شاعر ہے جو شمالی ہند اور دکن کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ شمالی ہند کی فارسی روایت اسے چکا چوند کررہی ہے اور دکن کی مقامی عشقیہ روایت اُسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہ شمال کی فارسی روایت کی شعری تاب ناکیوں سے اثر پذیر ہوتا رہا مگر اس کا مقامی شعور مغلوب نہ ہوسکا۔ جنوب کی شعری روایت کے آخری بڑے شاعر نے مقامی شاعری کے حسن کو اپنی غزل میں اس طور پر مرتعش کیا کہ اس کی جلوہ افروزی آج بھی اس کی غزل میں موجود ہے۔ ولی دکن کے لوک حسن، لوک عشق اور لوک کرداروں کا آخری شاعر بھی تھا۔ شمال کے تہذیبی اور ادبی غلبہ کے ساتھ یہ روایت غزل سے معدوم ہوجاتی ہے۔''[4]

یوں تو اردو غزل ولی سے پہلے بھی تھی، لیکن ولی کی غزل یا ان کے تغزل نے اردو غزل کی تاریخ میں انقلاب بپا کیا۔ غزل کو نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کرایا۔ اردو غزل کی تاریخ میں ولی کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی:

1۔ اردو کے اسالیب بیان، ص 33,294
2۔ تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، ص 520
3۔ انتخاب ولی، ص 13، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
4۔ اردو ادب کی تاریخ، ص 240، ایم آر پبلی کیشنز دہلی

■

Prof. Ibne Kanwal
Dept. of Urdu
Dehli University
Delhi - 110007

اسلم آزاد

سیماب اکبرآبادی
ایک فراموش کردہ انقلابی شاعر

ہر ادب اپنے عہد کا ترجمان اور مفسر ہوتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور تہذیب و ثقافت کا عکاس۔ ادب ایک بحر بیکراں ہے جس میں اس عہد کی ساری متلاطم اور متصادم لہریں ایک دوسرے سے باہم دست و گریباں ہوتی ہیں۔ وہ اس کائنات کے لولو و مرجان اور سنگ وخشت سبھوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ حسن وقبح کا فرق ہو یا خیر وشر کی آویزش، حق و باطل کی جنگ ہو یا امارت وغربت کا امتیاز، فنکار جو کچھ دیکھتا ہے جو بھی محسوس کرتا ہے بے کم وکاست اسے اپنے فن پارے میں پیش کردیتا ہے۔ تخلیق میں فنکار کا سوز دروں اور خون جگر شامل ہوتا ہے۔ اس کے دل کی بیتاب دھڑکنیں ہوتی ہیں۔ مضطرب روح کی جلن اور پکار ہوتی ہے۔ فنکار فطرتاً حسن وجمال کا شیدائی ہوتا ہے اور لالہ و گل کا متوالا۔ وہ امن وانسانیت کا پیامبر ہوتا ہے اور حسرت وانبساط کا داعی۔ وہ دنیا کو بہشت برروئے زمیں کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ جہاں حسن ہو، سکون ہو اور خوشیاں ہوں۔

سیماب اکبرآبادی (1880-1957) کا دور بڑا پرفتن اور پرآشوب تھا۔ ہر طرف انتشار اور افراتفری تھی۔ چہار سمت آہ وبکا اور شور وشغب تھا۔ ہر سو ویرانی اور تاریکی تھی۔ ان حالات وعوامل سے فنکار کا متاثر ہونا فطری امر ہے۔ لہٰذا شاد عظیم آبادی، الطاف حسین حالی، ظفر علی خاں، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، مسرور جہان آبادی، برج نرائن چکبست اور مولانا اسماعیل میرٹھی نے حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہوکر ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کی، قربانیاں دیں اپنے گیتوں اور نغموں سے خواب خرگوش میں پڑے ہندوستانیوں کو جگایا، ان میں انقلاب کی روح پھونک دی، حریت کا جذبہ رگ و پے میں سرایت کردیا۔ سیماب اپنے معاصرین سے پیچھے نہیں رہے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ گلستان میں بہار کیوں کر آتی ہے۔ پھولوں میں رعنائی اور رنگینی کہاں سے آتی ہے۔ دلکشی اور زیبائی کیسے پیدا ہوتی ہے۔

درائے کارواں میں اس توازن کی ضرورت ہے
صدائیں متفق ہوں گی تو گونج اٹھے گی ہر وادی

لہو کی چند بوندیں چاہئیں عنوان افسانہ
کہیں سرخ اشتہاروں سے ملا کرتی ہے آزادی

ہر بڑے شاعر کی نظر مستقبل پر ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں دور بہت دور افق سے پار چلی جاتی ہیں۔ ماہ ونجوم کی پہنائیوں سے آگے شمس وقمر کی دنیا سے پرے عرش بریں سے بھی ماورا اس کا ذہن سوچنے لگتا ہے۔ جہاں فرشتوں کے بھی پر جلنے لگتے ہیں۔ سیماب نے پیش گوئی کی۔

دفعتاً اک روز بدلے گی غلامی کی فضا
منتظر اک آہ کا ہے انقلاب انجمن
ظلم سے بڑھتا ہے سوز زندگی مظلوم میں
رفتہ رفتہ صید کو صیاد ہونا چاہیے
سپرد خاک ہیں پھولوں سے کھیلنے والے
چمن فروش بھی اندیشۂ بہار میں ہے

حقیقت کی پردہ دری کب تک کی جاسکتی ہے۔ جس طرح خوشبو کے جھونکوں کو مقید نہیں کیا جاسکتا، حسن بے نقاب کی شعاعوں کو روکا نہیں جاسکتا، چشم سیاہ اور دراز پلکوں کی افسوں طرازی پابند نہیں کی جاسکتی، چپکے سے اپنا کام کرجاتی ہے، اس شہاب ثاقب کے مانند جو خلا کی بیکراں وسعتوں میں چند لمحے کے لیے روشنی کی تابناک لکیر چھوڑ جاتا ہے، اسی طرح حقیقت کی نقاب سرک ہی جاتی ہے۔

جس گلستان کا محافظ پھولوں کی نکہتیں چرالے، نوخیز کلیوں کی دوشیزگی مجروح کردے، معصوم غنچوں کی شادابی ختم کردے، تو ان کو حق ہے کہ اس سفاک اور بے رحم باغباں کو کیفر کردار تک پہنچادیں۔ اس ضمن میں سیماب کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

غبار اندوزی آئینہ صبح چمن کب تک
گوارا، مضطرب نسرین و نسترن کب تک
خلاف باغباں اہل چمن نے ایک سازش کی
کہ ہم تاراج دیکھیں گے یونہی اپنا چمن کب تک
اٹھا اک شور اے روح گلستاں لوٹنے والو
بنے گا پھول کے دامن سے گلچیں کا کفن کب تک
یہ جذبہ لے کے اٹھے چوڑیاں تھیں جن کے ہاتھوں میں
کہ اب اندیشۂ ہنگامۂ دار و رسن کب تک

آزادی انسانوں کا فطری حق ہے۔ اس سے محرومی انسان کی موت ہے۔ اگر آزادی نہ ہو تو ساری تہذیبی اور شخصی قدریں مٹ جاتی ہیں۔ زندگی کے سارے آثار ختم ہوجاتے ہیں۔ سارا سکون اور ساری مسرتیں چھن جاتی ہیں۔ انفرادی احساس جب اجتماعی شکل اختیار کرلیتا ہے تو وہ کائنات کی دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ نیلگوں آسمان کے اس مہر درخشاں کی مانند جورات کی خاموشی اور تنہائی میں ساری

دھرتی پر سیمیں کرنیں بکھیرتا ہے۔ کہسار، آبشار، ریگزار و لالہ زار، وادی وصحرا، شجر وحجر، خار وگل، سنگ وسمن کسی کی قید نہیں رہتی کسی کا امتیاز نہیں رہتا۔ سیماب کہتے ہیں۔

ہمارا ہر نفس ہو ترجمان گرمی محفل
ہماری ہر ضرورت انجمن کی ہی ضرورت ہے

یہ 'ضرورت' فرد واحد کی ضرورت نہیں، ساری انجمن کی رگ جان ہے، منبع جہاں ہے۔ مغربی مفکر ٹینی سن نے کہا ہے کہ:

''جس شاعری سے ملت کا دل قوی ہو، اس کی ہمتیں بلند ہوں اس کو اعلیٰ درجہ کے اعمال حسنہ میں شمار کرنا چاہیے۔''

اس قول کے پیش نظر ہم سیماب کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمارے دلوں میں ان کے لیے قدر ومنزلت اور عقیدت واحترام کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ انھیں محسن قوم وملک کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دورافترا میں لب و رخسار، کاکل وگیسو، رنگ و رامش، فرہاد وشیریں، جام وسبو اور گل وبلبل کی مدح سرائی حقیقت سے اغماض کرتا ہے۔ ایسے شعرا کو کذاب، بہروپیے اور باطل پرست کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

باش اے کذاب اے بہروپیے باطل پرست
میں ترے پندار کو دیتا ہوں پیغام شکست
تو کبھی محفل میں آیا ہے رجز گاتا ہوا؟
گونجتا روتا گرجتا آگ برساتا ہوا؟
حشر اٹھا ہے کہیں اک نغمۂ بیتاب سے
کیا رباب دل کو چھیڑا ہے کسی مضراب سے
کیا رلایا ہے لہو تو نے کسی مضمون سے
نظم آزادی کبھی لکھی ہے اپنے خون سے

ان کا تیور یہاں بھی دیکھیے۔

اے سخن دشمن اگر حاصل نہیں یہ مرتبہ
خون کیوں کرتا ہے پھر بکواس سے الفاظ کا
درد کا حامل نہیں اصرار کا ماہر نہیں
آج میں اعلان کرتا ہوں کہ تو شاعر نہیں

فنکار تعصب وتنگ نظری سے بہت بلند ہوتا ہے۔ اس کے یہاں مذہب و ملک، رنگ ونسل، امیر وغریب اور حاکم ومحکوم کی تفریق نہیں ہوتی، وہ اخوت و مساوات کا مبلغ ہوتا ہے اور انسانیت کا علمبردار۔ امن اور شانتی کا امین ہوتا ہے اور مسرت، چاند ونغمہ، بہار اور حسن کا محافظ۔

قومیت، فرقہ پرستی اور نسلی امتیاز
پیکر انسانیت پر اک طرح کا ہے عذاب
صرف تم انسان بن کر اپنی دنیا میں رہو
پرسکون، آزاد، یکسو، کامگار و کامیاب

سیماب اکبرآبادی ایک قادرالکلام شاعر تھے اور شاعری ان کو وراثت میں حاصل ہوئی تھی۔ عربی اور فارسی زبانوں پر ان کو دست رس تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی فارسی کے اشعار کو اردو کے قالب میں ڈھالنے لگے تھے۔ مولوی سید بدرالدین قریشی اور مولوی تحقیق علی اجمیری جیسے ذی علم اساتذہ نے ان کے ذوق شعری کو پروان چڑھانے میں ان کی رہنمائی کی۔ نتیجتاً 17 سال کی عمر میں فارسی کلام کو اردو میں ترجمہ کرنے میں ان کو مہارت حاصل ہوگئی تھی، لیکن نامساعد حالات کے باعث ان کا تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔

قیام لکھنؤ کے دوران سیماب اکبرآبادی ادبی محافل میں پابندی سے شریک ہوتے۔ ان دنوں لکھنؤ میں جلال لکھنوی کا طوطی بولتا تھا، لیکن ان کا مزاج لکھنؤ سے نہیں بلکہ دبستان دہلی سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1898 میں انھوں نے داغ دہلوی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا اور جب تک زندہ رہے یہ رشتہ برقرار رہا۔ ان کی شاعری میں خوش آئند تبدیلیاں آئیں۔ شاعری کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے۔ وہ غزل پر نظم کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شعرا غزل کی بجائے نظم پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ کیوں کہ قدامت اور کہنگی کے باعث غزل اپنی معنویت کھوچکی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''1918 میں میرا رنگ تغزل بالکل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کا حامل ہوں میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں... میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعرا غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔''

سیماب اکبرآبادی ایک قادرالکلام شاعر تھے اورشاعری ان کووراثت میں حاصل ہوئی تھی۔ عربی اور فارسی زبانوں پر ان کو دست رس تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی فارسی کے اشعار کو اردو کے قالب میں ڈھالنے لگے تھے۔ مولوی سید بدرالدین قریشی اور مولوی تحقیق علی اجمیری جیسے ذی علم اساتذہ نے ان کے ذوق شعری کو پروان چڑھانے میں ان کی رہنمائی کی۔ نتیجتاً 17 سال کی عمر میں فارسی کلام کواردو میں ترجمہ کرنے میں ان کو مہارت حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن نامساعد حالات کے باعث ان کاتعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔

سیماب اکبرآبادی کرشن جی سے عقیدت رکھتے تھے۔ 'کرشن گیتا' میں شامل نظموں سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم اور مولانا روم کی شخصیت کے گہرے اثرات بھی ان کے کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کانپور کے دوران قیام وہ دیوا شریف میں ولیِ کامل حضرت شاہ وارث علی سے بیعت بھی ہوئے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن کے باعث ان کی شاعری میں معرفت، ربوبیت اور وارفتگی کے علاوہ عرفان وآگہی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

سیماب 'شاعر' کے بانی مدیر رہے ہیں۔ 'شاعر' آگرہ سے قبل انہوں نے 'مرصع'، 'اخبار آگرہ'، 'پیمانہ' اور 'تاج' کی ادارت کی۔ اس سے ان کی صحافت سے فطری اور جذباتی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'پیمانہ' کا اختصاص تھا کہ اس رسالے میں جدید رجحانات اور میلانات کی حامل تخلیقات کو اولیت دی جاتی تھی۔ انھوں نے نئی نسل کی ذہنی تربیت اور ان کے کلام کی اصلاح کے لیے 'قصر ادب' کی بنیاد ڈالی اور یہ ادارہ شعر وادب کے فروغ میں میل کا پتھر ثابت ہوا۔

فلسفۂ حقائق، محاکات، متانت اور سنجیدگی پر ان کا انقلابی اور سیاسی رنگ زیادہ گہرا ہے۔ تاہم ان کے ہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو زبان زد عام ہیں۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

سیماب اکبرآبادی کی قادرالکلامی کا اندازہ ان کی نظموں

کے عنوانات سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اپنے عہد کے اہم مسائل پر انہوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عربی اور فارسی کے الفاظ ان کی شاعری کی سلاست اور روانی میں حارج ہوتے ہیں، لیکن آج سے تقریباً اسّی سال قبل انھوں نے اپنی شاعری خصوصاً نظموں کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ان کی مناسبت سے پرشکوہ اور ادق الفاظ کا استعمال ناگزیر تھا۔

’کارامروز‘ (1934) میں حریت پرستی، حب الوطنی اور انقلاب پسندی سے متعلق متعدد نظمیں ملتی ہیں۔ سری کرشن، گوتم بدھ اور رسول کائناتؐ پر لکھی گئی ان کی نظمیں ان شخصیتوں سے ان کی بے پناہ عقیدت کا مظہر ہیں۔ ’ارض تاج‘ کے عنوان کے تحت سیماب کی سولہ نظمیں بارہ ذیلی عنوانات کے ساتھ چالیس صفحات پر محیط ہیں۔ یہ نظمیں ’تاج محل‘ سے متعلق مختلف پہلوؤں کی دل آویز تصویر کشی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں عظمت رفتہ کا درد بھی پنہاں ہے اور رجائی انداز بھی۔

فضا اے تاج تیری دلنشیں معلوم ہوتی ہے
میں سچ کہہ دوں مجھے جنت یہیں معلوم ہوتی ہے
تری معصومیت، جس کو تصور چھو نہیں سکتا
مجسم ایک خواب مرمریں معلوم ہوتی ہے

آ مسافر کچھ مناظر پھر دکھاؤں میں تجھے
گوشے گوشے میں وطن کے لے کے جاؤں میں تجھے
اخذ کی جاتی ہے ظاہر سے حقیقت کس طرح
سیر کرنا بزم عبرت کی سکھاؤں میں تجھے

گردش عالم کبھی رہتی نہیں اک حال پر
جس نے پھیری ہے نظر وہ رحم بھی فرمائے گا
تاج کے مینار سے ہوگا نیا سورج طلوع
مدفن اکبر سے ماہ نو کرن چمکائے گا

نظم ’جنگی ترانہ‘ دراصل چھوٹی بحر میں ایک قومی رجز ہے۔ نظم پرجوش اور ولولہ انگیز ہے۔ اس کا تاثر قارئین کے دلوں پر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔

دلاوران تیز دم بڑھے چلو بڑھے چلو
بہادران محترم بڑھے چلو بڑھے چلو
یہ دشمنوں کے مورچے فقط ہیں ڈھیر خاک کے
تمہارے سامنے جمے کہاں کسی میں حوصلے
نہیں ہو تم کسی سے کم
بڑھے چلو، بڑھے چلو

’سازو آہنگ‘ (1941) سیماب اکبرآبادی کا گراں قدر شعری مجموعہ ہے۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس مجموعے میں ان کی ایک سوانتالیس (139) مختصر اور طویل نظمیں شامل ہیں۔ ندائے عصر، صلائے تہذیب، حدیث ادب، سرود روح، اور نغمۂ معصوم، کے عنوان سے قائم ابواب میں آخری باب، نغمۂ معصوم، میں بچوں سے متعلق نظموں کا التزام ہے۔ پہلے باب ’ندائے عصر‘ میں قومیت، سیاست اور وطنیت کے موضوعات پر سینتالیس نظموں میں ہندوستان، اذان ہمالہ، جرس کارواں، قومی ترانہ، ہندوستان کا پیغام، بہ نژاد نوا، ایوان آزادی، صنم کدۂ جمہوریت، دعوت انقلاب، اے نوجوانان وطن، مسلمانوں سے، نوحہ وطن، کوس رحیل، سیاسی قیدی، کانگریس سے خطاب، اے وائے وطن صد وائے وطن، خواب آشنا کے جمود سے، اے اسیران وطن، تشدد اور عدم تشدد، ’شیون دریائے شور، خواتین وطن سے، اہل کشمیر کو ایک پیغام موضوعات اور مسائل کے اعتبار سے بے حد اہم اور قابل ذکر ہیں۔ ساز و آہنگ میں نسبتاً حریت پسندی کی شدت زیادہ ہے۔ کیونکہ ’ساز و آہنگ‘ کی اشاعت ’کارامروز‘ کے تقریباً آٹھ سال بعد ہوئی، جب صبح آزادی کی پو پھٹ رہی تھی اور حریت پسندوں نے اپنے سر سے کفن باندھ لیا تھا۔ قومی اور بین الاقوامی موضوعات اور مسائل پر لکھی گئی نظموں نے سیماب کے قد کو اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں کر دیا ہے۔ ان نظموں سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے جذبۂ وطن پرستی کا بھی۔

سیماب کے عہد کو اردو شاعری کا نشاۃ ثانیہ کہا جاسکتا ہے، کیونکہ سیماب کے علاوہ حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، افسر میرٹھی، چکبست لکھنوی اور اختر شیرانی

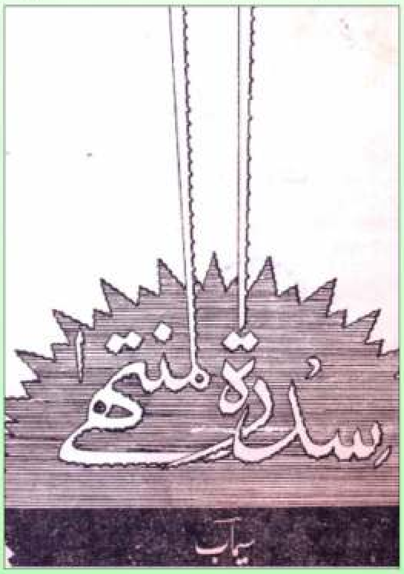

نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی، لیکن ان شعرا کا مرتبہ غزل گو کی حیثیت سے نہیں بلکہ نظم نگار کے طور پر مسلم ہے۔ ان کے پیش رو الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے اردو شاعری خصوصاً نظم نگاری کی سمت میں منظم اور منضبط قدم اٹھایا جس کے نتیجے میں غزل کی بجائے نظم نگاری کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے والے سیماب اپنے ہم عصروں میں سب سے نمایاں اور ممتاز ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

’’سیماب غزل میں پاکیزہ تغزل کے خلاف نہیں، لیکن وہ شاعری کو محض تغزل تک محدود رکھنا نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ شعرا غزل گوئی کے علاوہ اصلاحی، اخلاقی، قومی، ملکی اور سیاسی نظمیں کہنے کی عادت ڈالیں۔ وہ اس مشورے پر خود بھی عمل کرتے ہیں۔‘‘

(اردو شاعری پر ایک نظر۔ جلد دوم، ص 302)

اپنے پیش رو اقبال، حالی اور آزاد سے وہ متاثر تھے۔ سیماب نے روایت سے ہٹ کر اردو نظم کو جدتوں سے نہ صرف ہم کنار کیا بلکہ اس کو نئی سمت بھی عطا کی۔ انہوں نے اردو شاعری میں ہیئتی تجربے کیے بلکہ یہ کہا جائے کہ سیماب اکبرآبادی نے اجتہاد کیا اور اردو نظم کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا تو غلط نہ ہوگا، لیکن ناقدین ادب نے سیماب کی شاعری کے اس وصف سے صرف نظر ہی نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ناانصافی بھی کی ہے۔

سیماب کا عہد سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی اعتبار سے بہت اہم کہا جاسکتا ہے۔ ملک کے سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ 1857 کی ناکام بغاوت اور ترقی پسند تحریک کے اثرات ونفوذ نے ان کی شخصیت اور فکر کو نئی سمت عطا کی تھی۔ لہٰذا محنت کشوں اور دبے کچلے لوگوں کی زندگی کی صدائے بازگشت ان کی شاعری میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ معاشرتی حالات اور مسائل سے انھوں نے اغماض نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب، حریت، وطنیت اور انسانیت کا جذبہ ان کی شاعری کا اختصاص وامتیاز بن گیا ہے۔

ساز و آہنگ، امروز اور ’شعر انقلاب‘ ان کے قابل ذکر اور اہم شعری مجموعے ہیں۔ تاج محل، تاج شاہی محبت کی ٹھوکروں میں، نور جہاں کا مقبرہ اور ’برسات‘ سیماب اکبرآبادی کی معرکہ آرا نظمیں ہیں، لیکن جذبۂ وطنیت سے سرشار اس انقلابی شاعر کو ہم نے یکسر فراموش کر دیا ہے۔

■

Prof.AslamAzaad
2,Professor'sBungalow
Patna-800006
M.09431063199

رامائن کا منظوم اردو ترجمہ

نسیم احمد نسیم

ترجمہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس کے بغیر دوسری زبانوں کے علوم وفنون سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ذریعے دوسری زبان کے ذخیرۂ علم سے آشنا ہوتی ہے۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ اکثر سمجھ لیا جاتا ہے۔ اصل متن کی داخلی ساخت، آہنگ واسلوب اور لسانی مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُسے کسی دوسری زبان کے قالب میں ڈھالنا بہت مشکل اور پیچیدہ عمل ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض ناقدین اسے ناممکن اور غیر فطری کام تصور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں جہاں ایک طرف ڈاکٹر سیموئل جانسن نے شاعری کے ترجمے کو ناممکن بتایا ہے تو دوسری طرف وکٹر ہیوگو نثر میں ترجمہ کو ناقابل فہم اور ناممکن قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترجمہ نگاری کا فن سرے سے بیکار اور بے نتیجہ ہے۔ ایک ماہر اور مشاق مترجم اصل متن کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت اس میں ایک نئی روح ڈال دیتا ہے اور بعض اوقات اس کے ترجمے پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور جامعہ عثمانیہ وغیرہ کے ذریعے کروائے گئے ترجموں میں مل جائیں گی۔ اور آج تو اسے ایک مستقل فن کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ اس کام کا وقار بڑھا ہے، اسے دوسرے درجے کا نہیں بلکہ اول درجے کا کام مان لیا گیا ہے۔ وہ اس لئے کہ اردو کے دامن کو وسعت دینے اور دنیا کی تہذیب وثقافت نیز عالمی سطح کے شہ پاروں سے متعارف کرانے میں اس کے کلیدی رول سے اب کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک نثر اور شاعری کے ترجمے کا معاملہ ہے تو سب جانتے ہیں کہ نثر سے زیادہ نظم کا ترجمہ مشکل ہے۔ شاعری کے ترجمے کے دوران اصل متن کے شعری مزاج وآہنگ کے ساتھ اُس کے پس منظر اور شعری روایت کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات مترجم کو اصل متن سے الگ کچھ ایسی اضافی چیزوں کو شامل کرنا پڑتا ہے جو اصل متن کی تفہیم کو آسان اور پرکشش بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لفظ کی جگہ لفظ ٹانکنا مبتدیوں کا کام ہے۔ اصل ترجمہ نگار اپنی مہارت اور خلاقی سے نہ صرف اُسے اپنی زبان کا حصہ بنا دیتا ہے بلکہ اُسے ایک بہترین فن پارے کے طور پر قارئین کے درمیان متعارف بھی کرا دیتا ہے۔

درج بالا تمہید کے بعد اب ہم اُن منظوم ترجموں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہیں گے جن کا براہ راست تعلق شہرۂ آفاق مذہبی صحیفہ رامائن سے ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ قدیم ہندوستان کی دو رزمیہ تصانیف رامائن اور مہابھارت ہیں اور یہ دونوں سنسکرت میں موجود تاریخی صحیفے کا بھی درجہ رکھتی ہیں۔ مہابھارت کی طرح رامائن کے بھی سو (100) سے زیادہ منظوم اردو ترجمے ہوچکے ہیں۔ اُن میں شنکر دیال فرحت، بابولال نبودی، رام کرت، بابو بانکے بہاری لال، سری سکھ دیولال، تنکی چند اور اچھو چند لاہوری کے نام خاص ہیں، جنھوں نے رامائن کے عمدہ منظوم ترجمے پیش کیے۔ یہ ترجمے زیادہ تر منشی نولکشور اور تمنائی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے ہیں۔ ان ترجموں کے زیادہ تر مطبوعہ نسخے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور اور الہ آباد یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔ رامائن کے رچیتا مہرشی بالمیکی کو سب سے قدیم شاعر مانا جاتا ہے۔ بالمیکی نے رامائن کو ایک تاریخی واقعے کے طور پر تخلیق کیا ہے۔ اُن دونوں صحیفوں کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے عمادالحسن آزاد فاروقی نے لکھا ہے کہ:

''مہابھارت کے برخلاف رامائن ایک شخصیت رام چندر جی اور اُن سے متعلق لوگوں کے بارے میں ایک مستقل اور مربوط قصہ ہے۔ مہابھارت کے مقابلے میں رامائن زیادہ ترقی یافتہ، مہذب، شائستہ اور اخلاقی اصولوں پر معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔''

اب آیئے رامائن کے کچھ اہم اردو ترجموں کے متعلق گفتگو کی جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے منشی شنکر دیال فرحت کے منظوم ترجمے کا ذکر لازمی ہے۔ یہ منشی نول کشور پریس لکھنؤ سے 1846 میں شائع ہوا۔ مثنوی کے فارم میں موجود اس ترجمے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت ہی سہل اور رواں زبان اور اسلوب میں موجود ہے۔ اس کی ابتدا شری رام کی تعریف اور توصیف سے ہوتی ہے شاعر کے مطابق شری رام یگ پُرش تھے۔ انھیں ایشور نے اپنا نمائندہ بنا کر دھرتی پر اتارا تھا تا کہ اُن کے ذریعے بلا تفریق من و تو سب کے ساتھ انصاف ہو، سب کا بھلا ہو، سب کی اہمیت ایک جیسی ہو۔ یعنی ایک ایسا جمہوری نظام قائم ہو جس میں سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ واضح ہو کہ رام راجیہ کا تصور یہیں سے منظر عام پر آتا ہے۔

اب ملاحظہ فرمائیں اس مثنوی کے شروعاتی چند اشعار۔

زباں پہ ہر نفس کے رام کا نام
نمو رام و نمو رام و نمو رام

———

سدا روشن چراغ جان ہے اُن سے
فروغ مشعل ایمان ہے اُن سے

وہی گم ہے، وہی ہے آشکارا
وہی مردم کی عین آنکھوں کا تارا

بیاں کیا پاک یا ناپاک سے ہو
صفت کیا خاک ،مشتِ خاک سے ہو

ان اشعار میں شنکر دیال فرحت نے نہ صرف شری رام سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ ایسے اسلوب اور ایسی زبان کا استعمال کیا ہے جو عوام وخواص، دونوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ لیکن فرحت کی کوششوں کے باوجود ان کے ترجمے کو خاطر خواہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ ہندو متھ کے مطابق جب شری رام اپنے چودہ برس کے بن باس کے بعد واپس آئے تو انھوں نے مہرشی بالمیکی کے آشرم کا رخ کیا اور بقیہ زندگی اُن کے قریب رہ کر گزاری۔ اُن کے صاحب زادے لو اور کُش کو مہرشی بالمیکی نے ہی اس دور کے تقاضے کے تحت تعلیم و تربیت سے سنوارا۔ آج بھی بہار کے مغربی چمپارن اور نیپال کی سرحد پر جنگل میں بالمیکی آشرم کے آثار موجود ہیں جہاں لو اور کش کی تعلیم و تربیت ہوئی اور اُن کی یادگاریں محفوظ کر لی گئیں۔ حالانکہ اس واقعے کی کوئی تاریخی صداقت نہیں ہے تاہم یہ اندازہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ مہرشی بالمیکی نے شری رام اور اُن کے اہل خانہ کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اُن کو اپنا مقرب بھی رکھا تھا۔ اس لیے بالمیکی کے رامائن کو دوسرے تمام رامائنوں میں زیادہ معتبر اور اہم تصور کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بالمیکی رامائن کے ترجمے اردو میں خصوصیت کے ساتھ الگ الگ شعری اصناف میں ہوئے۔ کہیں مکمل رامائن کے ترجمے ہوئے تو کہیں اس کے الگ الگ حصوں کو مختلف عنوانات کے تحت اردو میں منتقل کیا گیا۔

رامائن کے مترجمین میں ایک اور اہم نام دوارکا پرساد افق لکھنوی کا ہے۔ اُن کا منظوم ترجمہ نول کشور پریس سے سنہ 1804 میں شائع ہوا۔ اُس کے آغاز کے چند اشعار دیکھیں۔ ان اشعار کے ذریعے افق نے شری رام کی شبیہ اجاگر کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔

دل کو خواہش ہے کہ رگھبر کا سراپا ہو بیان
کھینچتا ہے رام کی تصویر یوں ملکِ روان
کان میں کنڈل ،مکٹ سر پر تلک زیبِ جبیں
مال بےجنتی گلے میں ، ہاتھ میں تیر و کمان
بعد وہ صحرا میں باندھا جس کا جوڑا رام نے
موئے مشکیں وہ جو بڑھ بڑھ کر ہوئے موئے میان

ایک منظر اور ملاحظہ کریں جس میں شاعر نے شری رام کی تاجپوشی کے جشن کو شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

جب نوید آمد آمد سے ہوا دل شادمان
پیشوائی کو بھرت راہی ہوئے عشرت کنان
دور چل کر جب نظر آئی سواری رام کی
سرزمین شہر نے پایا عروج آسمان
بھرت قدموں پر گرے زلفِ حسیناں کی طرح
پاؤں کے بوسے لیے بن کر حنائے بوستان

اور اب اخیر کے یہ اشعار۔

تخت گردوں پر جو بیٹھا شاہِ اقلیم افق
رام نے رکھا سرِ اقدس پہ تاج زر فشان
تخت شاہی نے قدم چومے کھڑاؤں کی طرح
چتر زر سورج سے بن کر سر پہ گھوما آسمان
ملک داری میں ہوئے مشغول راجہ رام چندر
عدل سے رہنے لگی ساری رعایا شادمان
وردِ لب ، وردِ زباں ، وردِ دہن ہر نام ہو
ہو یہ رامائن پسند خلق و مرغوب جہان

افق نے اپنے اس ترجمے میں شری رام کتھا کو اشعار کی شکل میں ڈھالنے کے دوران خاص طور پر یہ خیال رکھا ہے کہ قصے اور واقعات کو ترتیب کے ساتھ اس طرح پیش کیا جائے کہ دلچسپی اخیر تک قائم رہے۔ یہاں کہانی پن کی خصوصیت اور شاعرانہ کشش و جاذبیت، دونوں نے مل کر ترجمے کو بہت کارآمد بنا دیا ہے۔

معروف افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر نے اپنے ایک مضمون 'رامائن اور اس کے ترجمے اردو میں' ایک اور مترجم سردار جسونت سنگھ کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے مطابق جسونت سنگھ نے رامائن کا ایک ناٹک کے روپ میں ترجمہ کیا ہے اور اسٹیج کے تقاضے کے تحت اسے صحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اُس وقت کی تھیٹریکل کمپنیوں کے ذریعے غلط واقعات پیش کرنے پر قدغن لگے۔ واضح ہو کہ اس وقت بعض کمپنیاں نازیبا نکتہ چینی کر کے شری رام اور سیتا کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش میں ملوث تھیں۔ جسونت سنگھ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ واقعات کی صحت کو بحال کیا تاکہ رام اور سیتا کے متعلق غلط اور لغو روایات کا سلسلہ دراز نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے اپنے ڈرامائی ترجمے کو عوام میں مقبول اور محبوب بنانے کے لیے ہر نئے سین سے پہلے ایک گانے کو شامل کیا تاکہ آغاز میں ہی قاری یا ناظر کو اپنی گرفت میں لے سکیں۔

بطور مثال ایک گانے کا یہ حصہ دیکھیں۔

پھر اودھ پوری کے بھاگ کھلے
سیارام لکھن یہاں آئے ہیں
درشن رام دکھائے ہیں
دھن دھن سیتا جنک دُلاری
دھن تیرا پتا ، دھنیہ مہتاری
سُکھ تج کر دکھ پائے ہے
دھنیہ رام ، دھنیہ ان کی ماتا
دھنیہ لکھن دھنیہ بھرت بھراتا
جاکے یش جگ چھائے ہیں
چرنوں نین بچھائے ہیں

اس مقالے کے آغاز میں، میں نے عرض کیا ہے کہ رامائن کے اب تک ایک سو سے زیادہ منظوم ترجمے مختلف وقتوں میں الگ الگ انداز واسلوب کے ساتھ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ یہاں ہم نے طوالت سے بچتے ہوئے صرف تین اہم ترجموں تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ ان تینوں کے غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان مترجمین نے نہ صرف شری رام کتھا کو اردو میں منتقل کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے بلکہ انھوں نے حتی المقدور ترجمے کے تقاضے پر کھرا اترنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ بات ابتدا میں ہی واضح ہو چکی ہے کہ کوئی بھی ترجمہ تخلیق یا تحریر کا من وعن متبادل نہیں ہو سکتا، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ بہت حد تک ہم اصل کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔ مختصر یہ کہ مذکورہ ترجمہ نگاروں نے بلاشک وشبہ اصل متن کے قریب پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی خلاقانہ قوت، طرز بیان، اسلوب کی دلکشی اور زبان کی سلاست کے ذریعے اپنے ترجموں کو قابل قدر بنا دیا ہے۔ یہ ترجمے واقعاتی طور پر کامیاب تو ہیں ہی ساتھ ہی یہ فنی طور پر بھی پختہ اور معیاری ہیں۔

■

Dr. Naseem Ahmad Naseem
Bettiah (Bihar)

ترجمہ نگاروں نے بلاشک و شبہ اصل متن کے قریب پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنی خلاقانہ قوت، طرزبیان، اسلوب کی دلکشی اور زبان کی سلاست کے ذریعے اپنے ترجموں کو قابل قدر بنادیا ہے۔ یہ ترجمے و اقعاتی طور پر کامیاب تو ہیں ہی ساتھ ہی یہ فنی طور پر بھی پختہ اور معیاری ہیں۔

شاذیہ عمیر

خود آگہی کا سفر
نسائی شعری آواز

اردو ادب کے آٹھ سو سالہ شعری سفر کی تاریخ میں 'عورت' کا وجود بطور موضوع حاوی رہا ہے۔ اس کے حسن و جمال اور عہدِ شباب پر دیوان کے دیوان ترتیب دیے گئے لیکن اپنی ذات کو خود مرکزِ نگاہ بنانے اور عرفان و آگہی کے دریچے وا کرنے سے اسے محروم رکھا گیا اور صدیوں کے تہذیبی جبر نے اپنے نام تک کو چھپا کر رکھنے کی ایسی تلقین کی کہ حرف و قلم سے رشتہ رکھنے والی خواتین بھی بنت، والدہ اور زوجہ کے سات پردوں میں خود کو نہاں رکھنا باعثِ عزت و توقیر سمجھتی رہیں۔ اگرچہ انیسویں صدی کے کچھ تذکرہ نویسوں نے ان کے نام اور کلام کو محفوظ کرنے کی کاوش تو کی لیکن بیشتر شاعرات حمد، نعت، منقبت اور مناجات کی دنیا تک ہی محدود رہیں کہ ان کی لوحِ جبیں پر زنِ بازاری کا لقب نہ چسپاں کر دیا جائے۔

انقلابِ زمانہ نے یہ باور کر دیا کہ اب اس حاشیائی مخلوق کو مذہب اور خاندان کی عزت و ناموس کے نام پر سات پردوں میں چھپا کر رکھنا اور عرفان و آگہی کے تمام دریچے بند کر کے محض ایک گونگی بہری مخلوق کے طور پر محبوس رکھنا ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا انیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ مغربی تہذیب و تمدن کی برکتوں نے برصغیر کے اس معاشرے پر قدغن لگانا شروع کر دیا، جہاں عورتیں ہزاروں سال سے مرد کردار کی پرچھائیں بن کر جی رہی تھیں۔ نتیجہ ان کے وجود میں جیسے ہی پہچان کا کوندا لپکا، یہ اپنی شناخت کی جدو جہد کے لیے نکل پڑیں اور صیغۂ تذکیر کو بیک جنبشِ قلم مسترد کرتے ہوئے صیغۂ تانیث استعمال کرنے لگیں۔

بیسویں صدی میں یہ رجحان مزید پروان چڑھا امتہ الرؤف، نجمہ تصدق، سعیدہ جہاں مخفی، رفیعہ بانو مضمر وغیرہ نسائی لب و لہجے میں اظہار کرنے والی اولین شاعرات ہیں، جن کے نقشِ پا نے آگے چل کر تانیثی حسیت کی علم بردار شاعرات کی ایک پوری کائنات مزین کر دی۔

اِن میں اگر دیکھا جائے تو ادا جعفری وہ پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنے مکمل نسائی وجود کے ساتھ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی شخصیت کا برملا اظہار کیا۔ ابتدا میں ان کے یہاں کچی عمر کے کول جذبات و احساسات ایک والہانہ سرشاری کے ساتھ اپنی جھلک دکھاتے ہیں: اشعار دیکھیے۔

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں
در بھی نہیں تھا کوئی دریچے بھی بند تھے
آنکھوں میں جانے کیسی دھنک تھی رچی ہوئی

بہت جلد انھیں احساس ہو گیا کہ زندگی کا سفر اتنا سہل نہیں کہ جس راہ کا انھوں نے انتخاب کیا ہے، وہاں دُور دُور تک کسی گھنی چھاؤں کا گزر نہیں اور آبلہ پائی ہی نوشتہ ٹھہری لیکن اس کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارتیں اور پورے اعتماد کے ساتھ آواز بلند کرتی ہیں۔

میں آندھیوں کے پاس تلاشِ صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو مرا حوصلہ ہے کیا
ادا میں نکہتِ گل بھی نہ تھی صبا بھی نہ تھی
کہ میہماں سی رہوں اور اپنے گھر میں رہوں

زہرا نگاہ بھی ابتدائی دنوں میں روایتی عشقیہ جذبات سے لبریز اشعار کہتی رہیں لیکن روایت کے حصار سے باہر نکل کر جب انھوں نے زمانے کے نشیب وفراز کو دیکھا تو ان کی شاعری بھی اس کی ترجمان بن گئی۔ اپنے عہد کے دوہرے رویے، عورت ذات کی بے بضاعتی ومحرومی اور معاشرے کی بے ضمیری نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

لبِ گویا تو مل گیا تھا ہمیں
صرف اظہارِ مدعا نہ ہوا
نارسائی مزاجِ دل ٹھہری
ختم کوئی بھی سلسلہ نہ ہوا

ایوانِ شاعری میں کشور ناہید کی آمد ایک ایسے باغیانہ تیور کے ساتھ ہوئی، جس کی زد میں تہذیبی، سماجی اور تاریخی جبر کی تمام صورتیں پرت در پرت بے نقاب ہوتی چلی گئیں۔ صدیوں کا فرسودہ نظامِ حیات جہاں عورت چکّی کے دو پاٹوں میں جنم جنم سے پستی چلی آرہی ہے، گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی، اس کے خلاف کشور نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ نتیجہ انھیں مرد دشمن، مرد بے زار، اور سخت مزاج جیسے خطابات سے نوازا گیا لیکن غور کیجیے کہ جابرانہ اور حاکمانہ معاشرے کے خلاف جرأت اظہار کے اسی آہنگ نے ناہید کو وہ گویائی عطا کی جو ان سے پہلے ناپید تھی۔ کشور کا باغیانہ تیور اور بلند آہنگی ملاحظہ فرمائیں۔

ہماری بے کسی پر ہمارے ہاتھ کٹے
وہ خلعتوں سے سرفراز لے کے خنجر بھی
ہم ایسے دشت نوردوں کو قید رکھنے کو
سلاخیں گاڑ گئے ہیں گھروں کے اندر بھی
یہ کیا آدھے چاند پہ رونق آدھے پہ تاریکی
یہ کیا صبح ان کی رات القاب ہمارے

کشور کے لیے جہاں مرد دشمنی جیسا لفظ مخصوص ہے تو فہمیدہ ریاض پر مغرب زدہ عورت کا لیبل چسپاں کیا گیا جب کہ فہمیدہ کی شاعری بھی اس پورے پس منظر کا احاطہ کرتی ہے، جس میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔ وہ معاشرہ جہاں کے بعض قبائل میں عورت کو اتنا سخت پردہ کرایا جاتا ہے کہ جب کبھی ضرورت کے تحت بھی نکلنا پڑے تو جیپ کے شیشے پر ملتانی مٹی لیپ دی جاتی ہے۔ کتنے ہی گھروں میں عورتوں کا جنازہ تک دن کے بجائے رات کو نکلتا ہے کہ بے پردگی نہ ہو۔ ایسے زنگ آلود ذہن معاشرے میں فہمیدہ اس طرح کے اشعار کہتی ہیں۔

کیوں کھوٹ ہے میری زندگی میں
میں اس کا جواب دے رہی ہوں
کیوں جھوٹے ہیں میرے شب و روز
میں ان کا جواز بن گئی ہوں
ہاں میرے خمیر میں کجی تھی
خوش ہوں کہ اب بھٹک رہی ہوں

مہذب سماج وہ ہے، جس میں ہر فرد کو برابری کا حق ملے۔ اپنی بات کہنے اور دوسروں کی بات سننے کا حوصلہ ہو لیکن آج بھی برصغیر کے بعض معاشرے میں مہذب شہری ہونے کے دو پیمانے رائج ہیں۔ لڑکیوں کے لیے الگ اور لڑکوں کے لیے الگ۔ آنکھ کھولتے ہی لڑکیوں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ وہ جتنا ہو سکے کم بولیں گویا ملک کی نصف آبادی کی زبان پر ابتدا سے ہی پہرے بیٹھا دیے جاتے ہیں۔ معاشرے کے اس دوہرے رویے کا کرب اِن اشعار میں چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

سونا آنگن، تنہا عورت، لمبی عمر
خالی آنکھیں، بھیگا آنچل، گیلے ہونٹ
اتنا بولوگی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی یہ ہے لڑکی سی لے ہونٹ

(عشرت آفریں)

کہنہ روایتوں کی زنجیر توڑنا اتنا آسان نہیں۔ ایک مدت سے محبوس اور مجبورِ محض بنا کر رکھی جانے والی حاشیائی مخلوق تبھی اپنا جائز حق وصول کر پائے گی جب وہ اپنی گھٹن اور خلش کو گویائی عطا کرے گی لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ آگے بڑھ کر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور سخت سے سخت آندھی میں بھی حوصلہ نہ ہارے۔ اس بات کا عرفان، رفیعہ شبنم عابدی کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

مرے وجود کو ہونے کا کچھ گمان تو دے
ہنر دیا ہے تو نشان دے پہچان تو دے
ابھی ہے چند ہی ذرروں پہ اختیار مجھے
مرے سخی مرے ہاتھوں میں کل جہان تو دے
جو بازو کھول دیے ہیں تو یہ بھی زحمت کر
پروں کو تول سکوں اتنا آسمان تو دے

لڑکیوں کی اپنی مرضی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کا کوئی گھر ہوتا ہے، پیدائش سے ہی ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ جس گھر میں انہوں نے آنکھیں کھولیں وہ گھر پرایا ہے پھر جب بیاہ کر سسرال جاتی ہیں تو بظاہر ایسا محسوس ہوتا جیسے انہیں مستقل پناہ مل گئی لیکن صرف حکم کی تعمیل کی حد تک یہی رول وہ ماں باپ کے گھر میں بھی

> **”کشور کے لیے جہاں مرد دشمنی جیسا لفظ مخصوص ہے تو فہمیدہ ریاض پر مغرب زدہ عو رت کا لیبل چسپاں کیا گیاجب کہ فہمیدہ کی شاعری بھی اس پورے پس منظر کا احا طہ کر تی ہے، جس میں ان کی شخصیت پروان چڑھی۔ وہ معاشرہ جہاں کے بعض قبائل میں عورت کو اتنا سخت پرد ہ کرایا جاتا ہے کہ جب کبھی ضرورت کے تحت بھی نکلنا پڑے تو جیپ کے شیشے پر ملتانی مٹی لیپ دی جاتی ہے۔ کتنے ہی گھروں میں عورتوں کا جنازہ تک دن کے بجائے رات کو نکلتاہے کہ بے پردگی نہ ہو۔“**

نبھاتی ہیں اور ان کے حکم کے آگے سرخم کرنا ہی ان کا دین و مذہب ہوتا ہے۔ مزید شوہر کے گھر بھی یہی ان کی زندگی کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ مذہب اور سماج دونوں کے نزدیک ان کی حیثیت ثانوی ہے، اپنے اس نامکمل وجود کا بوجھ اپنے ہی شانوں پر اٹھاتے اٹھاتے جب ان کی شخصیت پارہ پارہ ہونے لگتی ہے تو پھر یہ شکوہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی زبان پر مچل اٹھتا ہے۔ اشعار دیکھیے:

تو ہے مختار تجھے حق ہے تصرف پہ مرے
میں ہوں کھیتی تری تو مجھ کو بھی جاگیر میں رکھ
اپنے احساس رفاقت کا بنا مجھ کو گواہ
اور پھر میری گواہی مری تقصیر میں رکھ

(نسیم سید)

گویا عورت کا وجود بے جان گڑیا کی طرح ہے، جب تک چاہا کھیلا، جب جی چاہا توڑ دیا۔ اس معاملے میں نہ کوئی اصول ہے اور نہ ہی کوئی نظریہ، سارے قوانین یک طرفہ فیصلہ سناتے ہیں۔

جہاں چاہا وہیں رکھا نہیں چاہا نہیں رکھا
کبھی صیدِ فلک رکھا کبھی زیرِ زمیں رکھا

(عذرا پروین)

شادی شدہ زندگی میں 'عورت' اکثر اپنی ایک طرفہ ذمہ داری نبھاتے نبھاتے ٹوٹنے بکھرنے لگتی ہے۔ گھر بچے شوہر بظاہر تو اس کے قریب ہوتے ہیں پھر بھی اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی ہستی صفر ہو کر رہ گئی ہے اور اس کا وجود دھواں دھواں ہو کر خلا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ بے بضاعتی کا یہ احساس جب قطرہ قطرہ لہُو کی صورت

"زخمی روح اور گھائل بدن کے ساتھ زندگی کے کسی موڑ پر شوہر کی طرف سے ٹھکرا دیے جانے کا خدشہ بھی بعض عورتوں کا نوشتہ تقدیر ہے۔ یہ خوف ان کے ذہن پر اس طور حاوی رہتا ہے کہ چاہ کر بھی وہ اس سے نجات حاصل نہیں کر پاتیں۔ مزید المیہ یہ کہ سماج بھی انہیں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔"

آنکھوں سے ٹپکتا ہے تو اس طرح لَو دیتا ہے۔

میں بسر کروں کسی اور کے شب وروز کو
کوئی میری عمر گزار دے کہیں یہ نہ ہو
مجھے اپنی شرط پہ جیتنے کے بعد بھی
کسی مصلحت پہ وہ ہار دے کہیں یہ نہ ہو

(شاہدہ حسن)

زخمی روح اور گھائل بدن کے ساتھ زندگی کے کسی موڑ پر شوہر کی طرف سے ٹھکرا دیے جانے کا خدشہ بھی بعض عورتوں کا نوشتہ تقدیر ہے۔ یہ خوف ان کے ذہن پر اس طور حاوی رہتا ہے کہ چاہ کر بھی وہ اس سے نجات حاصل نہیں کر پاتیں۔ مزید المیہ یہ کہ سماج بھی انہیں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔ پروین شاکر کہتی ہیں۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
اَنا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اُٹھ کے بند مری ہر کتاب کردے گا

اس کا مطلب یہ نہیں کہ نسائی شعری آواز صرف گھر آنگن اور ذاتی مسائل تک ہی محدود ہے۔ بلکہ ایک طرف جہاں زمانے کی ہر کروٹ اور ہر دھمک سے آشنا ہیں تو دوسری طرف فلسفیانہ رموز ونکات سے بھی یہ سرفراز ہیں۔ عہد حاضر کے جبر و استبداد، انسانی زندگی کی ارزانی، وقت کی سفاکی اور موت کی دہشت ناکی نے زاہدہ زیدی کے دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتسم کیے، ہم کیوں ہیں اور ہمارے اطراف یہ پھیلی ہوئی کائنات کیوں ہے، جیسے سوالات کے پس منظر میں یہ اشعار دیکھیے۔

یہ کس نگر میں آگئے یہ کون سا مقام ہے
سیاہیوں کی دو پہر تمازتوں کی شام ہے

ایک زندان حوادث میں ہے پابستہ حیات
فکر آوارہ سے پوچھو کہ کدھر جائے گی

(زاہدہ زیدی)

موجودہ عہد کا المیہ یہ ہے کہ رشتوں میں گھرے ہونے کے باوجود بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لق ودق صحرا میں انسان تن تنہا کھڑا ہے اور دور دور تک کسی سائے کا گزر نہیں۔ شاعر چونکہ عام انسان سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس لیے اس کے یہاں یہ کرب بھی شدید ہے لیکن یہ کرب کسی قنوطیت کا زائیدہ نہیں بلکہ اپنی ہی ذات کے سفر کا استعارہ ہے۔ ایک ایسا سفر جو کراں تا کراں پھیلتا چلا جاتا ہے، جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا۔ ساجدہ زیدی کہتی ہیں۔

گو کانپتا تھا حلقۂ زنجیر میں قدم
جوئے طلب نے دے دیا حکم سفر مجھے
ہر خارِ رہ الجھتا ہے دامانِ شوق سے
لے جائے گی یہ آبلہ پائی کدھر مجھے

شہری زندگی کی منافقت نے رشتوں کو ایسا بے توقیر کیا ہے کہ آج ہر فرد خود میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ کوئی کسی کے لیے حق بات کہنے کو تیار نہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہے۔ کسی کو اس بات کی فرصت نہیں کہ دوسروں کا دکھ درد بھی محسوس کر سکے۔ اِسی رویے کو مظفر النساء ناز نے ان اشعار میں بہت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

نہ گفتگو میں تسلی نہ خامشی میں صدا
سلوکِ دوست کا انداز ہی نرالہ ہے
خدا ہی جانتا ہے کس کی کیا ہے محرومی
رئیس وقت بھی کشکول لے کے پھرتا ہے

ایسے ناسازگار حالات میں بھی شاعرات نے انا وخودداری کا دامن نہیں چھوڑا اور حق بات کہنے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ سر بلند ہو کر جینا اور اپنی شرطوں پر جینا کوئی آسان کام نہیں لیکن علم وآگہی کی قندیل نے انہیں وہ جرأت عطا کی ہے کہ حق بات کہنے سے بھی یہ گریز نہیں کرتیں، خواہ اس کی کتنی ہی بڑی قیمت کیوں نہ چکانی پڑے:

موجودہ عہد کا المیہ یہ ہے کہ رشتوں میں گھرے ہو نے کے باوجود بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لق و دق صحرا میں انسان تن تنہا کھڑا ہے اور دور دور تک کسی سائے کا گزر نہیں۔شاعر چونکہ عام انسان سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس لیے اس کے یہاں یہ کرب بھی شدید ہے لیکن یہ کرب کسی قنوطیت کا زائیدہ نہیں بلکہ اپنی ہی ذات کے سفر کا استعارہ ہے۔ ایک ایسا سفر جو کراں تا کراں پھیلتا چلا جاتا ہے ، جس کی نہ کو ئی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا۔

عمر بھر دیکھا ہوا وہ آرزو کا خواب تھا
کتنی آسودہ ہوئی ہوں اپنے ہی انکار سے
نسبت ہی کسی سے ہے نا رکھتے ہیں حوالے
ہاں ہم نے جلا ڈالے ہیں رشتوں کے قبالے

(نور جہاں ثروت)

علاوہ ازیں دوسری شاعرات نے بھی موجودہ عہد کی شورش وبے کلی، قتل وغارت گری، انسانی رشتوں کی بے توقیری، تنہائی کا کرب اور ایسے دوسرے تمام موضوعات جس سے آج کا انسان نبرد آزما ہے، اسے شعری پیکر عطا کرنے کی سعی کی ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

روز نیزوں پہ تمناؤں کے سر آتے ہیں
اب مری فتح کے آثار نظر آتے ہیں

(شانِ معراج)

بے چہرہ ہوئے آج مگر کس سے شکایت
آئینہ اسی کا ہے تو حیرت بھی اسی کی

(صدیقہ شبنم)

تا حد نظر گویا ہے جاگیر انہیں کی
کہنے کو یہاں رہتے ہیں دو چار برس سے

(اُمّ ہانی)

اِن اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کی شاعرات نے تمام موضوعات اور مسائل کا بہ حسن وخوبی احاطہ کیا ہے۔ بلقیس ظفیر الحسن، حمیرا رحمٰن، ملکہ نسیم، اسما سعیدی، شائستہ یوسف اور شبنم شکیل جیسی شاعرات کے یہاں بھی سماجی وسیاسی جبر واستبداد کی تصویر کشی، تنہائی کا کرب، ماضی کی خوشگوار یادیں، عصری مسائل، اپنی ذات کی جستجو وغیرہ موضوعات نہ صرف فکری وفنی بصیرت کے ساتھ اشعار کے پیکر میں ڈھلتے چلے گئے ہیں بلکہ اپنا مقام بھی بنا چکے ہیں اور وہ دن دُور نہیں جب اِن کی فکری اڑان تمام وسعتوں کو پار کرتے ہوئے کائنات کے جملہ اسرار ورموز تک بھی رسائی حاصل کر لے گی۔

تھکن سے چُور ہوں لیکن رواں دواں ہوں میں
نئی سحر کے چراغوں کا کارواں ہوں میں

(داراب بانو وفا)

■

Dr. Shazia Omair,
Assistant Professor
Department of Urdu, University of Delhi-110007, Mob: 9650618651
E-mail: drshaziaomair@gmail.com

اردو غزل اور علم کونیات
(Cosmology)

ای آر محمد عادل

انسان ایک حساس ذہن لے کر اس کائنات میں آیا ہے اور اپنے گرد و پیش میں مشاہدات کرتا رہا ہے۔ جب وہ اس کائنات میں آیا تو مختلف چیزوں کا مشاہدہ کرنے کے سبب اس کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات کا جنم ہوا۔ یہ مشاہدات اس کی شعوری فکر پر مبنی تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے ذہن کے مطابق اس وسیع کائنات کو شعور کی فکر پر پرکھتا ہے لیکن جس کا جیسا ذہن اور مشاہدہ ہوتا ہے وہ اس کائنات کی وسعتوں اور گہرائی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ ایک شاعر بہت حساس ذہن رکھتا ہے اس کا شعور بھی ایک عام آدمی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جن سوالات کا جواب آج کی جدید سائنس دریافت کر رہی ہے وہ سوالات اس کے ذہن میں بھی موجود ہیں اور یہ بھی مسلسل ایک سائنسداں کی طرح اس کی دریافت کر رہا ہے۔ یعنی ایک مشترکہ احساس دونوں میں ہے جو اس کو فطری طور پر قدرت سے ملا ہے۔ اسی شعور کی جھلک ہم کو اردو شاعری کے شعرائے کرام کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اردو غزل اور علم کونیات کے موضوع پر یہ مضمون اپنے دامن میں کائنات کے حیرت انگیز کرشموں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

انسانی زندگی کی ابتداء سے لے کر آج تک یہ وسیع و عریض کائنات انسانی ذہن کو اپنی طرف مبذول کرتی رہی ہے۔ جس کے سبب انسانی ذہن میں منفرد سوالات کا جنم ہوتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اس کائنات کا کس طرح وجود ممکن ہوا ہے؟ کائنات کے نظام میں سورج، چاند، ستاروں کی کیا حیثیت ہے؟ اس نظام شمسی میں ہماری زمین کی کیا کارکردگی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پرانے زمانے میں انسان کے نزدیک ہمارا نظام شمسی ہی پوری کائنات کی حیثیت رکھتا تھا اس کے ذہن میں کائنات کی بہت سی چیزوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ کائنات کے پورے ڈھانچے اور اس کے مَبداء کا علم کونیات (Cosmology) کہلاتا ہے۔ کائنات کی ابتدا اور اس کے خاتمہ کے بارے میں بہت سے نظریات پائے جاتے ہیں۔ قدیم یونانی نظریہ 'مستحکم حالت کا نظریہ' (Steady-State Theory) کے مطابق یہ کائنات قدیم ہے اس کا کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ کچھ سائنسدانوں کے مطابق اس کائنات کا وجود ایک عظیم دھماکے سے وجود میں آیا ہے اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس کی عمر لگ بھگ 14 ارب سال ہے اور یہ نظریہ عام ہوگیا ہے کہ ایسے عظیم واقعہ سے ہوا ہے جس کو بگ بینگ (Big Bang) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ نے قدیم یونانی نظریہ 'مستحکم حالت کا نظریہ' (Steady-State Theory) کو غلط قرار دیا ہے اور یہ اس بات کی بھی ترجمانی کرتا ہے کہ جس طرح اس کائنات کا وجود ایک عظیم دھماکہ سے ہوا ہے اسی طرح اس کائنات کا خاتمہ بھی ممکن ہے ایک وقت ایسا بھی ہوگا جب یہ تمام تر مادّۂ کائنات آپس میں ٹکرانے کے سبب چور چور ہوجائیں گے۔

جب کائنات کا وجود عمل میں آیا تو بہت سارے واقعات بہت تیزی کے ساتھ عمل میں آئے اس کی ابتداء مختلف اقسام کے ذیلی ایٹمی ذرات (Subatomic Particles) سے ہوئی جس میں الیکٹران، پازیٹران، نیوٹریناس اور اینٹی نیوٹریناس کے ساتھ ساتھ شعاع ریزی (Radiation) کرنے والے فوٹان بھی موجود تھے اس وقت اس کا درجۂ حرارت تقریباً ایک کھرب سینٹی گریڈ (ایک کھرب 80 ارب فارن ہائیٹ) تھا اور اس کی کثافت (Density) پانی کی نسبت 4 ارب گنا زیادہ رہی ہوگی۔ ایک سیکنڈ کے بعد بڑے بڑے بدلاؤ ہوئے اور اس کا درجۂ حرارت گر کر 10 ارب سینٹی گریڈ (18 ارب فارن ہائیٹ) پر آگیا۔ اس عمل کے ساتھ ساتھ مادّہ اس قدر پھیلا کہ اس کی کثافت تیزی سے گرتے ہوئے پانی کی نسبت 4 لاکھ گنا زیادہ ہوگئی، اس کے بعد پروٹان اور نیوٹران جیسے بھاری بھرکم عناصر کا وجود عمل میں آیا۔

14 سیکنڈ بعد درجۂ حرارت 3 ارب سینٹی گریڈ (5 ارب 40 کروڑ فارن ہائیٹ) تک چلا گیا اور اس دوران متضاد چارج شدہ پازیٹران اور الیکٹران آپس میں ایک دوسرے کو فنا کرنے لگے جس کے سبب توانائی خارج ہوئی اور 2 پروٹان اور 2 نیوٹران والے ہیلیئم کے مرکزے (Nuclei) بننے لگے۔

3 منٹ بعد کائنات کا درجۂ حرارت 90 کروڑ سینٹی گریڈ (ایک ارب 62 کروڑ فارن ہائیٹ) رہ گیا۔ اس وقت اس درجۂ حرارت کی وجہ سے ڈیوٹیریم (Deuterium) کا مرکزہ جو ایک پروٹان اور ایک نیوٹران رکھتا تھا وجود میں آیا۔ 30 منٹ کے بعد درجۂ حرارت 30 کروڑ سینٹی گریڈ (5 کروڑ 40 لاکھ فارن ہائیٹ) تک آگیا اس مرحلے کے دوران الیکٹران اور پروٹان کی ایک بڑی تعداد اپنے متضاد ذرّات (Antiparticles) پازیٹران اور اینٹی پروٹان کی وجہ سے ختم ہوچکی تھی اور باقی پروٹان اور الیکٹران ہائیڈروجن اور ہیلیئم کے مرکزے کے بننے کے عمل میں استعمال ہوچکے تھے۔ یہ سلسلہ یوں ہی لگاتار چلتا رہا اور لگ بھگ ایک لاکھ سال کی مدت کے بعد برق پارے (Ions) اور الیکٹران نے مل کر ایٹم کی تشکیل کی۔ یہ تمام تر افعال ستاروں اور کہکشاؤں کی تشکیل میں آنے سے پہلے تقریباً ایک ارب سال پہلے وقوع پزیر ہوئے۔ اسی طرح جس طرح یہ پھیل رہی ہے اس کا خاتمہ بھی ایک ممکنہ صورت 'بگ کرنچ' (Big Crunch) کے سبب ہوگا جس میں ایک عظیم دھماکا ہوگا اور مسلسل پھیل رہی یہ کائنات سکڑنا شروع کردے گی یہ عمل بالکل 'بگ بینگ' کے عمل کا الٹا ہوگا جس کے نتیجے میں کائنات کا خاتمہ ہوجائے گا۔

اورعصر حاضر کے سائنسدانوں نے'بوسون' کی دریافت کر کے ایک نئی کامیابی حاصل کی ہے۔اس کی دریافت 'سوئٹزرلینڈ' میں واقع تجربہ گاہ لارج ہاڈرون کولائڈر (Large Hadron Collider) میں4 جولائی 2012 بدھ کے دن ہوئی۔سائنسدانوں کے مطابق انھوں نے ایسے ذرّے کو دیکھنے میں کامیابی حاصل کی جوصرف ہمارے کرۂ ارض پر ہی نہیں بلکہ تمام کائنات میں زندگی کی موجودگی کی بنیاد اور اس کا سبب ہے اور کائنات کی سب رنگا رنگی اس کی مرہونِ منت ہے۔دورِ حاضر کی سائنس کے مطابق یہی ذرات ہیں جو کائنات کے مکان کی اصل اینٹیں ہیں اور مادے کو فنا نہیں ہے وہ صرف اپنی شکل بدلتا ہے،اور ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جس میں اس کو مزید تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے اسی انتہا کو جدید سائنسداں بوسون (Boson) کہتے ہیں۔بوسون کوصرف بوسون نہیں کہا جاتا ہے بلکہ اس کو ماہرینِ طبیعات 'ہگز بوسون' (Higgs Boson) کہتے ہیں۔دراصل Peter Higgs نے ایک تھیوری پیش کی تھی جس کے مطابق اگر بوسون کا پتا چل جائے اور وہ نظر آجائے تو تخلیقِ کائنات اور تخلیقِ آدم کے وجود میں آنے کا راز آشکار ہوسکتا ہے جو ابتدا سے لے کر اب تک راز رہا ہے۔اس نظریہ کی بنیاد وہ نظریہ 'اسٹینڈرڈ ماڈل' کہلاتا ہے جو 1924 میں سائنسدانوں نے پیش کیا۔اس نظریہ کے مطابق کائنات ایک بندھے، ٹکے اور مضبوط عمل کے ذریعہ وجود میں آئی ہے۔یہ جو پھول کھلتے ہیں،مرجھا جاتے ہیں،انسان اور دوسرے ذی حیات پیدا ہوتے ہیں مرجاتے ہیں ایک 'اسٹینڈرڈ ماڈل' کے مطابق ہے۔یہ عمل خود بخود اسی طرح رواں دواں مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اس میں تبدیلی اس وقت رونما ہوتی ہے جب کائنات کا کوئی کردار مثلاً انسان یا کوئی اور ذی حیات اس طے شدہ سسٹم کے برعکس کام کرتا ہے۔بوسون وہ ذرہ ہے جو تمام کائنات کی اساس ہے اگر اس کو کسی بھی طرح ریگولیٹ کردیا جائے تو انتشار کا یہ سلسلہ روکا جاسکتا ہے۔ بوسون مادے کی گویا اصل ماں ہے جس کے سبب سارے مادی ذرات وجود میں آئے ہیں اگر اس کا وجود نہ ہو مادے کی تمام تر اقسام روشنی کی رفتار سے گردش کرنے لگ جائیں گی کیوں کہ مادہ نہیں ہوگا تو زندگی بھی نہیں ہوگی یعنی بوسون ہی مادی وجود کی حیات و موت کا سبب ہے۔برج نرائن چکبست کا شعر کائنات کے وجود میں آنے کے تمام تر نظریات کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

اسپیس ریسرچ میں مصروف ناسا جیسی ایجنسیوں نے اپنے تجربات اور دوربینوں کے مشاہدات کے ذریعے اس بات کی ترجمانی کی ہے کہ ہماری کائنات میں صرف ہمارا ہی سورج اور نظامِ شمسی نہیں ہے اس کے علاوہ بھی کائنات میں اربوں کہکشاؤں اور آفتابوں کا وجود ہے۔نظامِ شمسی میں آفتاب کے ساتھ ساتھ سیارے موجود ہیں اور ان سیاروں کے اردگرد چاند گردش کر رہے ہیں جن کا حقیقی اندازہ لگانا بھی دشوار ہے لیکن اگر ہمارے نظامِ شمسی میں اگر سیاروں کے 63 چاند دریافت ہو چکے ہیں تو ہماری کائنات میں موجود ان لاکھوں ستاروں کے نظام میں کروڑوں چاندوں کی موجودگی سے ہرگز گریز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ایک شعر میں اس طرف سوچنے کی دعوت ملتی ہے۔

یوں سمجھیے بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

اس شعر کے پہلے مصرعے 'یوں سمجھیے بیچ سے خالی کیے ہوئے' پر غور و فکر کریں تو وہ ہم کو ایک نئی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس شعر میں 'بیچ سے خالی' ہونے کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے 'بلیک ہول' (Black Hole) مراد لی جاسکتی ہے۔'بلیک ہول' یونیورس کا ایک ایسا حصہ ہوتا ہے جس میں کمیت (Mass) اور قوتِ کشش (Gravitational force) بہت زیادہ موجود ہوتی ہے وہ اپنے پاس سے گزرنے والی ہر چیز کو اندر کھینچ لیتا ہے یہاں تک کہ روشنی کی شعاع بھی اس کے پاس سے گزرنے پر اس کے اندر سما جاتی ہے۔

سائنسدانوں کے مطابق ہمارا سورج اور کائنات میں موجود لاتعداد ستاروں میں مسلسل ایک 'نیوکلیئر فیوزن' عمل پزیر ہوتا رہتا ہے اس دوران ہائیڈروجن اپنا وجود بدل کر ہیلیم میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ایسے عمل کے دوران انتہائی حرارت اور توانائی خارج ہوتی ہے۔پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ہائیڈروجن پوری طرح ختم ہونے کی حد پر آجاتی ہے۔ اس وقت ستارے کی حرارت اور کمیت بڑھنے لگتی ہے اور اس کی قوتِ کشش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔سائنسدانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہائیڈروجن کے ختم ہونے پر بھی 'نیوکلیئر فیوزن' کا عمل نہیں رکتا ہے بلکہ اس عمل کے بعد 'ہیلیم مرکزہ' آپس میں جڑ کر 'آکسیجن' پھر 'آکسیجن مرکزہ' آپس میں جڑ کر 'سلکان' اور 'سلکان مرکزہ' آئرن میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔یہ بھاری عناصر اپنی گریویٹی کی وجہ سے ستارے کے مرکز کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور اس وقت ستارے کا حجم سکڑنے لگتا ہے اور اس کی ڈینسٹی بڑھتی جاتی ہے اور پھر مادہ آئرن میں تبدیل ہوجاتا ہے اگر اس وقت ستارے کی کمیت ایک خاص مقدار سے زیادہ ہوجاتی ہے تو اس میں ایک بڑا دھماکا ہوسکتا ہے جس کو سائنس کی اصطلاح میں 'سپرنووا' (Supernova) کہتے ہیں اس کے بعد ستارہ 'بلیک ہول' میں تبدیل ہوجاتا ہے۔'بلیک ہول' بننے کا یہ عمل اس وقت سے رواں دواں ہے جب سے ہماری کائنات کا وجود عمل میں آیا ہے۔سائنس اس بات کی عکاس ہے کہ ہمارے سورج کی سطح پر بھی 'بلیک ہول' بننے کا یہ عمل جاری وساری ہے اور نہ جانے کتنے ہی ستارے جو حجم میں سورج سے کتنے ہی بڑے ہیں ان میں بھی یہ عمل مسلسل چل رہا ہے جس کے مضر اثرات ہمارے نظامِ شمسی پر بھی بڑھیں گے اس لیے ماہرینِ فلکیات اس عمل پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور نئی تحقیق کی تلاش میں ہیں۔لہٰذا غزل کا یہ شعر سورج میں بننے والے 'بلیک ہول' اور 'سپرنووا' کی ترجمانی اور اس سے پڑنے والے مضر اثرات پر صادق آتا ہے۔

تیرا آسماں ہے پگھل رہا تجھے کیا زمیں یہ پتا نہیں
نئے سائباں کی تلاش کر تجھے سورجوں کی ہوا نہیں

(ہلال نقوی)

ماہرین نے جب دوربین کی مدد سے سورج کی سطح کا مشاہدہ کیا تو حیرت انگیز نتائج سامنے آئے انھوں نے سورج کی سطح پر سیاہ دھبوں کی دریافت کی جس کو 'سورج کے دھبے' (Sunsport) کہا گیا۔دیکھنے میں وہ کالے رنگ کے محسوس ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بہت روشن ہوتے ہیں۔ان کے سیاہ نظر آنے کا سبب دراصل ان کے قریب موجود وہ حصے ہیں جو بہت ہی زیادہ روشن ہیں جن کی مناسبت سے وہ ہم کو سیاہ معلوم ہوتے ہیں۔سورج کے ان دھبوں کا درجۂ حرارت باقی سورج کی سطح کے مقابلے میں 2000 سینٹی گریڈ(3600 فارن ہائیٹ) کم ہوتا ہے۔سورج کے ان دھبوں کی تعداد 11 سال کی مدّت کے درمیان کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے۔غالب کا یہ شعر دیکھیے جو سورج میں بننے والے داغوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں ایک داغ نہاں اور

(غالب)

ہماری کہکشاں کا وجود کروڑوں،اربوں ستاروں، گرد و غبار اور گیسوں پر مشتمل سحابیوں (Nebulae) سے عمل میں آیا ہے ہمارا سورج بھی ایک ستارہ ہے اور یہ بھی دوسرے ستاروں کی طرح گیسوں کے مرکب سے پیدا ہوا ہے۔یہ ستارے نیوکلیائی دھماکوں (Nuclear Fusions) کا اخراج کرتے رہتے ہیں۔ستارے گرد و گیس کے ان بادلوں میں تشکیل ہوئے ہیں جنھیں 'سحابیہ' (Nebula) کہا جاتا ہے۔سحابیے میں موجود گیس اور گرد و غبار کے عناصر باہمی کشش کے سبب آپس میں ٹکرا کر اندھیرے علاقوں

کی تشکیل کرتے ہیں جن کو 'پروٹوسٹار' (Protostar) کہا جاتا ہے۔ جیسے جیسے یہ 'پروٹوسٹار' آپس میں ٹکراتے ہیں ان کی کثافت اور گرمی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایک مدّت کے بعد وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ نیوکلیائی دھماکوں (Nuclear Fusions) کی ابتدا کر سکیں اور اس طرح وہ مکمل طور سے ایک ستارہ بن جاتے ہیں۔ غالب کی غزل کا یہ شعر ستاروں کے بننے کے عمل کی طرف ہمارے ذہن کو لے جاتا ہے۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

(غالب)

سیاروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے لاکھوں ذرات بھی سورج کے چاروں طرف گردش کر رہے ہیں جن کو شہابیے (Meteors) کہتے ہیں۔ یہ بناوٹ میں ریت کے ذرّات جتنی ساخت رکھتے ہیں اس وجہ سے خلا میں ان کی موجودگی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے لیکن جب کوئی شہابیہ ہماری زمین کے قریب آتا ہے تو وہ رگڑ کھا کر گرم ہو جاتا ہے اور جل کر تباہ و برباد ہو جاتا ہے ایسے میں ایک روشنی کی لکیر دیکھائی دیتی ہے جس کو 'شہابِ ثاقب' یا ٹوٹتا ہوا ستارہ کہا جاتا ہے۔ اردو غزل کا یہ شعر 'شہابِ ثاقب' کی ترجمانی پیش کر رہا ہے۔

ٹوٹ کر ایک ستارے نے دیا ہم کو سبق
روشنی راہ میں بن جاؤ زمانے کے لیے

رات کی تاریکی میں جب ہم آسمان کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم کو ستاروں سے منوّر ایک حسین منظر نظر آتا ہے۔ ہم کو ستاروں کے بے شمار جھرمٹ نظر آتے ہیں جن کو ہم اعداد وشمار میں بھی نہیں لا سکتے ہیں۔ ہمارا سورج خود ایک ستارہ ہے اس کا تعلق تقریباً ہزار ملین ستاروں کے جھرمٹ سے ہے۔ اجرامِ فلک کا یہ جھرمٹ کہکشاں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی کہکشاں میں ہماری زمین اور نظامِ شمسی میں شامل سیارے بھی ہیں۔ لیکن سیاروں میں اپنی روشنی نہیں ہوتی ہے یہ سب سورج کی روشنی کے عکس کے پڑنے پر چمکتے ہیں اور رات میں ہم کو ایسا دھوکا ہوتا ہے جیسے یہ سیارے نہ ہو کر خود ستارے ہیں، مثلاً مشتری، زہرہ، مریخ، زحل میں ایسی چمک دکھائی دیتی ہے جس سے ان کا ستارے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سیاروں کے گرد گردش کرتے ہوئے چاند بھی ایک چمک دار منظر پیش کرتے ہیں۔ کچھ ستارے پھیلتے اور سکڑتے ہیں، کچھ ستاروں کی مسلسل روشنی نہیں ہوتی، کچھ ہماری قوتِ بینائی سے اتنی دور ہیں جن کی روشنی ہماری آنکھوں تک نہیں پہنچتی، کچھ ایسے بھی ہیں جن کی روشنی سفر میں ہے، کچھ ہمارے سورج سے ہزار گنا وسیع ہیں لیکن دور ہونے کے سبب چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ غالب بھی اس حقیقت سے آشنا تھے۔ کہ ستارے حقیقت میں ہوتے کچھ اور ہیں اور دکھائی کچھ اور دیتے ہیں اگر چہ یہ بہت بڑے ہیں لیکن دور ہونے کی وجہ سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں مختلف رنگ کے ہوتے ہیں لیکن ایک جیسے رنگ کے نظر آتے ہیں، اس لیے غالب انھیں بازیگر کہتے ہیں کیوں کہ ان کے ظاہر و باطن میں فرق ہوتا ہے۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

(غالب)

سورج کے چکّر کاٹنے والے ہمارے نظامِ شمسی کے سیارے عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون، پلاٹو بھی سورج کے ہی ٹکڑے ہیں جو ایک طاقت ور ہلچل کے سبب ٹوٹ کر سورج سے نکلے ہیں۔ آج کے جدید دور میں ماہرینِ فلکیات نے ان آسمانی ہلچل اور اجرامِ فلک کا مشاہدہ کرنے کے لیے بڑی بڑی دوربینوں (Telescopes) اور سیٹلائٹ ڈیزائن کیے ہیں تا کہ رات دن خلاؤں میں ہونے والی ہلچل پر ہر لمحہ نظر رکھی جا سکے۔ اس کے سبب ہم یہ دریافت کر سکے ہیں کہ ہماری زمین اپنے محور پر گھوم کر سورج کے گرد 365 دن میں اور کچھ گھنٹوں میں چکّر لگاتی ہے جس سے رات اور دن، اور موسموں کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ لیکن ہمارے نظامِ شمسی میں دوسرے سیارے مختلف فاصلوں پر ہونے کے سبب مختلف وقت میں سورج کے گرد چکّر لگاتے ہیں۔ مثلاً 'یورینس کو 84 سال، نیپچون کو 165 سال، پلوٹو کو 248 سالوں' کا عرصہ درکار ہے۔

غالب کو یہ علم تھا کہ ہماری خلاؤں میں اجرامِ فلک میں چیزیں مسلسل گردش کر رہی ہیں۔ اس لیے ہم کو ان آسمانی گردش پر رات، دن نظر رکھنے کی ضرورت ہے، تا کہ ہم ہر لحظہ ہونے والی تبدیلیوں سے آشنا ہو سکیں۔ ان کا یقین تھا کہ خلاؤں میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں گی اس لیے ہم کو اس گردش سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس پر ہمارا زور نہیں چلتا ہے۔ غالب کا یہ شعر اسی بات کو بیان کرتا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب کائنات میں پھیل رہا یہ مادّہ آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جائے گا غزل کا یہ شعر بہت خوبصورتی سے اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

گردش یہ خلاؤں کی بے شک اک روز تھمے گی سب کے لیے
جو چاک پہ گھوما کرتا ہے وہ خاک کا پیکر ٹوٹے گا

(ہلال نقوی)

سورج کی سطح پر ہو رہے مسلسل دھماکوں کی ہلچل اور اس میں بن رہے سراخ کے سبب آج وہ اپنے خاتمہ کی طرف رواں ہے اور اس سے خارج ہونے والا 'ریڈیشن' بھی اپنے اثرات ڈال رہا ہے جس سے نظامِ شمسی پر ہی نہیں خلا میں موجود دوسرے سیاروں پر بھی اہم بدلاؤ ہوئے ہیں غزل کا یہ شعر اس بات کا ترجمان ہے۔

گھبرا کے گر نہ جائے خلا کے مکان سے
سورج کا بوجھ اٹھتا نہیں آسمان سے

(وفا نقوی)

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار خلاؤں کی بلندی اور اس کی وسعت کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا

(غالب)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(علامہ اقبال)

نظر سے دور، مہ و کہکشاں سے آگے ہے
زمینِ اہلِ طلب آسماں سے آگے ہے

(شمیم کرہانی)

مجھے تلاش نئے آسمان کرنے ہیں
یہ ابتدا ہے میری، اختتام تھوڑی ہے

(احمد رئیس)

المختصر اس وسیع کائنات کی باتوں کو ایک مختصر سے مضمون میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ خود آج کی سائنس بھی اس کے بہت سے رازوں سے پردہ نہیں اُٹھا پائی ہے۔ جیسے جیسے فلکیات کے نئے نئے راز آشکار ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ہماری فہم و ادراک اس تک پرواز کرنے لگے گی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اردو غزل کے شاعروں نے اپنے اشعار میں ایسی ایسی باتیں پیش کر دیں ہیں جس پر آج کی سائنسی تحقیقات اور معلومات صادق آتی ہیں۔

کتابیات

(1) کائنات کیسے وجود میں آئی مترجم مولانا محمد زکریا اقبال لاہور پاکستان
(2) تخلیقِ کائنات مترجم عبدالستار لاہور پاکستان

■

E.R. Mohd Adil
Hilal House, H.No: 4/114 Jagjeevan Colony
Naglah Mallah Civil Line
Aligarh - 202002
Mob:9358856606

قاضی عبدالستار کا ایک شاہکار تاریخی افسانہ

مظفر حسین سید

قاضی عبدالستار، اردو ادب کے اہم ترین تاریخی افسانہ و ناول نگار ہیں، جی ہاں! یہ دعویٰ درست ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر چہ اُردو کے کئی اصحاب قلم نے تاریخ کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے کے لیے تاریخی ناول اور تاریخی افسانے رقم کیے ہیں، جن میں عبدالحلیم شرر، پریم چند، عزیز احمد، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر قابل ذکر ہیں، تاہم شرر کے علاوہ مذکورہ ادبا میں سے کسی نے تاریخ کو باقاعدہ اپنا موضوع نہیں بنایا۔ دیگر تمام اہل قلم نے ایک دو تاریخی افسانے ہی لکھے ہیں۔ البتہ عزیز احمد نے باضابطہ دو تاریخی 'ناولچے' تحریر کیے ہیں، جو بلاشبہ اعلیٰ پائے کے ہیں، لیکن انہوں نے تاریخی افسانہ نگاری کو اپنا مستقل شغل نہیں بنایا۔ قاضی عبدالستار اس اعتبار سے سرفہرست ہیں کہ انہوں نے تاریخ کو باقاعدہ اپنا موضوع بنایا۔

تاریخی افسانہ نگاری (اور ناول نگاری) کے لیے شرط اوّل ایک اسلوب جلیل اور طرز نگارش ذی شان ہے، جس سے اگر افسانہ نگار محروم ہے، تو اس کے یہاں تاریخ زندہ و تابندہ حالت میں متشکّل ہو کر سامنے نہیں آسکتی۔ حسن اتفاق کہ ان ہر دو اوصاف سے قاضی صاحب کا قلم، روز اوّل سے مالا مال رہا ہے۔ ان کی غیر تاریخی نگارش تک میں اسلوب والا شان موجود ہے، پھر تاریخی افسانہ نویسی تو اس کی متقاضی بھی ہے۔

اگر چہ قاضی صاحب نے صرف تین عدد خالصتاً تاریخی ناول، بہ عنوان: 'داراشکوہ، صلاح الدین ایوبی اور خالد بن ولید' تخلیق کیے ہیں اور اگر 'غالب' کو سوانحی، ادبی ناول کے ہمرشتہ، تاریخی ناول بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ تعداد چار ہوجاتی ہے، بس، لیکن ان کے یہ تین (یا چار) ناول اردو کے تمام تر تاریخی ادب پر حاوی ہیں۔ جی ہاں، مولوی شرر سے بھی برتر۔ تاہم مزید بحث سے گریز، کیونکہ، سردست اس راقم بے قیر کا موضوع، قاضی صاحب کے ناول نہیں، بلکہ ان کے تاریخی افسانے ہیں۔ قاضی صاحب کے رقم کردہ تاریخی افسانے کم و بیش سات ہیں، جن کے عناوین یوں ہیں: 'آنکھیں، بھولے بسرے، نیا قانون، سات سلام، غادرہ، چنگیز خاں کی موت اور لہو کا عطر'،

اس فہرست میں بلاشبہ 'آنکھیں اور بھولے بسرے' ان کے بہترین تاریخی افسانے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز بر آمد نہ کیا جائے کہ باقی پانچ افسانے، بہتر تاریخی افسانے نہیں ہیں، شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ قاضی صاحب کا ہر تاریخی افسانہ، اپنی جگہ صدف ہے، بلکہ ان تمام افسانوں کو موتیوں کی ست لڑی کہا جائے، یا ہفت رنگ قوس قزح قرار دیا جائے، تو شاید غلط نہ ہوگا۔ (یہاں دیانت ادبی کے تحت، یہ صراحت لازم ہے کہ ان کے کم از کم ایک افسانے 'چنگیز خاں کی موت' میں ایک فاش تاریخی غلطی ہے، جو شاید صحیح مواخذ تک رسائی یا ان کے انتخاب میں کوتاہی کے سبب سرزد ہوگئی، مگر اس کے باوجود اپنے طرز نگارش کی اساس پر 'چنگیز خاں کی موت' بھی ایک عمدہ افسانہ ہے۔)

اگر چہ قاضی صاحب کے تمام، سات تاریخی افسانے اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان کو زیر بحث لایا جائے۔ تاہم تنگی قرطاس کے سبب سردست، اس کوتاہ قلم نے صرف ایک افسانے کو اس گفتگو کے دائرے میں رکھا

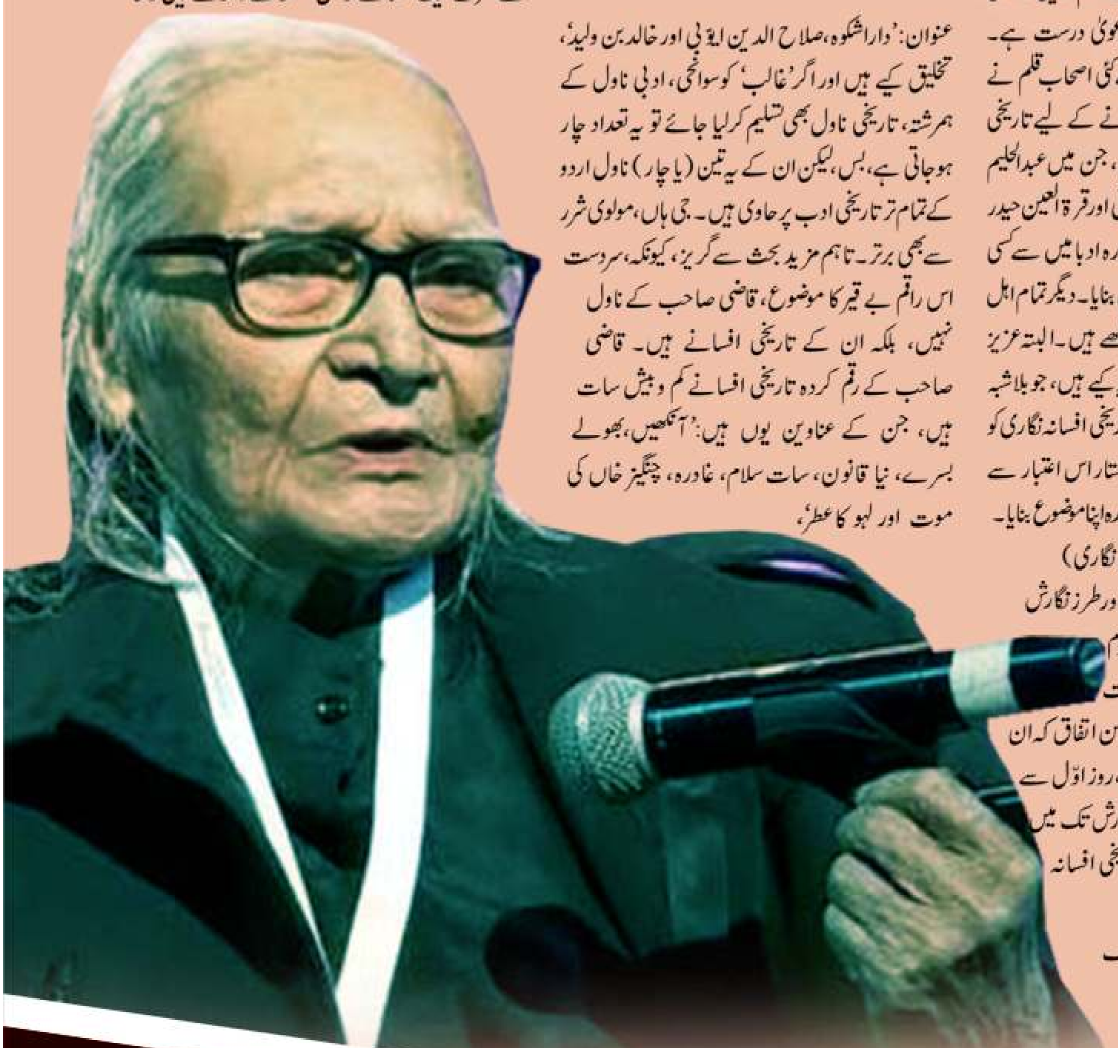

ہے، جس کا عنوان ہے: 'آنکھیں'۔ قدر معیار کے علاوہ اس کا ایک منطقی سبب یہ بھی ہے کہ یہ تاریخ کے ایک اہم دور سے تعلق رکھتا ہے، 'آنکھیں'، کا پس منظر سلطنت مغلیہ کا دور زریں ہے، تاریخ کے ایک اہم عظیم دور، اس الشان سلطنت کے عہد عروج کے پس منظر میں رقم کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تاریخی افسانے کا وصف اوّل یہ ہے کہ اس کا انداز بیان اور طرز نگارش، اپنے عہد کے ماحول سے مکمل تطبیق کا حامل ہے۔ یعنی 'آنکھیں' میں جاہ وجلال، وشان وشکوہ نمایاں ہے، اور یہ سب کچھ مکمل استدلال اور حقیقت نگاری کے ہم رشتہ ہے، نیز افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ کہیں خود نقیب وقت یا راوی کا کردار ادا نہیں کرتا، بلکہ تمام کوائف، پس منظر، پیش منظر، عصری ماحول یا خود کرداروں کی زبانی بیان ہوتے ہیں۔ نہ کہیں وعظ و پند ہے، نہ مرثیہ گوئی، بلکہ سب کچھ خود کار طور پر ہے، جیسے افسانہ نگار نہ تو تاریخ کا درس دے رہا ہے، نہ وقائع نگاری کر رہا ہے، بلکہ وہ اپنے قاری کو تاریخ کے صفحات کی سیر اس انداز سے کراتا ہے کہ قاری، اسی عہد میں سانس لینے لگتا ہے اور اسلوب کا کمال یہ کہ قاری، محض قاری نہیں رہتا، بلکہ ناظر بن جاتا ہے۔ یہی وہ وصف نادر ہے، جو قاضی صاحب کو اُردو کے دوسرے تاریخی افسانہ نگاروں سے ممتاز و ممیز کرتا ہے (یہاں اگر کوئی استثنا ممکن ہے تو عزیز احمد کا، مگر ان کا ذکر بھی تاریخی ناول نگاروں میں ہو تو بہتر ہے)۔ اس قدرے طویل تمہید کے بعد، ان کے منتخب تاریخی افسانے کا جائزہ۔

> 'آنکھیں'، مکالمے اور تمثیل کے طرز پر رقم کیا گیا ہے، سارا واقعہ بلکہ، سانحہ، بہ زبان جہاں گیربیان ہوا ہے، جس کی سامع نور جہاں ہے اور جس کا فرض صرف مصرعہ اٹھانا اور صراحت طلب کرنا ہے۔ اس افسانے کا ایک وصف نادر یہ ہے کہ اس میں ایک جملہ بھی بطو رراوی، مصنف کے ذریعہ سپردقلم نہیں کیا گیا ہے، اس کے بادجود افسانہ کی ترسیل مکمل ہے اور قاری کو کہیں کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

'آنکھیں' تاریخی افسانوں میں قاضی صاحب کا شاہکار علوی ہے۔ یہ افسانہ نہیں، اسلوب و انداز بیان کا ایسا نمونۂ عجیب ہے، جس کی مثال اُردو ادب میں تو خیر موجود ہی نہیں، انگریزی ادب میں بھی اس پائے کا تاریخی افسانہ دستیاب ہونا محال ہی ہے۔ 'آنکھیں' ایک ایسا ہیجان انگیز افسانہ ہے، جو قاری کو کئی شب ہائے دراز کے لیے، بے خواب کرسکتا ہے اور برسوں نہیں تو مہینوں، بے چین و مضطرب رکھ سکتا ہے (جن حضرات کو اس دعوے پر شک ہو اور انھوں نے یہ افسانہ پڑھا نہ ہو، وہ راقم کو حکم فرمائیں، 'افسانہ آنکھیں'، انھیں بہ تعجیل فراہم کردیا جائے گا۔ اغلباً یہ افسانہ، اوّلاً سہ ماہی 'نقوش' میں شائع ہوا تھا)۔

'آنکھیں' کا پس منظر عہد مغلیہ کا دور عروج ہے، اس کا ماخذ 'تزک جہاں گیری' اور اس کا مرکزی کردار شہنشاہ جہاں گیر خود ہے، اس افسانے کا کردار دوئم، ملکہ نور جہاں ہے، مگر اس کی حیثیت ایک صابر، سامع سانحات کی ہے۔ تاہم سب سے اہم، قدآور اور مضبوط کردار نواب صائمہ بیگم کا ہے، اس حد تک دراز کہ خود

جہاں گیر اس کے سامنے کم قد نظر آتا ہے، ایک ایسا کردار، جو قاری کے جذبات کو اوّلاً، مانند آتش بر انگیختہ اور بالآخر نہ صرف (قاری کے) جذبات بلکہ اس کے مکمل وجود کو مانند جلید، یخ کر کے رکھ دیتا ہے۔ باقی تمام کردار ثانوی ہیں، محض افسانے کی نشوونما میں مددگار کے طور پر۔

'آنکھیں'، مکالمے اور تمثیل کے طرز پر رقم کیا گیا ہے، سارا واقعہ بلکہ، سانحہ، بہ زبان جہاں گیر بیان ہوا ہے، جس کی سامع نور جہاں ہے اور جس کا فرض صرف مصرعہ اٹھانا اور صراحت طلب کرنا ہے۔ اس افسانے کا ایک وصف نادر یہ ہے کہ اس میں ایک جملہ بھی بطور راوی، مصنف کے ذریعہ سپرد قلم نہیں کیا گیا ہے، اس کے بادجود افسانہ کی ترسیل مکمل ہے اور قاری کو کہیں کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

مختصراً، 'آنکھیں' کی کہانی یہ ہے کہ شہنشاہ جہاں گیر، اپنے سال جلوس دوم میں ایک عربی الاصل امیر سلطنت کی دختر نیک اختر، صائمہ بیگم پر اوّلین نظارے میں ہی عاشق ہو جاتا ہے، جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے شہنشاہ کی خدمت اقدس میں گلوریوں کا تحفہ پیش کر دیا تھا۔ بقول جہاں گیر، صائمہ بیگم کے حسن و جمال کی مثال، تمام عالم میں موجود نہ تھی اور بالخصوص اس کی آنکھیں، ایسی بے نظیر تھیں کہ ان کا ثانی فرش تا فلک نظر نہ آسکتا تھا اور یہ رائے کسی کم فہم اور کم علم شخص کی نہیں، بلکہ شہنشاہ جہاں گیر کی ہے، جو نہ صرف صاحب علم و قلم بلکہ جمال پرستی اور قدر حسن میں ایک عالم میں یکتا۔ اس کے حرم میں ایک سے سوا دوسری حسینہ موجود ہے، مگر صائمہ بیگم کا حسن و جمال اس کے دل کو بے قرار، ذہن کو منتشر اور راتوں کو بے خواب کر دیتا ہے۔ وہ اس عرب دوشیزہ کے نظر اوّل کے عشق میں ایسا گرفتار ہوتا ہے، کہ اس پر سارے جہان کی دولتیں نثار کرنے کا آرزومند ہو جاتا ہے، مگر دوسری جانب صائمہ بیگم، ایک کوہ گراں اور بحر خاموش کا نام ہے، جسے نہ جاہ وجلال اور شوکت، نہ خدم وحشم کی طمع ہے، نہ ہی مراتب وتحائف کی تمنا، اسے اپنے حسن بے مثال پر غرور ہو نہ ہو، مگر اپنے نسبی تبختر کا ایسا مستحکم احساس ہے کہ وہ کسی قیمت اور کسی شرط پر، اپنے افتخار نجابت کو قربان کرنے کو آمادہ نہیں۔

جب اسے یہ خبر مستند ملتی ہے کہ شہنشاہ وقت اس کے حسن بے مثل پر سو جان، اور ہزار مال سے عاشق ہے، بلکہ مائل بہ جنون ہے، تو وہ ایک ایسا اقدام انقلابی انجام دیتی ہے، جس کی ہمسری شاید دنیا کا کوئی 'فیصلہ' نہ کرسکے۔ اوّلاً وہ شاہی قاصد کے ذریعہ حاضر کردہ خطاب، خلعت اور جشن سالگرہ کی دعوت شرکت کو بیک جنبش زبان نامقبول اور شہنشاہ کے خاموش پیام عشق کو بیک قدم پامال کر دیتی ہے۔ دوئم، حکم شاہی کی تعمیل میں، رسماً حاضر بھی ہوتی ہے، تو اس طرح، جیسے سوالی سائل کے روبرو تو ہو، مگر محض اس کے اظہار طلب کو مسترد کرنے کے لیے اور جب اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ، دراصل جہاں گیر اس کی چشم ہائے بے بدل پر فدا ہے تو وہ

حتمی فیصلہ کرلیتی ہے اور حضور شاہی میں حاضری کا وعدہ، کہ تحائف شاہی کے جواب میں کوئی بے مثل تحفہ تو پیش کرنا ہی تھا۔ بہر کیف حاضری بھی ہوتی ہے اور آخری ملاقات بھی۔ مگر اس طرح کہ وہ شہنشاہ کی تمام تر عنایات خسروانہ کے عوض، اس کے روبرو ایک قدح سرخ پیش کرتی ہے، جس میں اس کی زندہ، تابندہ آنکھیں — جن کی رونق ابھی معدوم نہیں ہوئی — جلوہ گر ہیں، اس کے ہمرشتہ وہ، جو چند جملے شہنشاہ کی گداگری کے جواب میں، اسے بطور خیرات عطا کرتی ہے، وہ کرۂ ارض کی سب سے ذی شان وذی جاہ سلطنت کی بنیادیں متزلزل کرنے اور خود جہاں گیر کو، تازیست، مضطرب وبے قرار رکھنے کے لیے کافی تھے۔ یہ منظر قاضی صاحب کے قلم سے، بہ زبان جہاں گیر، ملاحظہ ہو:

''مابدولت تخت سے اتر پڑے، دستگیری عطا کرنے کے بجائے اس کی نذر قبول کی، پیالہ ہاتھ میں آیا تو جیسے آنکھوں سے بصارت چلی گئی... پیالے میں اس کی دو آنکھیں تڑپ رہی تھیں... اس کی آنکھوں کے دیدے پیالے میں رکھے تھے، شہنشاہ کی پوری عمر میں آداب شہنشاہی کبھی اتنے بھاری نہ معلوم ہوئے، تاہم اس کا نقاب اٹھادیا، آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے، جن سے خون رس رہا تھا، زرد سنگ مرمر سے تراشا ہوا، چہرہ ساکت تھا۔ پائے مبارک میں جیسے کسی نے زنجیریں ڈال دیں... صرف اس قدر ادا ہو سکا، 'نواب صائمہ بیگم بہادر نے یہ کیا کرلیا'... آواز آئی، 'شہنشا ہوں کہ پسند غریبوں کو زیب نہیں دیتی۔ ناچیز کی آنکھیں جہاں پناہ کو پسند آگئیں، نذر میں گزار دی گئیں۔ کل کی گلوریوں کی طرح قبول فرمالیجیے'۔ جب بھی تنہائی باریاب ہوتی ہے، جہاں گیر کی پیٹھ پر اس آواز کے تازیانے برسنے لگتے ہیں۔''

قارئین نے ملاحظہ فرمایا، یہ تو صرف افسانے کے نقطۂ عروج کی عبارت ہے۔ حق یہ ہے کہ پورا افسانہ، اسی حسن ترقیم سے تموّل آمیز ہے۔ اب قاری کو چین نصیب ہو تو کیسے۔ بلاشبہ یہ قاضی صاحب کا بہترین تاریخی افسانہ ہے، جس کا جواب، خود ان کے یہاں بھی دستیاب نہیں۔

یہ تو ایک مثال دلخراش تھی۔ دراصل پورے افسانے میں مصنف کے اسلوب جلیل اور بیان پرشکوہ کے نمونے آویزاں ہیں، سطر در سطر پیوست ہیں۔ چند مثالیں حاضر ہیں:

جہاں گیر کی ذہنی کیفیت، ان جملوں سے عیاں ہے:

''ہندوستان کے تخت پر جلوس کرنا آسان ہے، لیکن سچ بولنا دشوار ہے، دشوار تر''۔

''یہ کیسی شہنشاہی ہے کہ ایک ایک جام کو ترستی ہے''۔

''زندگی کا صرف ایک نام ہے، جوانی، اور سلیم کی جوانی، دولت مغلیہ کے اوّلین صاحب عالم کی جوانی''۔

چند نقاد اور قاضی صاحب کے بے شمار مدّاح، انہیں دوسرا پریم چند اور خالصتاً دیہات کا افسانہ نگار قرار دیں، مگر درحقیقت وہ ایک با کمال، با جمال و با جلال تاریخی افسانہ نگار و ناول نگار ہیں، اس کی سند، ان کا شاہکار افسانہ 'آنکھیں' اور معرکۃ لآرا ناول، 'دارا شکوہ' ہیں۔ ان دونوں نگارشات کی قرأت کے بعد، ان کے ایک اعلیٰ سطح کا 'مورخ افسانہ نگار' ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ بے شک وہ دیہی پس منظر کے ادیب علوی بھی ہیں، مگر ان کا تاریخی شعور و تاریخی پیش کش، سوا، ما سوا ہے۔ ع۔ جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود۔

صائمہ بیگم کے اظہار تکلف کے جواب میں:

''بے شک تحفۂ درویش قیمت سے بلند ہوتا ہے۔ یہ موتی اس نفاست ونزاکت کی داد ہیں، جو ان گلوریوں میں مجسّم کردی گئی''۔

چند بے مثل جملے مزید:

''جب ہم نے چاہا کہ دل کی ویرانی کو شراب سے شاداب کرلیں، تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ شراب نشے سے عاری ہوچکی''۔

''ہر چند کہ رات کی زلف کمر تک بھی نہ پہنچی تھی، (مگر) ہم بے طرح انتظار فرما ہوچکے تھے''۔

''وہ رات، زندگانی کی سب سے بھاری رات تھی۔ (اس رات سے بھی زیادہ بھاری، جس کی صبح اکبر اعظم کی تلوار طلوع ہونے والی تھی، کیونکہ، اس رات کی دلداری کے لیے پچاس ہزار تلواریں سلیم کی رکاب میں تڑپ رہی تھیں اور صاحب عالم کے منہ سے نکلا ہوا، ایک فقرہ، اکبر اعظم کی تلوار کو غلاف کرسکتا تھا، لیکن) اس رات کی غم گساری کے لیے نورالدین محمد جہاں گیر کے پاس ایک دامن وآستیں کے سوا کچھ نہ تھا''۔

جہاں گیر کی زبانی، صائمہ بیگم کے حسن وجمال کا اعتراف:

''صائمہ بیگم سر سے پاؤں تک کرشمۂ الٰہی ہے، لیکن آنکھوں کی بے پناہی، زمین وآسمان کے درمیان، اپنی مثال نہیں رکھتی''۔

عشق کی انتہا، جہاں گیر کے الفاظ میں:

''پوری کائنات کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے والی محبت، اس ایک چھوٹے سے لمحے کی محتاج ہوتی ہے، جب عاشق اپنے سینے کا آخری راز محبوب کے سینے میں منتقل کردیتا ہے''۔

واقعہ بیان کرنے کے بعد نور جہاں سے جہاں گیر کی آخری فرمائش:

''ایک جام اور عطا کردیجیے کہ سماعت جلنے لگی ہے اور بصارت دہکنے لگی ہے''۔

لیجیے صاحب! خواب سے بیدار ہوجایئے کہ افسانہ 'آنکھیں' کا بیان ختم ہوا۔

اس میں شک وشبہ کا شائبہ بھی نہیں کہ افسانہ 'آنکھیں' میں، قاضی صاحب کا فن اپنے اوج کمال پر ہے۔ 'آمد آفتاب، دلیل آفتاب' کے بموجب، مزید کچھ عرض کرنیکی ضرورت نہیں۔

بطور اتمام گفتگو یہ راقم ناچیز ایک جسارت کا مرتکب ہونا چاہتا ہے کہ اگرچہ افسانہ 'آنکھیں' اپنی جگہ بے مثال ہے، تاہم اس سیہ قلم کی رائے یہ ہے کہ اس افسانے کے بیان والا شان میں مصنف، یعنی استاد محترم قاضی عبدالستار صاحب سے قدرے کوتاہی ہوئی ہے، جیسے ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہو۔ اتنے ذی جاہ موضوع اور اس قدر ذی شان بیانیے میں اس سے بھی زیادہ پرشکوہ وپرجلال زبان استعمال ہوسکتی تھی، (بے شک قاضی صاحب اس پر قادر بھی تھے) مگر پتہ نہیں کیوں، ان کا خامہ جابہ جا لرزش کا شکار ہوا ہے، اور کئی مقامات پر ان سے لغزش قلم سرزد ہوئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ اور جمال بیان وجلال عبارت آرائی کی ضرورت تھی۔ کاش انہوں نے اپنی اس تخلیق پر نظر ثانی کرلی ہوتی۔ نگارش کو اور پر اثر بنالیا ہوتا — بہر کیف ان تمام جسارتی اعتراضات کے باوصف، افسانہ 'آنکھیں' ایک شاہکار بلند وبرتر ہے۔

اتمام گفتگو کے طور پر راقم ناسواد یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ خواہ چند نقاد اور قاضی صاحب کے بے شمار مدّاح، انھیں دوسرا پریم چند اور خالصتاً دیہات کا افسانہ نگار قرار دیں، مگر درحقیقت وہ ایک باکمال، باجمال وباجلال تاریخی افسانہ نگار وناول نگار ہیں، اس کی سند، ان کا شاہکار افسانہ 'آنکھیں' اور معرکۃ لآرا ناول، 'دارا شکوہ' ہیں۔ ان دونوں نگارشات کی قرأت کے بعد، ان کے ایک اعلیٰ سطح کا 'مورخ افسانہ نگار' ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ بے شک وہ دیہی پس منظر کے ادیب علوی بھی ہیں، مگر ان کا تاریخی شعور وتاریخی پیش کش، سوا، ماسوا ہے۔ ع۔ جو کچھ کہا تو ترا حسن ہوگیا محدود۔

■

Dr. Muzaffar Husain Syed
29/11, Sir Syed Road
Darya Ganj
New Delhi - 110002
Cell: 9818827853, 9211366940

یادِ رفتگاں

احمد خان

قاضی عبدالستار کا اسلوب

قاضی عبدالستار کسی شخص کا نام نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک عہد کا نام ہے۔ جس میں اودھ کی زوال پذیر جاگیردارنہ تہذیب، ٹوٹتی، بکھرتی اور سسکتی نظر آتی ہے۔ اردو فکشن میں قاضی صاحب کا قد ان کے معاصرین میں بہت بلند ہے۔ ان میں تاریخ اور معاشرت کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ وہ بیک وقت ایک شفیق و خوش بیان استاد، ناقد، محقق، مفکر، مدبر اور صاحبِ اسلوب فکشن نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ قاضی عبدالستار کی ولادت سیتا پور (اودھ) کے ایک گاؤں مچھریٹہ میں 9 فروری 1933 کو ہوئی۔ ان کا تعلق جاگیردار گھرانے سے ہے۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں اپنی آنکھیں کھولیں جب جاگیردارانہ نظام زوال پذیر تھا اور تہذیبی قدریں ٹوٹنے اور بکھرنے لگی تھیں۔ قاضی صاحب کی تخلیقات میں جاگیردارانہ تہذیب، روایتی اقدار، اخلاقی پستی، معاشرتی جرائم، معاشی زوال، تقسیم ہند، فسادات، ہجرت، عصری حسیت اور تاریخ کا ایک نگارخانہ آباد ہے۔ جس میں ادبی، سماجیاتی اور تاریخی نقطۂ نظر سے گراں قدر جواہرات بکھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے جاگیردارانہ تہذیب و ثقافت کی ٹوٹتی بکھرتی قدروں کو جس فہم و ادراک اور دروبست کے ساتھ پیش کیا ہے، یہ انھیں کا حصہ ہے۔ اردو فکشن کا یہ نیّرِ اعظم 29 اکتوبر، 2018 کو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا لیکن اپنے پیچھے افسانوی ادب کا ایک ایسا سرمایہ چھوڑ گیا، جس کی تابانی ہمیشہ قائم رہے گی۔

قاضی عبدالستار اردو ادب میں صاحبِ اسلوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو فکشن میں گرانڈ اسٹائل (اسلوبِ جلیل) قاضی صاحب کا رہینِ منت ہے۔ اردوئے معلّٰی کی روایت اگرچہ اپنی رنگینی، تابناکی اور دلکشی کے لیے مشہور ہے لیکن اس کے اندر شعور و ادراک پر ہیبت اور احساس پر لرزہ طاری کر دینے والا لہجہ اردو کو قاضی عبدالستار کی دین ہے۔ قاضی صاحب کو لفظیات پر دسترس حاصل ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کی جادوگری کا یہ عالم ہے کہ قاری ایک جملے کو بار بار پڑھنے اور داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ قاضی صاحب کے اسلوب کا تجزیہ کرنے سے قبل یہ جاننا بہتر ہوگا کہ اسلوب کیا ہے؟ دراصل فنکار کے اندازِ بیان، طرزِ فکر اور اندازِ تخلیق کو اسلوب کہتے ہیں۔ اسلوب نام ہے منفرد اچھوتے بیان کا۔ اسلوب ادیب اور شاعر کی شخصیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ندرت ایک اچھے اسلوب کی پہچان ہے۔ اسلوب فنکار کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ذات کی ترجمانی، عہد اور معاشرے کی عکاسی اور اپنے احساسات و جذبات کو اچھوتے اور مؤثر اندازِ بیان کے ساتھ قاری تک پہنچاتا ہے۔ پروفیسر منظر عباس نقوی:

"اسلوب ادیب کی شخصیت کا مظہر ہے۔ ابلاغِ خیال کا وسیلہ بھی اور ادب کا اہم تقاضا بھی۔"[1]

اسلوب ایک ایسا آرٹ ہے جو مصنف کی ذات، شخصیت، علمی بصیرت، طرزِ فکر اور اندازِ بیان کا ایک فعال مجموعہ ہے۔ کسی فن پارے میں اس کے خالق کی شناخت اسلوب کا فنی تقاضا ہے۔ اسلوب صاحبِ اسلوب کے ایک ایک لفظ ایک ایک جملے، اس کی فہم و فراست اور اس کی ذاتِ گرامی کا ضامن ہوتا ہے۔ اسلوب کی حیثیت بعض اوقات ایک لباس کی ہوتی ہے جو کبھی تصنع اور مرصع ساز پیکر میں منظرِ عام پر آتا ہے تو کبھی سادگی، شستگی کے

اسلوب ایک ایسا آرٹ ہے جو مصنف کی ذات، شخصیت، علمی بصیرت، طرزِفکراور اندازِ بیان کا ایک فعال مجموعہ ہے۔ کسی فن پارے میں اس کے خالق کی شناخت اسلوب کا فنی تقاضا ہے۔ اسلوب صاحب اسلوب کے ایک ایک لفظ ایک ایک جملے، اس کی فہم و فراست اور اس کی ذاتِ گرامی کا ضامن ہوتاہے۔ اسلوب کی حیثیت بعض اوقات ایک لباس کی ہوتی ہے جو کبھی تصنع اور مرصع ساز پیکر میں منظر عام پر آتا ہے تو کبھی سادگی، شستگی کے ساتھ۔ اگرچہ خیال الفاظ کاجامہ زیب تن کر کے معرض وجود میں آتا ہے لیکن بیان کی ندرت اورتخاطب کی انفرادیت اسے پایۂ عظمت کو پہنچا سکتی ہے۔مؤثر اسلوب صرف مصنف کی ذات کا ہی ترجمان نہیں‌ہوتا بلکہ وہ موضوع کے تقاضے اور کردار کی لیاقت کے حساب سے بھی تشکیل پاتا ہے۔

ساتھ۔ اگرچہ خیال الفاظ کا جامہ زیب تن کر کے معرض وجود میں آتا ہے لیکن بیان کی ندرت اور تخاطب کی انفرادیت اسے پایۂ عظمت کو پہنچا سکتی ہے۔مؤثر اسلوب صرف مصنف کی ذات کا ہی ترجمان نہیں ہوتا بلکہ وہ موضوع کے تقاضے اور کردار کی لیاقت کے حساب سے بھی تشکیل پاتا ہے۔بعض اوقات اسلوب مصنف کے افکار اور واقعات کے بھی تابع ہوتا ہے جہاں قاری مصنف کے اندازِ بیان سے بے نیاز اس کے خیالات کی ندرت اور واقعات کی جاذبیت کے سحر میں رہتا ہے۔اس ضمن میں PercyLubbok کی رائے کچھ یوں ہے:

''ناول نگار جس اسلوب میں چاہے واقعات بیان کرے، قاری کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ناول نگار کی زبان اور اندازِ بیان سلو لائیڈ کے مشابہ ہے جس میں فلمی کہانی کے واقعات محفوظ ہوتے ہیں۔سنیما دیکھتے وقت ہم صرف واقعات میں محو رہتے ہیں۔سلو لائیڈ کا خیال ہمارے ذہن میں نہیں آتا۔''[2]

اسلوب کی تشکیل میں ادیب کی علمی استعداد، ادبی ذوق اور ادب سے متعلق اس کے واضح نقطۂ نظر کا براہِ راست دخل ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلوب کو ادیب کا شخصی ترجمان کہا جاتا ہے۔کسی بھی ادیب کے اسلوب پر اس کے عہد اور ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے۔معاشرے کا ادبی ذوق اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، فکری اور اقتصادی نظام کی پیداوار ہوتا ہے جس کا اثر مصنف کے فکری میلان پر ضرور رہتا ہے۔اسلوب کی تشکیل میں موضوع کا بھی دخل ہوتا ہے۔ہر موضوع ایک الگ اسلوب کا حامل ہوتا ہے۔ادیب موضوع کے اعتبار سے ہی اپنے اندازِ بیان میں دلکشی، رنگینی اور انفرادیت پیدا کرتا ہے۔مثلاً علمی، تاریخی، سماجی، صحافتی اور سائنسی موضوعات پر ایک ہی مصنف کا طرزِ تخاطب ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔قاضی عبدالستار کے مطابق اسلوب کا انتخاب ادیب نہیں موضوع کرتا ہے۔ذیل کے اقتباس میں انھوں نے موضوعات اور اسلوب کے باہمی رشتے، الفاظ کی موزوں ترتیب اور کردار کی زبان پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے:

''میں نے اپنے تمام ناولوں میں ان کے موضوعات کے مطابق اسلوبِ نگارش کی تخلیق کی کوشش کی ہے جس طرح مصور کے پاس رنگ ہوتے ہیں اور وہ ہر موزوں تصویر کی مناسبت سے رنگ کا استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح مصنف کے پاس لفظ ہوتے ہیں جن کے انتخاب اور ترتیب سے وہ اپنے اسلوب کو سجاتا ہے اور سنوارتا ہے۔نہ اکبر، بدھو کی زبان میں گفتگو کرسکتا ہے اور نہ بدھو اکبر کی زبان بول سکتا ہے۔جن حضرات نے ممولا، سینگ، روپا، ٹھاکردوارہ، پہلا اور آخری خط، شب گزیدہ، صلاح الدین ایوبی اور دارا شکوہ کا مطالعہ کیا ہے انھیں غالب کی نثر بھی مختلف معلوم ہوگی۔''[3]

اسلوب کی تشکیل میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ ادیب کس کے لیے لکھ رہا ہے؟ جن کے لیے تخلیق کر رہا ہے ان کا ادبی ذوق کیسا ہے؟ وہ کس طبقے اور کس عہد کے پروردہ ہیں؟ کیونکہ ایک اچھے اسلوب کی پہلی کڑی ترسیل وابلاغ ہے۔مصنف جن کے لیے لکھ رہا ہے، ان تک براہِ راست فن پارے کی ترسیل کا نام ہی فنکاری ہے۔

قاضی عبدالستار اسلوبِ جلیل کے علم بردار ہیں، انھیں لفظیات پر دسترس حاصل ہے۔ وہ لفظوں کے ذریعے کرداروں کے مردہ جسم میں روح پھونکتے ہیں۔شہر کی زبان ہو یا دیہات کی، مقامی زبان ہو یا تہذیب کی، یا کہ علامتی واستعاراتی زبان ہو، قاضی صاحب کو ان پر قدرت حاصل ہے۔قاضی صاحب کے اسلوب میں عظمت وجلال، کشش وجاذبیت، سادگی وشائستگی وقطعیت، انانیت پسندی، خطیبانہ اندازِ بیان اور تخلیقی نثر کا ایک ہرا بھرا گلستاں آباد ہے۔بقول شمس الرحمن فاروقی:

'' قاضی عبدالستار Paradoxes کے بادشاہ ہیں۔ان کا فن ایڈگر ایلن پو کی یاد دلاتا ہے۔ان کے قلم میں گزشتہ عظمتوں اور کھوئے ہوئے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے۔ان کی سب سے بڑی قوت ان کی حاضراتی صلاحیت ہے جو دو جملوں میں کسی مکمل صورتِ حال کو زندہ کر دیتی ہیں۔''[4]

چونکہ اسلوب ادیب کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے لہٰذا قاضی صاحب کی نگارشات میں جو اسلوب ملتا ہے اس پر ان کے افکار ونظریات اور داخلی حس کا گہرا اثر ہے۔قاضی صاحب جاگیردارانہ نظام کے پروردہ ہیں۔ اس نظام سے ان کا فطری وجذباتی لگاؤ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ہمدردی جاگیردار گھرانوں سے واضح طور پر نظر آتی ہے۔ بقول محمد حسن:

''قاضی عبدالستار کو فضا کا جادو جگانے کا فن آتا ہے۔گو ان کی ہمدردیاں واضح طور پر مرتے ہوئے جاگیر دار طبقے کے ساتھ ہیں جس کی وضع داری اور تہذیبی آب و تاب کو وہ فراموش نہیں کر پاتے۔''[5]

اسلوب کی تشکیل میں موضوع اور ماحول کا اہم کردار ہوتا ہے۔قاضی صاحب کے معاشرتی ناولوں کا موضوع دیہات کے طبقۂ امرا کے حالاتِ زندگی ہے۔ان ناولوں میں موضوع اور ماحول کے اعتبار سے ہی قاضی صاحب نے اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ضرورت کے مطابق اگر انھوں نے اردوئے معلی کی زبان سے استفادہ کیا ہے تو اودھی بولی کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔قاضی صاحب نے اپنے ناولوں میں کردار کی زبان کا خصوصی خیال رکھا ہے۔ذیل کے اقتباس میں ایک ہندو کردار کا اندازِ گفتگو ملاحظہ کیجیے:

''جب سوریہ کے سامنے دیا جلتا ہے تو اندھیرا جاتا ہے... مغل سمراٹ کا مہا کوی اپنے آپ کو صاحب عالم کے سرکار میں گونگا پاتا ہے۔من میں لہریں لیتے جوالا ساگر کو ان پوتر چرنوں میں انڈیل دینے کا ساہس (ہمت) نہیں ہوتا۔''[6]

قاضی صاحب کی رنگین بیانی گل افشاں موسموں کی طرح ہے، جہاں خار وگل دونوں اپنے پُرکشش حسن کی طرف قاری کو کھینچتے ہیں اور قاری محویت کے ساتھ اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔قاضی صاحب کے یہاں کرداروں کی اعلیٰ پیکر تراشی اور ایک اچھے اسلوب کے حسن کا بیان ملتا ہے۔قمر رئیس، قاضی صاحب کی علمی وفنی حیثیت اور شب گزیدہ کے متعلق کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''قاضی عبدالستار ناول کو قصے کی حیثیت سے دلچسپ بنانے کا گُر جانتے ہیں۔ان کی تخلیقی قوت ہر کردار

کو ایک روشن انفرادی پیکر بخشتی ہے۔اودھی بولی کے استعمال سے بھی انھوں نے اپنے کرداروں میں ارضیت اور زندگی کی روح پھونکی ہے۔مجموعی طور پر یہ ناول نئے ذہن میں اورنئی فکر کی اچھوتی تخلیق ہے۔''7

قاضی صاحب کوفضا آفرینی اور ماحول سازی سے انتہائی انسیت ہے۔ وہ پلاٹ کے ہر موڑ پر منفرد فضا آفرینی اور منظرکشی کا جو ہر ضرور دکھاتے ہیں۔موصوف کی یہ خوبی ہے کہ ان کے اکثر ناولوں اور افسانوں کا آغاز منظرکشی سے ہوتا ہے۔قاضی صاحب منظر نگاری کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے ذریعے کسی کہانی کو کیسے قائم کیا جاتا ہے۔کہانی کے فن کا یہ ایک بہترین آرٹ ہے جس کے ذریعے کہانی کی فضا اور زمان و مکان پر خصوصی روشنی پڑتی ہے۔ذیل کے اقتباسات میں موصوف کی فنی مہارت اور ندرتِ بیان کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''جامع مسجد... مرحوم تاریخ کی مغرور علامت اپنے گنبدوں کے بوجھ کے نیچے کچلی ہوئی دوزانو بیٹھی دونوں میناروں کے عظیم ہاتھ اٹھائے کبھی نہ ختم ہونے والی دعا مانگ رہی تھی... لیکن یہ کس رحیم خدا سے کس بدنصیب کی کتنی طولانی دعا ہے، جو قبولیت ہی سے نہیں، تکمیل سے بھی محروم ہے۔''8

قاضی عبدالستار کی خوبی یہ ہے کہ وہ کہانی سے کہانی پیدا کرتے ہیں۔وہ کرداروں کے حال کو ماضی سے منسلک کر کے نہ صرف قصے میں تہہ داری لاتے ہیں بلکہ کرداروں کے ماضی سے قارئین کو واقف بھی کراتے ہیں جس سے کہانی میں شاخ در شاخ تہہ داری آجاتی ہے اور پیچیدگی بھی۔قاضی صاحب نے ذیل کے اقتباس میں رونق پور کے نواب میر محمد علی بیگ کی گفتگو کے ذریعے ان کے اجداد کی آن بان، شان وشوکت، اعلیٰ ظرفی اور خوداعتمادی کو منظرِ عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔گھاگھرا ندی کے اُمڈے سیلاب نے جب رونق پور کو اپنے نرغے میں لے لیا تو چودھری گلاب نے نواب سے حویلی چھوڑنے کی استدعا کی لیکن نواب نے ایسا کرنے سے صاف انکار کردیا:

''خدا نہ کرے میں اپنی زندگی میں حویلی کے باہر پاؤں نکالوں اور مرنے والے کے نام پر سیاہی لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے یہیں جہاں حویلی کھڑی ہے یہاں رونق پور کا قلعہ تھا۔اسی گھاگھرا کی موجوں کی طرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں۔ان سے آگ برستی تھی اور قلعہ جل کر خاک ہوگیا تھا تو کیا ہم بھاگ گئے تھے؟ ہم مٹ گئے تھے؟ آج پھر مٹ جائیں گے!!''9

قاضی عبدالستار کو مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ وہ کرداروں کی پیش کش میں ان کی شخصیت، زیبائش اور خارجی و داخلی صورت کو جزئیات نگاری کی مدد سے نمایاں کردیتے ہیں۔قاضی صاحب، جس معاشرے کو موضوع بحث بناتے ہیں یا جس تہذیب کو اپنے قلم نابغہ سے پروان چڑھاتے ہیں اسے ایک نباض کی حیثیت سے جانچتے، پرکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ان کی نفسیاتی حس بہت تیز ہے۔انھوں نے اپنے موضوعات اور کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ جس گہرائی، گیرائی اور فہم وفراست کے ساتھ پیش کیا ہے، یہ انھیں کا حصہ ہے۔ان کی گہری سماجی بصیرت بھی اس عمل میں صاف جھلکتی ہے۔ انھوں نے جاگیرداروں کے زوال کو جس درد و کرب کے ساتھ اور منفرد پیرائے میں بیان کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

قاضی صاحب پیکر تراشی کے فن میں طاق ہیں۔وہ پیکر کے بیان یا مرقع سازی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پیکر تراشی کے ذریعے کردار کی شخصیت، افکار اور قول وعمل کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

مکالمہ، ناول نگار کے اظہارِ خیال کا ایک بہترین آلہ ہے۔مصنف اپنے کرداروں کی زبان سے، اس کا جو جی چاہتا ہے، ادا کراتا ہے۔مکالمے میں موقع ومحل اور کردار کی زبان کا صحیح اور بروقت استعمال، بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔اچھے مکالمے میں چستی، آمد، روانی اور بے ساختگی کا ہونا ضروری ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے ناولوں میں اختصار اور ربط کے ساتھ مکالمہ نگاری کی ہے۔انھوں نے کردار کی زبان کا خاص خیال رکھا ہے اور مرتبے کے لحاظ

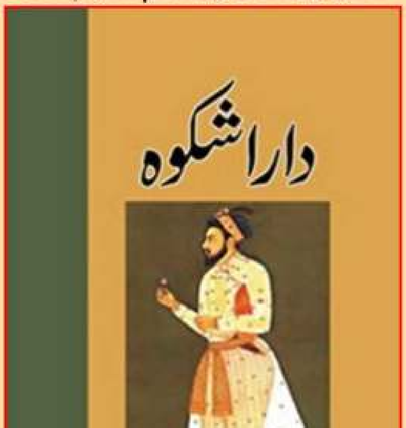

سے ہی کرداروں کو قوتِ گویائی اور حرکت عطا کی۔

قاضی صاحب نے افسانہ 'آنکھیں' میں مکالماتی تکنیک کی ایک بہترین مثال قائم کی ہے۔انھوں نے اس افسانے کو مکالمے کے ذریعے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اس تکنیک کی مثال شاید ہی کہیں اور دستیاب ہو۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس افسانے پر بیک وقت ایک کامیاب ڈرامے کا بھی اطلاق ہوتا ہے۔ذیل کے اقتباس میں مغل بادشاہ جہانگیر اور بیگم نور جہاں کے مابین ہونے والی گفتگو میں مکالمے کی ندرت، ڈرامائی فضا اور طرزِ بیان کی اعلیٰ مثال دیکھی جاسکتی ہے:

''آج کون سی رات ہے بیگم۔''

''شوال کی چودھویں عالی پناہ۔''

''بہت خوب... آج کی رات آسمان سے اس لیے اتاری گئی کہ مابدولت آپ کے سر پر تکمیلِ محبت کا تاج رکھ دیں۔''

''ظلِ الٰہی... کیا روئے زمین پر کوئی عورت ہے جس کے ہاتھ میں خاتم سلیمانی ہو اور سر پر محبت کا تاج؟''10

قاضی صاحب کرداروں کی زبان کے استعمال میں ماہر ہیں۔وہ زبان کے ذریعے کردار کی شخصیت کی خاطر خواہ ترجمانی کرتے ہیں۔کردار ان پڑھ ہو یا عالم، دیہاتی ہو یا شہری، ان کے تلفظ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کی روح میں داخل ہوجاتے ہیں۔ کردار کے افکار و نظریات، نفسیاتی پیچیدگی، حرکات وسکنات اور ان کے طرزِ گفتگو کو کچھ ایسے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ مذکورہ کردار اپنے ظاہری اور باطنی خدوخال کے ساتھ قاری کے دل ودماغ پر چھا جاتا ہے۔اگرچہ ان کے اکثر معاشرتی ناولوں اور افسانوں میں کرداروں کی مقامی اور محاوراتی زبان کا برمحل استعمال ملتا ہے لیکن ان میں 'شب گزیدہ' کا اسلوب سب سے زیادہ دلچسپ، پُرکشش اور برجستہ ہے:

''سرکار کے گھوڑے کی خدمت کرتے کرتے عمر بیت گئی تو کا بڑھوتی ماں اب گھر دوار چھوڑ کے کہوں اور چلے جائی!... بات کا کہی مالک۔ رانڈ لڑکی گھر ماں اپنا رنڈاپا لیے بیٹھی ہے تو اوئی بیٹھے نائیں دیت ہیں۔رستے گلی نکلنا مشکل ہے۔آج دوپہر میہاں (میں) گھر ماں گھس پڑے، کا ہم گریبن (غریب) کے مرجاد (آبرو) ناہیں ہے مالک۔''11

قاضی صاحب کے ناولوں میں جو نسوانی کردار ملتے ہیں ان میں کچھ مسلم جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو کچھ ہندو جاگیردار گھرانے سے اور کچھ کا تعلق محنت کش

طبقے سے ہے۔لیکن قاضی صاحب کا یہ کمال ہے کہ ان کرداروں کی زبان کوانھوں نے ایک دوسرے سے مختلف اور حقیقی لب ولہجہ عطا کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

قاضی صاحب نے اپنے زبان و بیان کے محاوروں میں خصوصاً نسوانی محاوروں کا خوب استعمال کیا ہے۔ انھوں نے محاوروں کے ذریعے معاشرتی نظام کی تہذیبی و فکری اقدار کی ترجمانی کی خاطر خواہ کوشش کی ہے۔ محاوروں کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ ہر محاورہ اپنے اندر ایک تہذیب، ایک فکر اور ایک کلچر سموئے رہتا ہے۔قاضی صاحب نے محاوروں سے اپنی نثر کو دل نشیں بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر افسانو ں اور ناولوں میں محاوروں کا برجستہ استعمال نظر آتا ہے۔

''یہ جو دنیا کے کتے ہیں ان کی زبانیں بس لٹکتی رہتی ہیں۔''اے میاں جوتیوں سے آگے آگے چلتی ہیں۔''12

''ہاں اللہ کی شان! پیر کی جوتی منہ کو آنے لگے۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں بھجوا تیلی۔''13

قاضی عبدالستار ایک خطیبانہ طرزِ تخاطب کے مالک ہیں۔ وہ قاری کو اپنے اندازِ بیان میں اسیر کرنے کا گر جانتے ہیں۔ان کی عالمانہ گفتگو اور سحر انگیز اسلوب، قاری کے ذہن پر چھایا رہتا ہے۔قاضی صاحب بولتے رہتے ہیں اور سامع سنتا رہتا ہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں اس فن کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ان کے کردار بعض اوقات جملے کے جملے بولتے چلے جاتے ہیں جیسے وہ خطاب کر رہے ہوں۔ان کے معاشرتی ناولوں میں قدامت پرست جاگیر دار ایک طرف اپنی تہذیبی اقدار اور روایت کی وکالت کرتا ہے تو دوسری طرف روشن خیال اور جدت پسند جاگیر دار نئی اقدار کے فوائد بیان کرتا نظر آتا ہے۔ دراصل قاضی صاحب نے خطیبانہ لب و لہجے کو اس خوبصورتی سے برتا ہے کہ قاری اس کی کشش اور مٹھاس میں محو ہو جاتا ہے۔

قاضی عبدالستار کے اسلوب میں ان کی انانیت پسندی کی جھلک بھی ملتی ہے۔اسلوب کی یہ انانیت، فکری گہرائی، تخیل کی رفعت، زبان کی بلند آہنگی اور ندرتِ بیان میں مضمر ہوتی ہے۔قاضی صاحب کی اکثر تخلیقات متذکرہ نکات سے آراستہ ہیں۔انھوں نے ہر لحہ فکری میلان کے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ندرتِ بیان کا یہ عالم ہے کہ ہر جملے میں اسلوب کی ایک نئی دنیا بسا دی ہے:

''سامو گڑھ نے یہی نہیں کیا کہ ہندوستان کا تاج دارا سے چھین کر اورنگ زیب کے سر پر رکھ دیا۔ بلکہ مغل تاریخ کے اس زرّیں باب پر مہر لگا دی جسے اکبر کا عہد کہا جاتا ہے۔''14

''کاغذ کا وہ پرزہ جو یوروپ کی تاریخ میں ایک نیا باب کھولنے کے لیے دمشق آیا تھا لاعلم قدموں کے نیچے کچل کر مر گیا جیسے قومیں تاریخ کے قدموں سے کچل کر مر جاتی ہیں۔''15

قاضی صاحب کے اسلوب سے عظیم تصورات کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ بہت ہی اختصار میں بڑی سی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔لفظوں کو موزوں ترتیب دینے میں وہ ماہر ہیں۔ان کے اندازِ بیان کی عظمت اور جلال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔قاضی صاحب کے طرزِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ ان کے ایک ایک لفظ سے نہ صرف رنگینی ٹپکتی ہے بلکہ جاہ وجلال اور بلند آہنگی بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔جب وہ خالد بن ولید اور صلاح الدین ایوبی کو اپنے ناول میں قوتِ گویائی بخشتے ہیں تو ان کا ہر جملہ تصورات کی عظمت سے مزین ہوتا ہے۔

قاضی عبدالستار ایک ایک لفظ کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔انھیں الفاظ کے دروبست اور موزون استعمال کا فن آتا ہے۔قاضی صاحب کی یہ خوبی ہے کہ انھیں دیہات اور شہر دونوں کی زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ان کا اسلوب پل میں رنگ بدلتا ہے۔ وہ جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ کردار اور ماحول کے عین مطابق ہوتی ہے۔وہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ کرداروں کی زبان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار کے یہاں پیچیدہ گوئی، گہرائی اور مشکل پسندی بھی ہے۔انھیں صنعت کاری کے نت نئے خطرات سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔وہ اس کھیل اور مشکل صنعت کو خس و خاشاک سمجھتے ہیں۔لیکن اس کھیل میں کبھی کبھی موضوع یا مرکزی خیال، اسلوب اور صنعت پیمائی کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔جس کے باعث قاری مرکزی تفہیم سے دور لفظیات کی گنجلک دنیا میں الجھ جاتا ہے۔لیکن یہ کیفیت بہت کم جگہوں پر پیدا ہوئی ہے۔عام طور سے ان کا اسلوب قصے کے بہاؤ میں مزید تیزی پیدا کرتا ہے اور قاری کو قصے سے باندھے رکھتا ہے۔قاضی عبدالستار کی یہی جاذبیت قاری کی تشنگی کو ہر لمحہ برقرار رکھتی ہے۔

تخلیقی نثر کسی بھی اسلوب کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔اس کے بغیر اسلوب کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔قاضی عبدالستار جیسے صاحبِ اسلوب، اس فن سے مستثنیٰ ہو سکتے تھے۔انھوں نے اسلوب کی گود میں تخلیقی نثر کے ایسے پر کشش گلشن کو پروان چڑھایا ہے جس کی خوشبو اور ہریالی سے اردو ادب آج بھی معطر اور شاداب ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ بقول قاضی عبدالستار:

''تخلیقی نثر کا کوئی فرقہ نہیں ہوتا ہے، وہ موضوع کے بیج سے درخت کی طرح پھوٹتی ہے اور شاخ پر پھول کی طرح پھولتی ہے۔تخلیقی نثر کسی رنگ کی بھی پابند نہیں ہوتی۔تخلیقی نثر پہاڑوں کی وہ برف ہے جو موضوعات کے سورج کی ہر کرن سے رنگ مانگ لیتی ہے اور صد رنگ ہو جاتی ہے۔''16

دراصل تخلیقی نثر ہی کسی فن پارے کو گلدستۂ ادب بنا سکتی ہے اور اسلوب کو گل و بلبل کے نغمے اور فغاں سے روشناس کرا سکتی ہے۔قاضی صاحب کی کوئی بھی تحریر یا نثر ایسی نہیں، جو تخلیقیت سے معرّیٰ ہو۔انھوں نے اپنے ناولوں میں تخلیقی نثر کی ایک دنیا بسا دی ہے جس میں سادگی و شائستگی بھی ہے اور دلکشی و رنگینی بھی۔

حواشی وحوالے

1۔ اسلوبیاتی مطالعے، منظر عباس نقوی، ص14
2۔ اردو ناول پریم چند کے بعد، ڈاکٹر ہارون ایوب، پبلشرز لکھنؤ، 1978، ص228
3۔ غالب، قاضی عبدالستار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1986، ص8
4۔ آئینۂ ایام (قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے)، ڈاکٹر محمد غیاث الدین، ایجوکیشنل بک ہاؤس دہلی، ص15-14
5۔ جدید اردو ادب، محمد حسن، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1975، ص56
6۔ داراشکوہ، قاضی عبدالستار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1988، ص10
7۔ تلاش وتوازن، ڈاکٹر قمر رئیس، دہلی، 1967، ص64-63
8۔ بلاعنوان، مشمولہ آئینۂ ایام، ڈاکٹر محمد غیاث الدین، ص150
9۔ مالکن، مشمولہ آئینۂ ایام، ڈاکٹر محمد غیاث الدین، ص99
10۔ آنکھیں، مشمولہ آئینۂ ایام، ڈاکٹر محمد غیاث الدین، ص214
11۔ شب گزیدہ، قاضی عبدالستار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1988، ص14
12۔ غالب، قاضی عبدالستار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1986، ص28
13۔ شب گزیدہ، قاضی عبدالستار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1988، ص26
14۔ داراشکوہ، قاضی عبدالستار، ص190
15۔ صلاح الدین ایوبی، قاضی عبدالستار، ص192
16۔ بحوالہ آل احمد سرور (مرتب): اردو فکشن، تخلیقی نثر، قاضی عبدالستار، ص384

■

Dr. Ahamad Khan
Asst. Prof, Depf of Urdu Zakir Husain Delhi College, University of Delhi, Jawaharlal Nehru Marg, New Delhi -110002.
Email: ahmadk71@yahoo.co.in
Ph. 91+9868701491/9540911224

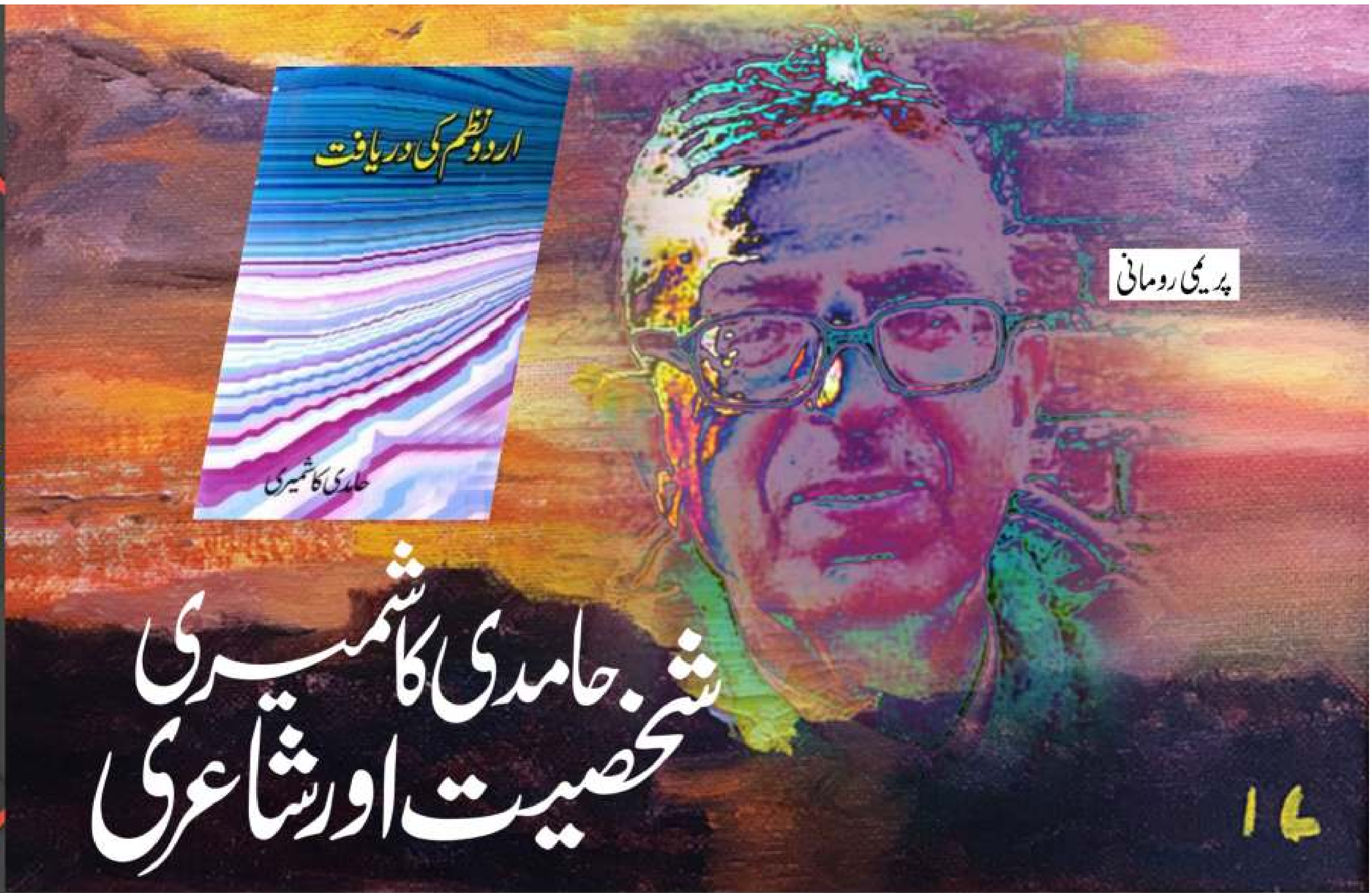

حامدی کاشمیری شخصیت اور شاعری

پریمی رومانی

پچھلے دنوں اردو کے ایک معتبر شاعر، نقاد، محقق، دانشور، اور استاد پروفیسر حامدی کاشمیری مختصر علالت کے بعد اردو شاعری کے کارواں سے بچھڑ گئے۔ وہ ایک محقق نقاد، افسانہ نگار، اور ناول نگار تھے۔ اکتشافی نظریہ پیش کر کے انھوں نے اردو تنقید کو ایک نئی تھیوری سے آشنا کیا۔ حامدی صاحب نے ابتدائی دور میں افسانے بھی لکھے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کے ساتھ ہی شعر و شاعری کا آغاز بھی کیا۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا اولین شعری مجموعہ بہت پہلے عروس تمنا کے نام سے شائع ہوا، جو ان کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد ان کی شاعری میں نمایاں تبدیلی آنے لگی اور انھوں نے اس میدان میں مختلف مراحل طے کر کے اپنی محنت، لگن اور صلاحیت سے ایک انفرادی مقام بنایا نایافت، لاحرف، شاخ زعفران، وادی امکان، خواب رواں، شہر گماں وغیرہ ان کے چند شعری مجموعے ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔

حامدی کاشمیری نے اس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا جب وہ اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ وہ پہلے پہل اپنی مادری زبان کشمیری زبان میں شعر کہتے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد جب انھوں نے کالج کا رخ کیا تو ان کو کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ کالج کی بزم ادب میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اور کامیابیوں کی منزلوں کو سر کرتے رہے۔ اسی دور میں کشمیر کے سربرآوردہ شاعر شہ زور کاشمیری جو خود حضرت سیماب اکبرآبادی کے تلمذ میں رہے تھے اور اب فارغ الاصلاح قرار دیے گئے تھے، سے حامدی صاحب اصلاح سخن لیتے رہے۔ ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

شہ زور، سیماب اکبرآبادی کے حلقہ تلمذ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ فارغ الاصلاح ہو کر اب آزادانہ طور پر مشق سخن کرتے تھے۔ زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے، حامدی نے اپنے سنجیدہ کلام پر شہ زور سے اصلاح لے کر عروض اور زبان کے رموز سیکھے اور اب کالج میگزین کے علاوہ مقامی رسائل میں ان کا کلام شائع ہونے لگا۔ ابتداً ہفت روزہ وکیل سے کی جب ذرا قدم جم گئے تو ماہنامہ شاعر کے لیے لکھنے لگے۔ شاعر کے مدیر نامدار اعجاز صدیقی نے ہمت اور حوصلہ دیا۔"

(جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما از ڈاکٹر برج پریمی ص 96-195)

اس طرح سے ان کی حوصلہ افزائی ہونے لگی اور انھوں نے پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ متواتر لکھتے رہے اور نہ صرف اپنے اردگرد کے حالات و حادثات قلم بند کرتے رہے بلکہ عالمی پیمانے پر رونما ہونے والے حالات و حادثات کو بھی زبان دے کر اپنی شاعری میں بیان کرنے لگے۔ جہاں تک حامدی کاشمیری کی شاعری کا تعلق ہے اس میں روایتی اور جدید شاعری کا سنگم ملتا ہے ان کی آواز جانی پہچانی لگتی ہے، اس آواز میں تاثر، جذبے کی شدت اور اس کے پس پشت چھپے ہوئے ان کے تخلیقی ذہن کی کارفرمائی ہے اور اس طرح سے ان کی شاعرانہ اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری نے اگرچہ اپنی شاعری کا آغاز روایتی شاعری سے کیا وہ ایک زمانے میں ترقی پسند شاعری کے بھی دلدادہ تھے لیکن جب اس تحریک کا رنگ زائل ہونے لگا اور جدیدیت نے اپنے اثرات سے سارے ادب میں انقلابی تبدیلی پیدا کی تو حامدی بھی اس کی رنگ آمیزی کرنے لگے اور بقول مظہر امام، حامدی کا شمار نئی نسل میں نہیں ہوگا لیکن اگر جموں و کشمیر میں نئی نسل وہ نسل ہے جس نے جدید عصری حسیت اور نئے مزاج کو سب سے پہلے قبول کیا تو پھر یہ نئی نسل حامدی کاشمیری سے شروع ہوتی ہے (ماہنامہ تعمیر، جموں و کشمیر اردو ادب نمبر 1983 ص 199) حامدی کاشمیری دراصل دو نسلوں کے درمیاں ایک کڑی ہیں جنھوں نے اپنی فکر کی تازگی اور احساس کی گرمی سے کشمیر کی اردو شاعری میں نیا وقار پیدا کیا اور اس کی آبیاری کی۔

حامدی کاشمیری کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کی شاعری ہر دور میں ترقی کے زینے طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی ان کی شاعری میں قدیم اور جدید شاعری کا سنگم بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ حامدی صاحب کی شاعری کے ابتدائی دور کو ہم ان کی شاعری کی داخلی کیفیات کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کی عمدہ مثال ان کا اولین شعری مجموعہ عروس تمنا ہے۔ اس دور میں وہ روایتی

شاعری سے دامن نہ بچا سکے۔ میر، غالب، اور اقبال کا رنگ ان کے اشعار میں بخوبی پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کے اس دور کی شاعری میں حسن وعشق کا والہانہ پن، غم روزگار کے مسائل، مناظر فطرت کی رنگا رنگی اور روایتی شاعری کے اثرات بخوبی سامنے آتے ہیں۔ نایافت، لاحرف، شاخ زعفران اور وادی امکان حامدی کاشمیری کی شاعری کا دوسرا پڑاؤ ہے، اان کے اس دور کی شاعری میں نئے تجربات اور نئے خیالات کے علاوہ ایک مخصوص فکری رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موضوع کو صحیح معنوں میں برتنے کا فن جانتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے نئے امکانات کی تلاش، پیکر تراشی اور علامتی توسیع پسندی خاص طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ شاعری ان کی ابتدائی شاعری سے مختلف ہے اور ان کے نت نئے رنگوں کا پتہ دیتی ہے، اس دور میں وہ ترقی پسند تحریک سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ حامدی کاشمیری کی غزلوں اور نظموں میں تجربے کی وسعت اور لہجے کا عمق ملتا ہے یہ تجربے نہ صرف موضوع اور اسلوب کے تجربے ہیں بلکہ زبان و بیان اور علامت سازی کے تجربے بھی ہیں۔ ان میں آج کل کے فرد کی محرومی اور درد وکرب کی گداختگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں مشینی دور میں تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول کی صدائے بازگشت محسوس ہوتی ہے۔ انھی خیالات اور تاثرات کو وہ ایک نئے تناظر میں پیش کرنے میں منہمک ہیں اور اس طرح سے وہ اپنے لیے نیا راستہ متعین کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حبیب کیفوی ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

''شاعری اور ادب کے بغیر ان کے لیے سانس لینا محال ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ شاعری اور آرٹ کی جڑیں انسان کی تہذیبی قدروں اور شعوری اور لاشعوری تجربات کی گہرائیوں میں پیوست ہیں اور شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی کے متنوع تجربات کی مصوری ایک ایسے شخصی اور تخلیقی انداز سے کرے کہ فن حسن بن جائے اور جمالیاتی مسرت پیدا کرے۔'' (کشمیر میں اردو از حبیب کیفوی ص 278)

جہاں تک حامدی کاشمیری کی غزلوں کا تعلق ہے، ان میں گہرائی کے ساتھ ساتھ گیرائی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں معنوی تہہ داری، اور کیف وسرور ملتا ہے۔ وہ اظہار کے لیے اپنا خاص شاعرانہ اسلوب خاطر میں لاکر اپنے خیالات و جذبات کی لاشعوری گتھیوں کو بھی شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں انسانی وجود پارہ پارہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مصرعوں کی ہم آہنگی،

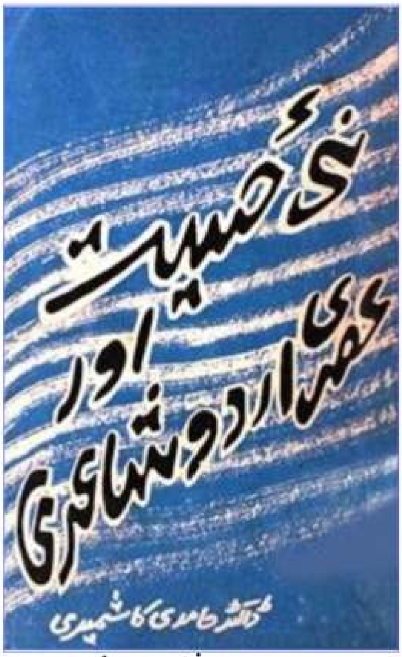

زبان و بیان کا مترنم لہجہ اور غم کی دھیمی آنچ ان کے اس دور کی شاعری کا حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ان کے درج ذیل اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں:

خواب کیا خواب کی حقیقت کیا
نور رکھتا ہے دشت ظلمت کیا
ذرہ ذرہ ریت بکھراتی گئی پیلی ہوا
یوں بھی اس کی زندگی کا کوئی شیرازہ نہ تھا
موج انفاس آتشیں ہی نہیں
برف پگھلے گی یہ یقیں ہی نہیں
دشت ہوسے پہلے بھی آئے تھے ویرانے بہت
سن چکے تھے وادی احمر کے افسانے بہت
تیرے چہرے پہ غم کا سایہ ہے
کتنے لمحوں کے چاند گہنا لے
پانیوں پر کالی آوازیں رقم ہوتی گئیں
روشنی کے جسم ڈوبے تہہ نشین ہوتے گئے
صبح دیکھا پانی ہی پانی شجر کوئی نہیں
رعشہ پیکر تھے شب مہتاب خمیازہ نہ تھا

حامدی کاشمیری خارجی دنیا میں واقع ہونے والے حالات اور واقعات سے متاثر ہیں لیکن وہ ساتھ ہی ساتھ تخلیقی عمل میں خارجی زندگی سے انقطاع پر زور دیتے ہیں۔ جب شعر کہنے کے موڈ میں ہوتے تھے تو اس وقت ان کے دل و دماغ میں ایک مربوط ذہنی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ اکثر وہ اپنے وجود سے بھی بے خبر ہوتے تھے۔ ایک تخلیقی دنیا جو حیرت پرور، پر اثر اور نادیدہ ہوتی ہے۔ اس دنیا کی سیاست اور اس میں پیش آنے والے سحر کارانہ واقعات ان کی نظر میں ہوں تو اشعار فوراً ان کے ذہن میں ڈبکیاں لینے لگتے تھے اور اس کے بعد مناسب و مترنم الفاظ و پیکر کی تلاش و انتخاب اور بھی سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔ خود حامدی کاشمیری کا خیال ہے کہ ہر شعری تجربہ ان کے وجود کی دریافت ہے۔ وہ شعر میں احساس اور فکر کی ہم آہنگی کے قائل تھے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی سطح پر واقع ہونے والے حالات وحادثات ان کے لیے اہمیت ضرور رکھتے ہیں لیکن کائناتی سطح پر انسان کے مشاہدے اور تجربات کو وہ بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ حامدی صاحب کی غزلوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ ان کے یہاں عصری صورت حال کا احساس و ادراک ملتا ہے۔ خدا، خلد، وجود، موت، ذہن کی معدودیت، جنسی وارفتگی سے فریب پسندی، کرب آگہی، شکست آرزو، ان کے اہم تجربات ہیں۔ وہ شعر میں پیکریت کے قائل تھے اور زیادہ سے زیادہ پیکروں کی علامتی اہمیت پر توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے یہاں برف، وادی، پہاڑ، سنگ، ہوا، کمرہ، شجر، بنیادی علامتیں ہیں۔ وہ نئی حسیت کی علامتی پیکر تراشی، پر ساری توجہ مرکوز کرنے کے حق میں تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 1960 کے آس پاس اردو شاعری میں نئی حسیت کا اظہار ہونے لگا میرے ایک استفسار کے جواب میں انہوں نے بتایا:

''شب خون کا اجرا ہونا اور اس میں تخلیقات شائع ہونے کا تاثر پزیری، نئی حسیت اور نئے تجربات پر جرائد میں مدلل بحث اس صدی کے شروع میں رونما ہوئے واقعات وغیرہ ان سب باتوں سے میں متاثر ہوا۔''

(حامدی صاحب کے ساتھ ایک گفتگو)

حامدی صاحب کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور بڑا زرخیز دور تھا یہ دور ان کی شاعری کے سابقہ دو ادوار سے مختلف ہے۔ اس دور کی شاعری میں وہ اپنے تجربات واضح طور پر مختلف علائم اور استعارات سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والوں تک پہنچاتے ہیں اور اپنی مخصوص لفظیات اور پیکروں سے وہ اپنی شاعری میں ایک الگ اور انفرادی رنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے درج ذیل اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں:

خواب وحشت کے سب مظاہر ہیں
آسماں کیا ہے یہ زمیں کیا ہے
کوئی لوٹا نہ ساحلوں کی طرف
کس کو معلوم تہہ نشین کیا ہے
آگ کے سایوں میں کالے شبد ویرانے ہوئے
چاندنی کے جسم تھے سانپوں سے ڈسوائے گئے

آنکھ جھپکانے کی بھی فرصت نہ تھی
خود بہ خود یہ زخم لو دینے لگے
چلچلاتی دھوپ میں وہ بھی پگھل کر رہ گئے
دور تک کوئی شجر سنساں راہوں میں نہ تھا
شدت انکار آنکھوں سے عیاں
ارتعاش زیر لب آمادگی

حامدی کاشمیری کی شاعری میں روایتی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے اور نئی نئی تراکیب اور تشبیہات و استعارات کی چاشنی بھی دیکھنے میں آتی ہے ،جن سے ان کی شاعری میں تازگی اور توانائی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کا احساس خود حامدی صاحب کو بھی تھا۔ وہ نئے الفاظ و پیکر کی تازگی کو محسوس کرتے تھے، روایتی الفاظ کو بھی خاطر میں لانے کے حق میں تھے۔ وہ زبان کی حد بندی کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ ان کے یہاں روایتی الفاظ ساقی، میخانہ ،ساغر کے ساتھ ساتھ ستم گر، تیغ وتبر، رعشۂ خمیازہ، روم و عجم، خوابیدہ، خندہ رو، چشم نم، گرد پوش، زہر خندہ، کشت و خون، خوار و زبون، آشفتہ، موج بلا، سنگ و شجر، صد مہر و مہ، شعلہ نگہ ،شریک نوحہ،سوختہ جاں،وغیرہ جیسی فارسی تراکیب، براہ راست ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں اور روشنی، خواب، دشت، گھر، سایہ، بادل، پانی، شجر، شب، ستارے، سناٹے ،سویرا، تتلی، سورج، بدن، رنگ، برف، پیڑ وغیرہ لفظیات ان کی شاعری میں خاص جگہ بنا چکے ہیں۔ مثلاً:

جاگتے نہیں بھولے بھٹکے خواب
دشت ظلمت میں روشنی کے خواب
لا کے رکھ دو یہاں ہول کا دشت
زہر ٹپکا ہے برگ گلاب
خود سے ملنے کی کوئی صورت نہ تھی
مجھ کو مرنے کی کوئی عجلت نہ تھی
پیڑ پتے جل کے خاکستر ہوئے
دوستو یہ بارش رحمت نہ تھی
رکھ لو یہ حرف سبز بھی تیغ و تبر کے ساتھ
بدلیں گے چہرے بھی وہ ستمگر کہیں کہیں
صبح دیکھا پانی ہی پانی شجر کوئی نہ تھا
رعشہ پیکر تھے شب مہتاب خمیازہ نہ تھا
لب لرزاں سے کچھ بھی کہہ نہ پائے
بہت ڈھونڈا سراغ مہ نہ پائے
چاندنی اوڑھے ہوئے آجائے گی
دیدہ و دل ہے عجب آشفتگی
جگمگانے لگے در و دیوار

دل میں انوار آفریں کیا ہے
خواب وحشت کے سب مظاہر ہیں
آسماں کیا ہے یہ زمیں کیا ہے
بے صدا شب میں پرندوں کا سفر جاری رہا
شہر اندر شہروں کو کشت و خون ہو جائے گا
کب کہا میں نے کوئی امید اب باقی نہیں
ہاں یہ دیکھا خندہ رو آئے تھے چشم نم گئے

حامدی کاشمیری کے یہاں روایتی الفاظ کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ اور تراکیب بھی دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً پانی کی دیوار، پتھریلی خاموشی، گونگی پرچھائیاں ،منجمد پیڑ، زرد دوپہر، آگ کے سائے، کالے شبد،روشنی کے خواب، بخت خموشیاں، وغیرہ جیسے علامتی الفاظ و تراکیب استعمال سے ان کی شاعری میں ایک نیا آہنگ اور موسیقی پیدا ہوگئی ہے۔

جہاں تک حامدی کاشمیری کی نظموں کا تعلق ہے ان میں بھی شدت، تازگی، اور احساسات کی گرمی پائی جاتی ہے۔ ان کی نظموں میں علامتی اور تشبیہاتی نظام۔ الفاظ کو نئے انداز میں پیش کرنے کا ڈھنگ، خاص طور پر متاثر کرتا ہے۔ جہاں ان کی نظموں میں کارثواب، سیاہ کھائی، رعشہ شجر حجر وغیرہ جیسے الفاظ اور تراکیب کثرت سے ملتے ہیں وہاں ان میں نئی نئی تشبیہات و استعارات بھی نظر آتے ہیں۔ پتھریلے چہرے، پانی کی دیوار، پتھر کی تحریر، ریتیلے ہونٹ، بوڑھا دروازہ، وغیرہ جیسی تراکیب ان کی نظموں میں اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ان اصطلاحات کو انھوں نے بروئے کار لاکر اپنی شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ چند نظموں کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے جن میں خیالات کی تازگی، زبان و بیان کا انوکھاپن اور جذبات و احساسات کی فراوانی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے مثلاً

ہر شے آنکھیں ملتی جاگی، گھبرائی سی/ مٹی کی دیوار جھل ہے/ کیسے ٹیڑھے میڑھے جسم کے گہرے گھاؤ چھپائے/ کیاری میں پھولوں پر/ دھول جمی ہے/ سبزے کے سینے کھنڈر/ دروازوں پر جالے/ کوڑا کرکٹ

(نظم: آنگن کا اقتباس)

میں نے ہتھیلی کھولی/ اک بے نام پرندہ/ فر سے اڑا/ زرکار پروں پر/ نام کوئی کندہ تھا/ نور کی پتی پتی ناچی/ حرف/ ہوا کی نیلی لہروں پر/ شعلہ تحریر ہوئے

(نظم: خواب)

حامدی کاشمیری کی نظموں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی محسوس کرتے ہیں، اسی کو الفاظ کے تانے بانے سے مناسب پیکروں کے ذریعے سے خوبصورت

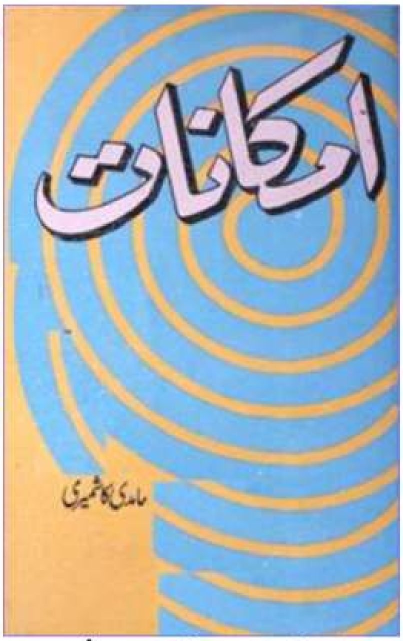

موڑ دے کر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی فنی چابکدستی اور فنکارانہ خلوص سے اپنی نظموں میں بھی اپنی غزلوں کی طرح نئے رنگ بھر دیے ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے مخصوص لب و لہجہ، ڈکشن اور موضوع و ہیئت کے اعتبار سے انفرادی خصوصیت کی حامل ہیں ان میں زبان و بیان کے ساتھ فضا آفرینی، مقام اور ماحول، کا انوکھا پن ،انتخاب اور بیان کا انفرادی رنگ خاص طور پر جھلکتا ہے۔ ان کی نظمیں، آنگن، چنار خواب، دھنک، آنکھیں، اعتراف، نقطے اوراق وغیرہ میں ایک نہ ختم ہونے والے خیالات کا سلسلہ ملتا ہے۔ چنار ایک پرانی نظم ہے اس نظم میں ایک پر اسرار کیفیت ملتی ہے خواب، آنکھیں، سفر جیسی نظموں میں شکست خوردگی کا احساس ہوتا ہے۔ دھنک اور نقطے میں انسانی زندگی کے گوناگوں رنگ ملتے ہیں۔ جن سے کائنات اور اس کے اسرار کا تانا بانا سامنے آجاتا ہے کوہ سبز پر ان کی ایک طویل نظم ہے۔ یہ نظم دراصل بہت ساری نظموں کا سلسلہ ہے جس میں ان کے ذاتی تجربے اور مسائل ملتے ہیں جن کو انھوں نے خارجی رنگ دے کر بیان کیا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے انوکھے تجربات نظر آتے ہیں۔

حامدی کاشمیری سرزمیں کشمیر کے ایک معتبر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین نقاد، محقق اور دانشور تھے۔ اللہ ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

■

Dr. Premi Romani
D-1806, Asawari Nandad
City Sged Road
Pune - 411068 (MS)

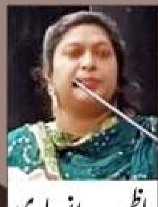

ناظمہ انصاری

ساحر لدھیانوی
ایک عظیم فنکار

ساحر لدھیانوی عظیم فلمی نغمہ نگار اور شاعر تھے۔ ان کی شاعری نے نہ صرف خواص بلکہ عوام کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے حیات و کائنات کے بیشتر مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، انسانیت پسندی اور ہیومنزم پر ان کا خاص زور تھا۔ ساحر لدھیانوی کے فلمی نغمے آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں لیکن فلم کے علاوہ بھی ان کی ایک ادبی شخصیت تھی اور ادبی حلقے میں بھی ساحر کی شاعری بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی لیکن المیہ یہ ہے کہ انھیں ادبی حلقے میں اتنی عظمت نہیں مل سکی جتنی فلمی نغمہ نگاری کے میدان میں ملی۔ ساحر یقینی طور پر ایک مقبول عام شاعر تھے اور ان کے بہت سے اشعار میں آج کی زندگی کی حقیقتیں ہیں، روزمرہ کے مسائل ہیں اس لیے ان کی شاعری انسانی حافظے سے کبھی محو نہیں ہوسکتی۔ ان کی شاعری ہمیشہ دلوں میں نقش رہے گی۔

ساحر لدھیانوی 8 مارچ 1921 کو لدھیانہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خالصہ اسکول سے حاصل کی اور گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا، کالج ہی سے شاعری کا آغاز کیا۔

ساحر لدھیانوی ایک ایسی سدابہار شخصیت کا نام ہے جنھیں ان کے دور میں بھی سراہا گیا آج بھی ان کی چاہت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے اور مستقبل میں بھی ہردلعزیز رہیں گے۔ ساحر لدھیانوی کا مشہور قول ہے کہ ''بمبئی کو میری ضرورت ہے۔'' چونکہ ساحر لدھیانوی ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے تھے۔ اور ترقی پسند شعرا یہ جانتے تھے کہ اپنی بات عوام تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ فلمیں ہیں۔ اسی لیے ساحر نے فلمی دنیا کا رخ کیا۔

لیکن فلمی نغمہ نگاروں سے متعلق کئی سوالات ہماری سماعت سے ٹکراتے رہے ہیں۔ کیا ساحر کی شہرت اور مقبولیت صرف فلمی نغمہ نگاری کی دین ہے؟ کیا ساحر اردو دنیا میں ادبی حیثیت رکھتے ہیں؟ کیا فلمی نغمہ نگار اور ادبی شاعر دو متضاد پیمانے ہیں؟ ان تمام سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی میری ادنیٰ سی کوشش ہے۔ ساحر لدھیانوی کے مطالعہ سے مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شہرت صرف فلمی نغمہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وہ ایسے شاعر تھے جنھوں نے ادبی اعتبار کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے سماج اور فن دونوں کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ انھوں نے ایسے شاہکار نغمے تخلیق کیے جو سماجی شعور کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کی 'شاہکار' نظم۔

مصور! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں!
اب ان رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے
لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے
نمایاں رنگ پیشانی پہ عکس سوز دل کر دے
تبسم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدہ پن بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے
گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاق عاجزی دے دے

شاید یہ ساحر کے نغموں کی ہی دلکشی و نغمگی کی جادو بیانی تھی کہ جس نے امرتا پریتم جیسی فنکارہ کو آپ کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ آپ کی شعری شخصیت کا سحر امرتا پریتم کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ وہ ساحر پر دل و جان سے فریفتہ تھیں۔ حالانکہ ساحر بظاہر کوئی خاص شخصیت کے مالک نہیں تھے۔ دبلے پتلے عام سے شخص تھے۔ رنگ بھی تقریباً سیاہ تھا اور چہرے پر بھی ہلکے ہلکے چیچک کے داغ تھے۔

اس سلسلے میں احمد راہی اپنے مضمون 'ایک دیا اور بجھا' جو 'کلیاتِ ساحر' کے دیباچے میں یوں رقم طراز ہیں:

''وہ اتنا خوبصورت نہیں تھا کہ اسے ٹوٹ کر پیار کیا جاتا۔ بلکہ وہ اپنی شاعری کا تضاد تھا۔''

لیکن امرتا پریتم نے تو آپ کی تخلیقی صلاحیتوں سے، علمی فنکاریوں سے اور ایک عظیم روشن دماغ شخصیت سے پیار کیا تھا۔ ان کی نظر میں تو شاید آپ سے زیادہ وجیہہ اور خوبصورت شخص پوری دنیا میں نہیں تھا۔

امرتا پریتم اپنی آپ بیتی 'رسیدی ٹکٹ' میں لکھتی ہیں:

میں نے جب ساحر سے اپنے پیار کا اظہار کیا۔تب ساحر کہتے ہیں۔

Very Poor Choice اور اپنی نظم معذوری میں بھی یہی بات دہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مجھ میں کیا دیکھا کہ تم الفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آسکتا نہیں

اسی نظم میں غم روزگار کی بھی روداد بیان کرتے ہیں اور اپنے عشق کی شکست قبول کرتے ہوئے اپنی معذوری سمجھاتے ہیں۔

کس طرح تم کو بنا لوں میں شریک زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں
یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دے مجھے
اب میں شمع آرزو کی لو بڑھا سکتا نہیں

ان کی چاہت کی یہی کشمکش ساحر کی نظم 'یکسوئی' میں بھی پائی جاتی ہے۔

کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر
خودکو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟
میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب!
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو

ساحر کے گزر جانے کے بعد ان کے 'گل فشاں' مجموعے کے نئے ایڈیشن کے دیباچے میں امرتا پریتم لکھتی ہیں۔ جو مضمون انھوں نے کورے کاغذ کی داستان نام سے لکھا ہے۔

''میری اور ساحر کی دوستی میں کبھی بھی الفاظ حائل نہیں ہوئے۔ یہ دو خاموشیوں کا ایک حسین رشتہ تھا۔ میں نے اس کے لیے جو نظمیں کہی تھیں۔ اس مجموعۂ کلام کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا۔''

ساحر ایسے واحد فلمی نغمہ نگار ہیں جنھوں نے دو ایسی فلموں کے نغمے لکھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی کہانی خود ساحر کی زندگی کی کہانی تھی۔ ''گرودت کی فلم پیاسا اور یش راج کی کبھی کبھی'' یہ اعزاز اور کسی فلمی نغمہ نگار کو حاصل نہیں ہوا۔ خصوصاً پیاسا کے نغموں کو تو اول درجے کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً

یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

اور اسی طرح آپ کی عشقیہ داستان پر مبنی گیت۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھکو بنایا گیا ہے میرے لیے

ساحر ایک بلندپایہ تخلیق کار تھے، اس میں شاید ہی کسی کو شک ہو۔ ساحر نے اپنے تجربات و حوادث کو شاعری کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کردیا، یہی تجربات و حوادث آج کے عام انسانوں کے ہیں، اسی لیے ساحر کی شاعری عوام میں بے حد مقبول ہے۔

وغیرہ ایسے نغمے ہیں جنھوں نے ساحرلدھیانوی کو شہرت دوام بخشا اور امرتا پریتم جیسی ادب شناس ادیبہ نے آپ کے عشق میں فریفتہ ہوکر نئی طرز زندگی کے لیے ادب شناسی کی نئی راہ ہموار کی۔ حالانکہ اردو کے محققین اور ناقدین نے ان کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا اور انھیں فن شاعری کے اس مقام پر فائز نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔

شاید اس دور کے عظیم الشان شعرا حضرات کے مدّ مقابل ساحر کا چراغ نہ جلا ہو۔ لیکن ساحر اپنے نغموں، گیتوں اور نظموں کی زبان سادگی اور روانی کی وجہ سے عوام میں ہر دل عزیز رہے۔

ساحر فلمی نغمہ نگار تھے کہ یہ نغمہ نگاری ان کے معاش کا ایک ذریعہ تھی، اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ کوئی اور راہ اختیار کرتے۔ ساحر کو اس کا احساس تھا کہ معاش نے ہی انھیں اس سلسلہ سے جوڑا ہے اس لیے اپنی ایک نظم 'فنکار' میں اپنے جذبات اور احساسات کی ترجمانی یوں کرتے ہیں کہ زندگی کا سب سے اہم مسئلہ ذریعۂ معاش ہے کیونکہ یہ نظم ان کے سچّے جذبات واحساسات کی تڑپ اور ان کے ٹوٹے دل کی ترجمانی ہے۔

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
آج دکان پہ نیلام اٹھے گا ان کا
تو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس
آج چاندی کے ترازو میں تلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، میرا احساس
جو تیری ذات سے منسوب تھے ان گیتوں کو
مفلسی جنس بنانے پہ اتر آئی ہے
بھوک تیرے رخ رنگیں کے فسانوں کے عوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے
دیکھ اس عرصہ گہہ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

ساحر کی زندگی ناکام حسرتوں کی ایک داستان ہے۔ آپ کے شعری مجموعے 'آؤ کوئی خواب بنیں' کے صفحۂ اوّل پر آپ کی یہ تحریر 'خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر' آپ کے دکھوں کی غماز ہے۔

میری تقدیر میں جلنا ہے تو جل جاؤں گا
تیرا وعدہ تو نہیں ہوں جو بدل جاؤں گا
سوزبھر دو میرے سینے میں غم الفت کا
میں کوئی موم نہیں ہوں جو پگھل جاؤں گا
درد کہتا ہے یہ گھبرا کہ شب فرقت میں
آہ بن کر ترے پہلو سے نکل جاؤں
مجھ کو سمجھاؤ نہ ساحر کہ میں اک دن خود ہی
ٹھوکریں کھا کے محبت میں سنبھل جاؤں گا

آپ کے گیتوں میں جمالیاتی رعنائیاں بکھری ہوئی ہیں۔ آپ کی نظمیں روزمرہ کی زندگی کے تجربات، حالات و مقامات، کیفیات واحساسات کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ ان کے نغموں کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے کائنات کی خوبصورتی کو اپنے اشعار میں موتی کی لڑی کی طرح پرو دیا ہے۔

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سرمئی اجالا ہے چمپئی اندھیرا ہے
دونوں وقت ملتے ہیں دو دلوں کی صورت سے
آسماں نے خوش ہو کر رنگ سا بکھیرا ہے
ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے
کیوں نہ جذب ہوجائیں اس حسیں نظارے میں
روشنی کا جھرمٹ ہے مستیوں کا گھیرا ہے

آپ کے اشعار ذہن ودل پر شبنم کی طرح برستے ہیں اور قاری وسامع کو سرشار کر جاتے ہیں۔

ساحر ایک بلند پایہ تخلیق کار تھے، اس میں شاید ہی کسی کو شک ہو۔ ساحر نے اپنے تجربات وحوادث کو شاعری کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کردیا، یہی تجربات وحوادث آج کے عام انسانوں کے ہیں، اسی لیے ساحر کی شاعری عوام میں بے حد مقبول ہے۔

■

Prof. Nazima Ansari
Head, Dept of Urdu-Persion
Gujrat Arts & Science College
Ellis Bridge, Ahmedabad-380006
Mob.No.9377881292

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

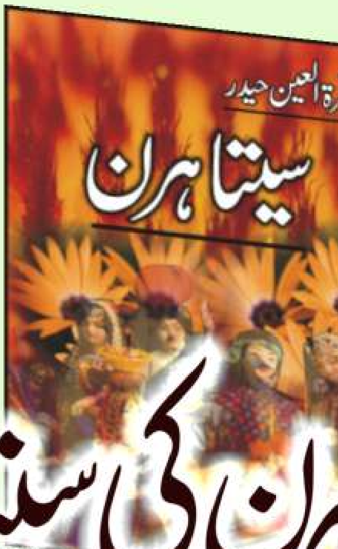

ذکیہ مشہدی

سیتا ہرن کی سیتا

قرۃ العین حیدر اردو کی ایسی مایۂ ناز فکشن نگار ہیں جن پر بہت کچھ لکھا گیا پھر بھی بہت کچھ باقی ہے۔ ان کے فن کے متعلق کچھ کہنا ہو تو ذہن میں یہ خیال نہیں آتا کہ اب رہ کیا گیا ہے لکھنے کے لیے۔ راقم الحروف نے ان کی کئی تخلیقات کو بار بار پڑھا پھر بھی ان کی تازگی، شگفتگی اور معنویت میں کوئی کمی نہیں محسوس ہوئی۔ ان میں 'آگ کا دریا'، 'گردش رنگ چمن'، 'سیتا ہرن' اور 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 'ہاؤسنگ سوسائٹی' اور 'جلاوطن' نہایت دلدوز افسانے ہیں۔ اور یوں تو ان کی سبھی تحریریں تا دیر غور کرتے رہنے اور سر دھننے والی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا تخلیقات میں ان کے ناولٹ 'سیتا ہرن' کا مرکزی کردار سیتا الم ناک ہونے کے ساتھ نہایت پیچیدہ بھی ہے۔ اسے آسانی سے سمجھنا دشوار ہے۔ 'ہاؤسنگ سوسائٹی' کی ثریا زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے مفاہمت پیدا نہ کر پانے کے سبب حالات کے مطابق خود کو تبدیل کر لیتی ہے۔ یہ بھی بڑا تہہ دار اور دلدوز کردار ہے لیکن پیچیدہ نہیں۔ اونچے آدرش لے کر کھڑے ہونے والے بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ہوا کے اُلٹے رُخ نہیں چل پاتے اور ہار مان لیتے ہیں۔

یہاں ثریا کے ذکر کا مطلب صرف یہ ہے کہ بہت سے کردار اپنی تہہ داری اور گہری معنویت کے باوجود ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے تعلق سے اختلاف رائے کی گنجائش کم ہوتی ہے، لیکن سیتا ایک پیچیدہ کردار ہے۔ راقم الحروف کو کثیر المطالعہ ہونے کا دعویٰ نہیں پھر بھی محترمہ حیدر پر کئی مضامین اور کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ سیتا ہرن پر سیر حاصل گفتگو نہیں مل سکی۔ اعجاز الرحمٰن صاحب کی تصنیف 'تانیثیت اور قرۃ العین حیدر کے نسوانی کردار' میں سیتا ہرن پر کچھ تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن وہ بھی نہ صرف تشنہ ہے بلکہ اس میں چند نکات ایسے ہیں جو فاضل مصنف کے ذہن کی اُپج ہیں مثلاً ''سیتا میر چندانی کا دوسرے مذہب کے مرد جمیل سے شادی کرنا جہاں اس کی روشن خیالی کا ثبوت ہے وہیں اپنے آبائی مذہب سے اس کی نفرت کا اشاریہ بھی ہے جس نے عورتوں کو محتاجی و ماتحتی کے سوا کچھ نہیں دیا۔'' (صفحہ 88) کہیں بھی ایسا اشارہ نہیں ہے کہ سیتا کو اپنے آبائی مذہب سے نفرت تھی۔ وہ سرے سے کسی مذہب میں یقین نہیں رکھتی تھی یہ کئی جگہ واضح ہے۔ جمیل سے شادی اس نے بے اختیارانہ محبت کے تحت کی۔ اس بحث کو آگے بڑھانا مقصد نہیں ہے لیکن جمیل سے اسے جو کچھ ملتا ہے وہ بھی محتاجی اور ماتحتی کے علاوہ کچھ نہیں اور جمیل کے برتاؤ نے ہی اسے ذہنی و جذباتی طور پر برباد کیا ہے۔

دوسری جگہ فاضل مصنف نے کہا ہے کہ ''ریفیوجی کیمپوں میں ایک عورت کو ایک لڑکی کی حیثیت سے جو غیر انسانی سلوک جھیلنے پڑے ہیں اس کی وجہ سے اس کے رہے سہے آدرش بھی کھو گئے...'' (صفحہ 87) ناولٹ میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ سیتا کو غیر انسانی سلوک جھیلنے پڑے ہیں۔ بے شک کنبہ لُٹا پٹا پہنچتا ہے لیکن سیتا کی عصمت پر کہیں آنچ نہیں آئی ہے۔ غرضیکہ یہ تجزیہ سطحی اور کچھ حد تک تجزیہ کار کے اپنے تخیل پر مبنی ہے۔

کوئی دس سال یا اس سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرا کہ پٹنہ میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں ایک سمینار منعقد ہوا تھا۔ اس وقت بہار کے معروف ناقد و دانش ور جناب وہاب اشرفی مرحوم حیات و سمینار میں شریک تھے، اور بھی مقتدر ادبی ہستیاں تھیں۔ سیتا ہرن کا بہت ہی سرسری تذکرہ کسی نے کیا تو وہاب اشرفی مرحوم نے فرمایا کہ یہ کردار ایسا بے ہودہ ہے کہ اس ناولٹ کو شریف گھروں میں پڑھا بھی نہیں جانا چاہیے۔ اس وقت پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو نے بھی جو خود بھی نقاد ہیں، اس خیال کی کم و بیش حمایت کی تھی اور سیتا کو ایک آوارہ اور بدکردار لڑکی ٹھہرایا تھا۔

ہمایوں اشرف صاحب نے اپنی تصنیف 'فکشن کی بازیافت' میں محترمہ قرۃ العین کے فن کا بحیثیت مجموعی خاصا سیر حاصل جائزہ لیا ہے لیکن سیتا ہرن پر انھوں نے بھی زیادہ توجہ نہیں دی۔ سیتا کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ سیتا ایک ایسی لڑکی ہے جو جنگل میں جنگل کا قانون اپنا کر زندگی گزار سکتی ہے۔ انسانی قوانین وہاں بے معنی ہیں۔ اس سیتا کو آج کا راون ہر لے گیا۔

(فکشن کی بازیافت: مصنفہ ہمایوں اشرف، ص94)

ایک کرداراساس ناولٹ کے مرکزی کردار پر انھوں نے بس اتنا کہنا کافی سمجھا۔

جنگل میں جنگل کے قانون کے مطابق زندگی گزارنے والی سیتا کو بادی النظر میں گمراہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن باریک بینی سے ناولٹ کا مطالعہ نہ کیا جائے اور سیتا کے تعلق سے مصنفہ کے کلیدی جملوں پر غور نہ کیا جائے تو یہ اس مظلوم لڑکی کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا جس کا واسطہ صرف ایک نہیں کئی راونوں سے پڑتا ہے اور جس کی پشت پناہی کے لیے (اگنی پریکشا کے بعد سہی) کوئی رام موجود نہیں ہے۔

راقم الحروف کو قطعی یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس مضمون کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہوگی یا یہ کہ یہ تجزیہ سقم سے پاک ہوگا لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ جو کچھ کہا جائے گا وہ اور یجنل متن سے اخذ کردہ ہوگا اور ایک انسانی (Humanitarian) نقطۂ نظر کے ساتھ۔

تقسیم کے المیے نے سبھی حساس ذہنوں پر بے پناہ اثر ڈالا۔ یہ المیہ محترمہ حیدر کے یہاں بار بار نمودار ہوتا ہے۔ سیتاہرن کے پس منظر میں بھی تقسیم ہند ہے گرچہ وہ بیانیہ پر حاوی نہیں ہے۔ بے حد اختصار کے ساتھ ناولٹ کے بنیادی پلاٹ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس سے سیتا کے کردار کے تجزیے میں آسانی ہوگی۔ ساتھ ہی جن قارئین کو متن کا علم نہیں ہے وہ بھی اسے سمجھ سکیں گے۔

سیتا ایک خوب صورت سندھی ہندو لڑکی ہے۔ اس کا خاندان تقسیم کے وقت جہاز کے ذریعے کاٹھیاواڑ آگیا تھا پھر گھومتا گھامتا دلّی آکر قیام پذیر ہوا۔ وطن میں یہ اعلیٰ ذات (عامل) کنبہ نہایت خوش حال تھا لیکن اب قرول باغ کے چھوٹے سے مکان میں عسرت زدہ زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ سیتا کو اس کے خوش حال، لاولد ماموں-ممانی امریکہ بلا لیتے ہیں وہاں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہے۔ وہیں اس کی ملاقات ہندوستان کے مشرقی یوپی کے باشندے جمیل سے ہوتی ہے۔ یہ ملاقات محبت اور پھر شادی میں بدل جاتی ہے۔ کچھ دن سب کچھ اچھا رہتا ہے، ایک بچہ، راہل بھی ہو جاتا ہے لیکن جمیل زیادہ تر وقت باہر گزارتا اور بے حد پینے لگتا ہے۔ تنہائی، بوریت اور شدید ڈپریشن میں مبتلا ہوکر سیتا جمیل کے ایک دوست قمرالاسلام چودھری کے قریب آتی اور جنسی طور پر بھی ملوث ہو جاتی ہے۔ پتہ لگنے پر جمیل سیتا کو مار پیٹ کر رات کے وقت گھر سے نکال کر بچہ خود رکھ لیتا ہے۔ قمرالاسلام سیتا کی کوئی مدد نہیں کرتا بلکہ دودھ کی مکھی کی طرح زندگی سے نکال باہر کرتا ہے۔ سیتا ایک بار پھر دہلی واپس لوٹ آتی ہے جہاں اس کے سسرالی عزیز بھی ہیں۔

یہ عزیز اس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے اور جمیل کی حرکت سے شرمندہ ہیں۔ ان عزیزوں کی معرفت اسے پاکستان جانے کا موقع ملتا ہے جو دراصل سیتا کا وطن تھا۔ وہاں وہ عرفان سے ملتی ہے۔ دوبارہ عرفان سے اس کی ملاقات بوجہ سری لنکا، کولمبو میں ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہیں لیکن اسی دوران وہ ایک امریکن ٹورسٹ لزلی مارش کے ساتھ بھی نکل لیتی ہے۔ لزلی مارش کے ساتھ اس کے بہت مختصر لیکن قابلِ اعتراض تعلق کے باوجود عرفان سیتا سے محبت کرتا ہے۔ اور شاید جمیل کے بعد وہ پہلا شخص ہے جس کے ساتھ وقتی دوستی کے ذریعے اپنی اذیت بھلانے کی بجائے اسے سنجیدگی سے پسند کرتی اور اس کے ساتھ باقی زندگی ایک مستحکم رشتے میں بندھنے کی خواہش مند ہے۔ چوں کہ جمیل نے اسے ابھی تک طلاق نہیں دی ہے اس لیے وہ قانونی طور پر کسی سے شادی نہیں کرسکتی۔ پیرس جاکر وہ عرفان کے ساتھ بطور مسٹریس رہنے لگتی ہے اور نہایت گھریلو ہاؤس وائف ثابت ہوتی ہے۔ باپ کے انتقال کی خبر سن کر وہ ہندوستان واپس آجاتی ہے۔ ایک اذیت ناک انتظار کرتی رہتی ہے کہ جمیل اس کی طلاق کی درخواست منظور کرلے۔ طویل عرصہ گزر جاتا ہے۔ عرفان کے خطوط پہلے باقاعدگی سے آتے رہتے ہیں پھر وہ کم ہوتے جاتے ہیں۔ شدید تنہائی اور مایوسی کے عالم میں وہ ایک مشہور، معمر آرٹسٹ پروجیش چودھری کے بازوؤں میں سما جاتی ہے جس سے وہ پہلے سے متعارف تھی۔ تبھی جمیل اسے طلاق نامہ اور بچے سے ملنے کی اجازت بھیجتا ہے۔ یکایک وہ خوش ہو جاتی ہے اور اب عرفان کے ساتھ قانونی طور پر بندھ کر ایک نارمل، پُرسکون زندگی کا خواب دیکھتی ہوئی پیرس روانہ ہو جاتی ہے جہاں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ عرفان تو حال میں ایک نوعمر فرانسیسی حسینہ سے شادی کرکے ہنی مون منانے چلا گیا ہے اور گھر ایک ادھیڑ عمر فرانسیسی کے حوالے کر گیا ہے جو سیتا کے خود کو مادام عرفان کہہ کر متعارف کرانے سے ہکّا بکّا رہ جاتا ہے۔

اس ناولٹ میں محترمہ حیدر کے سارے پسندیدہ موضوعات موجود ہیں۔ تقسیم وطن، تاریخ، ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت، تقسیم کے المناک سماجی، معاشی و انفرادی اثرات۔ ہندو صحیفے، مذہب کی عوام میں گہری پیٹھ۔ بہت کچھ جلاوطن، ہاؤسنگ سوسائٹی، گردشِ رنگ چمن، آگ کا دریا۔ ان سب بے پناہ تخلیقات میں ملتا ہے لیکن کہیں یک رنگی نہیں ہے۔ ان عوامل کی اتنی جہتیں ہیں کہ ان کو ایک ہی جگہ برت لینا ممکن بھی نہیں۔ سیتاہرن، مرکزی کردار، سیتا پر مرتکز ہے اور سیتا کسی باکمال ہاتھوں سے بُنی ٹپسٹیری (Tapestry) کی طرح ان حالات اور عوامل میں پیوست ہے۔ ناول میں کئی کردار ہیں لیکن وہ معاون کردار ہیں، واقعات ہیں جن میں وہ فعال ہیں لیکن سیتا ان کے ساتھ ہوکر بھی یوں نمایاں ہے جیسے گروپ ڈانس میں معاون رقاصوں کے ساتھ ہیروئن۔ یوں یہ ایک کرداراساس ناولٹ ہے۔

سیتا کا متمول خاندان ہندوستان آکر عسرت زدہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ بازآبادکاری کے کارکنان اس کی ماں کے لیے سندھی کڑہت کی ساڑیاں بنانے کا کام مہیا کراتے ہیں۔ شدید احساس کم تری، محرومی، ذلت اور ان کے علاوہ تنگ دستی سے پیدا جسمانی تکلیفوں کا امتزاج سیتا میں گہرا احساس عدم تحفظ (Insecurity) پیدا کرتا ہے۔ اس کے بیش تر اعمال وافعال، بیش تر ردعمل اسی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن کیا تقسیم ہند کے نتائج، جنھیں ہندوستان کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے نے جھیلا، اس طرح کا کردار (Behaviour) پیدا کرسکتے ہیں کہ ایک شریف خاندانی عورت ایک مرد سے دوسرے کی آغوش میں جاتی رہے؟

بادی النظر میں یہ ناممکنات میں نہیں تو عمومی بھی نہیں۔ پھر سیتا کے کردار کا کیا جواز ہے جو اسے آوارہ قرار نہ دے کر ایک عقوبت زدہ روح قرار دے؟ وہ ہماری نفرت کی نہیں بلکہ ہمدردی کی مستحق ہو؟

مشہور ماہر نفسیات رابرٹ ڈبلیو وہائٹ (Robert W. White) نے اپنی کتاب 'دی ابنارمل پرسنالٹی' (The Abnormal Personality) میں بے روزگاری کے تئیں پیدا ہونے والے ردعمل کا ذکر کیا ہے جو مختلف لوگوں میں مختلف ہوسکتا ہے۔ ایک شخص بہادری سے اس کا مقابلہ کرکے کسی بھی کام کو عار نہ سمجھتے ہوئے کہیں سے بھی تھوڑا بہت پیسہ کمانے کی کوشش کرسکتا ہے۔ (تقسیم کے وقت دیکھا گیا تھا کہ اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے سموسے بیچنے یا گھر پر قلفی جما کر گھر گھر پہنچانے کا کام کیا تھا) ایک اور شخص ہاتھ پیر ڈال کر قسمت کو کوستا گھر میں پڑا رہ سکتا ہے، ایک تیسرا شخص ہر وقت غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا رہ سکتا ہے، لیکن رابرٹ وہائٹ نے تو ایک انتہائی نوعیت کا ردعمل بھی درج فہرست کیا ہے۔ دیکھیے یہ بھی ہوسکتا ہے:

1932 میں امریکہ شدید کساد بازاری کا شکار تھا۔ بے روزگاری بہت بڑھ گئی تھی۔ اسی سال صدر کا انتخاب بھی ہوا تھا۔ ایک شخص نے شدید فرسٹریشن کے تحت نومنتخب

صدر پر گولی چلادی۔ وہ تو بچ گئے لیکن ان کے ساتھ کھڑے لوگوں میں سے ایک شخص مارا گیا۔

تو دیکھیے ایک ہی سچویشن کے مختلف النوع نتائج ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہوسکتے ہیں۔ پیمانے (Quantum) کے دو انتہائی سروں پر محیط، سخت محنت اور معمولی ترین کام کر لینے سے لے کر فتنہ فساد کرنے کے انتہائی نکتوں کے درمیان۔

سیتا کے اوپر تقسیم یا اس کے آگے آنے والے حالات کا جو اثر پڑا اس میں اس کی افتادِ طبع کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ایک مرتبہ جب کچھ لوگوں نے اس کی مدد کرنی چاہی تو ''اس وقت یہ محسوس کرکے کہ وہ مفلس اور قابلِ رحم شرنارتھی ہے، اس کا سارا بدن کانپنے لگا تھا۔''

اور: ''یہ اس کے ساتھ کیسی مصیبت تھی کہ دردمندی اور اخلاص کی ایک ایک، ذرا ذرا بات اس کے دل پر لکھی جاتی تھی۔''

دہلی کے ایک متمول اور بارسوخ خاندان سے اس کی شناسائی ہوئی تھی۔ وہاں کے متعلق اس کی سوچ دیکھیے:

''یہ گھر اب بھی بندرگاہ میں ٹھہرا ہوا ایک محفوظ خاموش جہاز تھا جس میں کبھی کبھی آکر وہ یہاں کے سکون سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی تھی.... نیچے بل کھاتی ہوئی طویل خاموش سڑک کے پرے جمنا جی اسی سکون سے بہہ رہی تھیں۔ کیا واقعی اتنا سکون ممکن ہوسکتا ہے؟''

سیتا کے اندر جو رولا مچا ہوا ہے اس کے تحت وہ سوچتی ہے کہ کیا واقعی اتنا سکون ممکن بھی ہوسکتا ہے؟ کہاں ہے اس کے حصے کا سکون؟ یہ احساس کچھ ایسا ہی ہے جیسے ایک غریب انسان امیر مالک یا پڑوسی کے یہاں کی فراوانی دیکھ کر سوچے کہ کیا اتنا کچھ میسر ہونا ممکن ہوسکتا ہے؟

1968 میں مجھے کچھ عرصہ لکھنؤ وائی۔ڈبلیو۔سی۔اے میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ وہاں کی معمر سکریٹری مس راج موہنی رلیا رام نے دوسری جنگ عظیم کے دوران لندن میں متاثرین کے ایک کیمپ میں بطور سماجی کارکن کام کیا تھا۔ اکثر وہ اپنے تجربات بڑے مؤثر اور دلچسپ انداز میں بیان کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک کیمپ میں 'وافر' خوراک آگئی تھی۔ ہر پناہ گزین کے لیے 20 گرام مکھن اور 20 گرام جام کی ننھی ننھی پلاسٹک کی ڈبیاں دستیاب تھیں۔ ایک بچی کے ہاتھ میں ڈبل روٹی کے چار سلائس اور یہ دو ڈبیاں تھمائی گئیں تو اس نے بار بار حیرت سے پوچھا ''یہ سارا کچھ میرے لیے ہے؟ صرف میرے لیے۔'' 20 گرام مکھن اور 20 گرام جام بہ یک وقت مل جانا اس کے لیے اتنا حیران کن تھا کہ اس نے وہ سامان سامنے رکھ کر بے یقینی کے عالم میں کئی بار کہا، اتنا سارا مکھن؟ اتنا سارا جام؟ کہاں سے مل رہا ہے اتنا کچھ؟

کھانے کی میز پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں آب دیدہ ہوگئیں۔

یہی غیر یقینی سیتا کی بھی ہے۔ ''اتنا سکون؟ اتنا سکون کہاں ملتا ہے، کہاں پایا جاتا ہے؟''

''وہ باہر آگئی۔ بے معنی، بے معنی۔ زندگی کس قدر بے معنی تھی۔''

سیتا کی ذہنی کیفیت کے عکاس یہ چند الفاظ اس کی شخصیت کے ریگ زار میں اڑتے بگولوں کے عکاس ہیں۔

ایک معاون خاتون کردار کے متعلق قرۃ العین کہتی ہیں: ''وہ مذہبی یا غیر مذہبی کچھ بھی نہیں تھی، ایک نارمل قسم کی لڑکی تھی۔'' اور پھر وہ سیتا کے متعلق رقم طراز ہیں:

''یہ تو سیتا کے ہی دماغ میں فتور تھا کہ وہ مذہب، سیاست، زندگی، موت۔ دنیا بھر کی ہر چیز کے متعلق سوچ سوچ کر دیوانی ہوئی جاتی تھی۔'' اور اس کے شناسا کنبے کے افراد:

''یہ اس قدر شائستہ، مہذب، نستعلیق، وضع دار اور غیر سیاسی قسم کے لوگ تھے کہ سیتا کو حیرت ہوتی تھی۔ اتنا بڑا ہنگامہ آکر گزر گیا، دنیا تہہ و بالا ہوگئی مگر یہ لوگ اسی سکون سے ان کوٹھیوں میں بیٹھے رہے۔ (وہ خود بے خانماں ہوکر ہندوستان کے مختلف ریفیوجی کیمپوں سے ہوتی ہوئی 1948 میں دلّی آئی تھی۔)

زندگی کا دوسرا طوفان جس نے اس کی شخصیت کو تہہ و بالا کیا وہ اس کی پسند کی شادی کا المناک انجام تھا گرچہ ابتدا میں اس نے کسی بھی ہندوستانی لڑکی کی طرح شوہر کے ساتھ محبت بھری مفاہمت کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ بتاتی ہے:

''جمیل سے ملنے کے بعد میں نے اردو میں دلچسپی لینا شروع کی کیوں کہ وہ لٹریچر کے بہت شائق تھے اور ان سے باتیں کرنے کے لیے میرے لیے لازم تھا کہ میں خود کو ان کا ہم مذاق بناؤں اور وہی باتیں سوچوں اور کروں جو اُن کو پسند تھیں۔''

وہی باتیں سوچنے اور کرنے کا جذبہ جو شوہر کو پسند ہو ایک ہندوستانی عورت کی لچک دار افتادِ طبع کا خاصہ ہے۔ شراب بھی اس نے اس لیے پینی شروع کی تھی کہ شام کو شوہر کا ساتھ دے تاکہ وہ باہر نہ جائے لیکن شوہر شادی کے کچھ عرصہ بعد اسے بُری طرح نظر انداز کرنے لگتا ہے۔ وہ شراب میں غرق رہتا اور عموماً دیر سے گھر لوٹتا۔ کھانا بھی اکثر باہر ہی کھالیتا تھا۔ سیتا جب کھانا لے کر بیٹھی اس کا انتظار کرتی ہوتی، جمیل کا ایک دوست قمر الاسلام چودھری اکثر آکر بیٹھا رہتا۔ تنہائی، بوریت اور اضمحلال کے عالم میں سیتا اس کی طرف مائل ہوتی اور پھر پوری طرح اس کے ساتھ وابستہ ہوجاتی ہے جس میں جنسی تعلق بھی ہے۔ اس رشتے کے بارے میں خود قمر الاسلام جمیل کو بتا دیتا ہے۔ جمیل پہلے تو اس کی ٹھکائی کرتا ہے پھر گھر آکر سیتا کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ بچہ اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔

''جس وقت جمیل نے مجھے گھر سے نکالا میں بہت دیر باہر بارش میں سائڈ واک پر کھڑی رہی۔ اگر اس وقت وہ ایک مرتبہ بھی دروازہ کھول کر صرف اتنا کہہ دیتے کہ سیتا بارش میں مت بھیگو، اندر آجاؤ تو میں واپس جاکر ان کے قدموں سے لپٹ جاتی، پھر عمر بھر ان کو دھوکہ نہ دیتی۔ مگر دروازہ اسی طرح بند رہا۔''

عورت کے لیے ناقابل معافی جرم مرد کے لیے معمولی بات قرار پاتا ہے۔ اگر جمیل ایسا کرتا تو بے شک سیتا کو تکلیف ہوتی، وہ لڑتی جھگڑتی، روٹھتی لیکن گھر سے نکالنے کا تصور نہیں کرسکتی تھی۔ عورت ہوم میکر (Home maker) کہلاتی ہے، گھر اس سے ہوتا ہے لیکن اس کا نہیں ہوتا۔ الّا ان استثنائی صورتوں کے جب وہ اس کے نام ہو۔ کبھی کبھی تو اس صورت میں بھی وہ نکال باہر کی جاتی ہے۔ اکلوتے، ننھے بیٹے کی جدائی اور ایک بار پھر خانماں برباد ہونے کی صورت حال کسی بھی عورت کے ذہن پر کتنے گہرے منفی اثرات ڈال سکتی اور شخصیت کو مسخ کرسکتی ہے، اس کے لیے نفسیات جاننے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک عورت — یا یوں کہیے ایک انسان ہونا کافی ہے۔

تحفظ، طمانیت اور تھوڑی سی خوشی کی تلاش میں بھٹکتی سیتا ایک مرد سے دوسرے مرد کی طرف مائل ہوتی رہتی ہے۔ دو مضبوط بازوؤں کا سہارا اس کے لیے بہت ضروری ہے۔ حالات نے اسے ایک شکست خوردہ عورت میں تبدیل کردیا ہے جس کی عزت نفس پارہ پارہ ہوچکی ہے۔ ذہنی خلفشار انتہا کو پہنچتا ہے تو وہ نہایت عارضی جنسی تعلق بنانے سے نہیں جھجکتی۔ اس مرد اساس دنیا کو دیکھیے۔ قمر الاسلام چودھری سیتا کو ورغلانے کے بعد بیچ منجدھار میں چھوڑ گیا۔ اپنی پسند کی لڑکی سے بیاہ کرنے کے بعد خوش وخرم وکامیاب زندگی گزارنے لگا۔ جمیل بھی سیتا کو طلاق نہ دینے کے باوجود آرام سے کچھ دنوں کے اندر ہی ایک اسپینش لڑکی سے شادی کرلیتا ہے۔ سیتا کو اس کے بچے سے ملنے تک نہیں دیتا کہ وہ ایک آوارہ اور بدکردار ماں ہے جس سے ملنا بچے کے اخلاق پر خراب اثر ڈالے

گا۔ اس مرد کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہتا جو بیوی کو، اپنے بچے کی ماں کو بُری طرح پیٹنے کے بعد آدھی رات کے وقت موسلادھار بارش میں گھر سے نکال باہر کرتا ہے۔ معافی مانگنے یا صفائی میں کچھ کہنے کا موقع تک نہیں دیتا۔ شرافت اور اعلیٰ کردار کے ان دوہرے پیمانوں کے درمیان:

''رات، رات سیتا مہارانی کے بال ہیں۔ رات رگھورائے کا سانولا بدن ہے، کالی کا چہرہ ہے۔ تخلیق سے پہلے کی تاریکی۔ ہم سب ہر وقت اسی تخلیق سے پہلے کی تاریکی میں مقید ہیں اور سمجھتے ہیں بڑا ایوولیوشن (Evolution) ہوگیا۔ سیاہ، سیاہ، سیاہ رات!''

اور:

''قرول باغ میں اکثر وہ راتوں کو جگ کر راہل کے لیے چپکے چپکے رویا کرتی تھی اور صبح صبح آنگن میں لگے ہوئے نلکے پر جا کر آنکھوں پر خوب اچھی طرح چھپکے مارتی تھی تا کہ اس کے باپ کو اس کے الم کا پتہ نہ چلنے پائے۔''

اور جب وہ سری لنکا میں تھی:

''دن بڑا اجاڑ تھا، سارا ماؤنٹ لیونیا، سارا کولمبو۔ ساری دنیا اجاڑ تھی۔ اجاڑ۔ اجاڑ۔ اجاڑ۔''

یہ لامتناہی اذیت ہے جس سے سیتا گزر رہی ہے۔ یہ اذیت اسے لمحاتی سکون، تحفظ اور کچھ راحت کے حصول کے لیے مردوں کی طرف مائل کرتی ہے، شاید اس کے لیے یہی ایک ذریعہ بچا ہے۔ کبھی کبھی ضمیر ڈنک مارتا ہے اور وہ ایک مزید تکلیف میں مبتلا ہوتی ہے وہ ہے پچھتاوا۔ ایک جگہ وہ سوچتی ہے کہ کیوں نہیں زمین پھٹتی کہ میں اس میں سما جاؤں۔ سری لنکا میں ایک جرنلسٹ، جے سوریہ اسے غور سے دیکھتا اور سوچتا ہے— ''...اس بے چاری کے اعصاب ضرورت سے زیادہ کمزور ہیں...'' کافی پیوگی۔ وہ پوچھتا ہے۔ ''نہیں شکریہ۔ سیتا کو اپنے سارے وجود سے اتھاہ نفرت محسوس ہوئی۔ میں یہاں کیوں آئی...''

جمیل سے انتہائی اذیت ناک علیٰحدگی کے بعد سیتا نے کسی کو دل سے پسند کیا تو وہ عرفان تھا۔ اس کے ساتھ وہ ایک مستحکم رشتے اور ایک نارمل سی ہندوستانی زندگی کی متمنی تھی۔ وہی جو اس نے جمیل کے ساتھ چاہی تھی۔ لیکن یہاں بھی حالات اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ چونکہ جمیل نے اسے طلاق نہیں دی ہے اس لیے وہ قانوناً کسی کی بیوی نہیں بن سکتی۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ جمیل دوبارہ شادی کر کے آرام سے ہے۔ اس پر شرعی طور سے کوئی پابندی نہیں۔ بچہ بھی اس کے پاس ہے۔ اس کا گھر ہے۔ گھر جو بیوی اور اولاد سے بنتا ہے، دیواروں سے نہیں۔ سیتا ہی ہے جو 'بے گھر' ہے۔ سراب اس کا پیچھا کرتے ہیں اور وہ سرابوں کا۔

''...لمحۂ۔ حال۔ لمحۂ موجود ہے جو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اسے تھامے رکھو۔ مضبوطی سے تھامے رکھو کیونکہ دن اور رات تیزی سے سرکتے جارہے ہیں۔ وقت عنقریب ختم ہونے والا ہے...''

یہ ٹوٹی بکھری عورت لمحاتی خوشیاں سمیٹتی پھرتی ہے کہ وقت عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ عرفان کے ساتھ دوبارہ زندگی بسر کرنے کی خواہش کے باوجود کہیں دل کے کسی مقفل دروازے کے پیچھے جمیل کو وہ اب بھی بسائے بیٹھی ہے کہ وہ اس کی پہلی محبت اور اس کے بیٹے کا باپ ہے۔ عرفان کسی موقعے پر کہتا ہے کہ ''تم نے کس کریک سے شادی کی تھی'' تو سیتا کو بُرا لگتا ہے۔ ''وہ بالکل کریک نہیں ہیں۔ لٹریری آدمی ہیں۔ آپ جیسے ٹھس لوگ رامائن اور پدماوت کیا جانیں۔'' اس کا ردعمل فوری اور تیکھا ہے۔ اس نے جمیل کے خلاف تلخی کو راہ نہیں دی ہے۔ خود کو ہی، جو کچھ ہوا، اس کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔

ایک عرصہ گزرنے کے بعد اس نے پیرس جا کر عرفان کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ عرفان اسے چاہتا اور اس کا ماضی بھلا کر اس کے ساتھ گھر بسانے کا خواہش مند ہے۔ سیتا کو طلاق نہ ملنے کی وجہ سے (جو جمیل اسے سزا دیتے رہنے کے لیے نہیں دے رہا ہے) وہ قانوناً شادی نہیں کر سکتے۔ اس لیے سیتا یوں ہی رہنے تو لگتی ہے لیکن کہیں رہ رہ کر اس کے زخموں میں ٹیسیں اُٹھتی رہتی ہیں۔ اوپر سے پُرسکون سطحِ آب کے اندر جو ہلچل ہے اسے مصنفہ نے بڑی چابک دستی سے واضح کیا ہے:

ایک مرتبہ عرفان اس سے کہتا ہے ''تم سے ماورا ایک اور تم ہو۔ جب تم دفعتاً چپ ہو جاتی ہو میں پھر اکیلا رہ جاتا ہوں۔ تم مجھ سے ہزاروں میل دور چلی جاتی ہو۔''

عرفان کے ساتھ بطور مسٹریس رہنے، جمیل کے طلاق نہ دینے، بچے کی صورت تک نہ دیکھنے دینے نے اس کے اندر ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔ پھر باپ کی موت کی اطلاع ملنے پر وہ ہندوستان آجاتی ہے۔

کافی عرصہ اور گزرتا ہے۔ عرفان وہاں دل برداشتہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے خطوں کا درمیانی وقفہ بڑھنے لگتا ہے۔ پھر تقریباً خط آنے بند ہو جاتے ہیں۔ اب سیتا اسی شدت سے عرفان کے خط کا انتظار کرتی ہے جس طرح وہ جمیل کی جانب سے طلاق نامے کا انتظار کرتی تھی۔

''اس رات کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ کھانے کے بعد نلکے پر ہاتھ دھوتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا کہ کوئی اس کا دوست نہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں، اتنے بڑے عظیم الشان جگمگاتے ہوئے دارالسلطنت میں، شناساؤں کے اتنے بڑے ہجوم میں کوئی اس کا ہمدرد نہیں، کیوں نہیں۔ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔''

چھ مہینے اور نکل گئے۔

دل کے زخموں پر پھاہے رکھنے کو بہت عارضی طور پر وہ ایک معمر آرٹسٹ پروجیش چودھری کے ساتھ تعلق پیدا کرتی ہے جسے وہ پہلے سے جانتی تھی۔

عرفان کو اس کی اس دوستی کی خبر لگ جاتی ہے اور ادھر ایک طویل سزا کے بعد جمیل اس کی گلوخلاصی کرتا اور اسے طلاق نامہ بھیج دیتا ہے۔ سیتا خوش ہو جاتی ہے اور عرفان سے بیاہ کر کے اپنی پائدار، پُرسکون دنیا بسانے کے خیال سے سب سے رخصت ہو کر پیرس پہنچ جاتی ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ عرفان تو شادی کر کے ہنی مون منانے نکل گیا ہے اور گھر ایک ادھیڑ عمر فرانسیسی کے حوالے کر گیا ہے۔ وہ شخص سیتا کے خود کو 'مادام عرفان' بتانے پر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ پھر شادی کی اطلاع دے کر کہتا ہے اندر آجایئے یہاں ہوا بے حد تیز ہے سورج کئی دن سے نہیں نکلا۔

کہانی کا آخری جملہ ہے ''ہوا کے جھونکے نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔''

یہ واضح نہیں ہے کہ سیتا اندر چلی گئی تھی یا نہیں۔ لیکن اعجاز الرحمٰن صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ اندر چلی گئی تھی۔ اس ابہام کے باوجود سیتا کے ایک قطعی اجنبی کے ساتھ گھر میں داخل ہو جانے کا یقین اس عصبیت کا مظہر ہے جو اس کے کردار کی وجہ سے مرد اساس معاشرے میں راہ پاتی ہے۔ بہرکیف کئی مردوں سے اس کے عارضی اختلاط کے باوجود سیتا کے کردار پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جائے کہیں بھی اس سے نفرت پیدا نہیں ہوتی نہ اسے بدکردار سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسا کوئی جذبہ سطحی قرأت کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ شاید ایک بہادر عورت سے ہم حالات کا بہتر طریقے سے مقابلہ کرنے کی امید کر سکتے تھے لیکن تقسیم وطن کے بعد جس کس مپرسی سے اس کا کنبہ گزرا اس نے اور پھر جمیل کے رویے نے اس کی ساری ہمت اور صلاحیتیں سلب کر لی ہیں۔ یہ سیتا ایک نہیں، کئی راونوں کا شکار ہوئی ہے۔ جنگل میں جنگل کے قانون کے مطابق مرد زندگی گزار سکتا ہے، عورت نہیں۔

■

Mrs. Zakia Mashhadi
F-1, Grand Pallavi Court
Judges Court Road
Patna - 800004 (Bihar)

احسن ایوبی

سریندر پرکاش کا افسانہ ’آرٹ گیلری‘

بے ربط مکالموں پر مبنی سریندر پرکاش کے اس افسانہ میں مختلف مزاج اور متنوع خیالات رکھنے والے کردار ایک ایسی جگہ جمع ہیں جہاں ہر دوسرے لمحے بھانت بھانت کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ افسانہ کا غائب راوی ان سے متعلق تمام تر وقوعوں اور متضاد کیفیتوں کو معروضی انداز میں بیان کرتا ہے جس میں طنز کی آمیزش نظر آتی ہے۔ یہی طنزیہ اسلوب اور کچھ علامتی پیکر اس افسانے کو ایک نئی اسلوبیاتی جہت سے آشنا کرتے ہیں۔ جو مصنف کے دوسرے افسانوں سے مختلف ہے۔ ہمہ داں راوی کے علاوہ یہاں ایک اور شخص بیٹھا ہوا ہے جو اس کیفے میں آنے والے ہر فرد کی مصروفیت اور طرز زندگی سے واقف ہے۔ صرف افراد ہی نہیں بلکہ اس مقام پر رونما ہونے والے وہ واقعات جو ماضی کا حصہ ہو چکے ہیں وہ سب اپنے تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اسی لیے موقع بہ موقع وہ ماضی کے واقعات حال کی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے اور لمحہ موجود سے ماضی کا موازنہ بھی کرتا ہے۔ افسانے کے ابتدائی مناظر اس افسانے کو سیاسی احوال سے وابستہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، افسانے کا پلاٹ ظلم و جبر کی فضا میں پروان چڑھنے والے نامساعد حالات کے اردگرد گھومتا ہے۔ واضح طور پر یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ افسانہ نگار نے حصول آزادی اور اظہار رائے کی پابندیوں سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کے جاں سوز احوال کو علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کیفے کی سیڑھیوں پر ہمہ وقت بیٹھنے والا یہ شخص اپنے اردگرد کے تمام وقوعوں کو ناقدانہ نظر سے دیکھ اور پرکھ رہا ہے۔ لیکن لوگ بالکل بے ضرر سمجھ کر اس پر توجہ نہیں دیتے۔ سڑک پر عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے جلوس کا نظر آنا اور پھر غائب ہو جانا اسے ماضی میں لے جاتا ہے کہ جس طرح پہلے کے جلوسوں سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح آج بھی وہ نعرے کہیں فضا میں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے وجود کا ماتم منا کر مظلوموں کے قبرستان کی سوکھی گھاس کے ساتھ جل گئے ہیں۔

راوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کیفے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی آمد کا وہ منتظر ہے۔ وہ لوگ بے نیازی سے کیفے میں داخل ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ راوی کا اشتراک اس افسانے میں برائے نام ہے وہ کسی بیان کے استعاراتی اور علامتی عنصر کی وضاحت نہیں کرتا محض ایک ناظر اور سامع کی حیثیت سے کرداروں کے عوامل اور گفتگو کو قاری تک منتقل کرتا رہتا ہے۔ مثلاً اس جملے کے ذریعہ:

”ان کے چھاتوں سے ٹپکنے والی پانی کی بوندیں چکنے فرش پر ایک لکیر بناتی ہوئی پھیل گئیں انھوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔“

داخل ہونے والوں کی پچویشن بتا کر راوی نے بڑی خوبصورتی سے ان کی محویت اور بے توجہی قاری پر واضح کر دی ہے۔ کوشش کے باوجود وہ ان کی گفتگو سننے میں ناکام رہتا ہے سوائے اس جملے کے ”یار زندگی سات بٹہ انیس ہو کر رہ گئی ہے۔“ یہ غیر روایتی جملہ نہ صرف بے نام کو چونکاتا ہے بلکہ قاری کو بھی تجسس میں ڈالتا ہے اور وہ آنے والے واقعات بغور پڑھنے لگتا ہے تاکہ اس جملے کے معنیاتی ابعاد تک پہنچ سکے۔

بے نام ان کی بے نیازی پر نالاں ہو کر سوچتا ہے کہ اگر ان لوگوں نے نظر انداز کیا ہے تو وہ کیوں ان کے پیچھے بھاگے۔ جس طرح اب تک کی زندگی سیڑھیوں پر کٹ گئی باقی بھی کٹ جائے گی، لیکن اسے چائے کی طلب محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ کیفے کے اندر جا کر کیفے کی خوبصورت مالکن کو غور سے دیکھتے ہوئے آنے والے لوگوں کے قریب کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سب کے چہروں پر خوف کا رنگ اس طرح پھیل جاتا ہے گویا انھوں نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ ان لوگوں کے رویے سے قاری کے اندر تجسس بیدار ہوتا ہے کہ اس عجیب و غریب شخص کا مسئلہ کیا ہے۔

بالواسطہ طنز اور علامتوں میں ملفوف مکالموں سے رفتہ رفتہ کھلتا ہے کہ یہ شخص ان آنے والوں کا شناسا ہوا کرتا تھا لیکن زندگی کے نشیب و فراز نے اسے لوگوں سے بیگانہ کر دیا اور سب اس سے کترانے لگے ہیں۔ وہ کیفے کے اندر جا کر لوگوں کے درمیان بیٹھ جاتا ہے لیکن کوئی اس پر توجہ نہیں دیتا وہ سب کی گفتگو سن کر ایک آدھ بار اپنا ردعمل بھی ظاہر کرتا ہے لیکن جب جب وہ منھ کھولتا ہے اس کے بولنے پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ کیفے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ مبہم اور غیر مانوس ہے۔ لیکن اتنا تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس دور کی بڑھتی

ہوئی مہنگائی اور عوام کی خستہ حالی پر طنزیہ پیرائے میں بات کہی جا رہی ہے۔انھیں میں سے ایک شخص جو آرٹسٹ ہے وہ کہتا ہے کہ ''میں اب کی نمائش میں اپنی تصویروں کی قیمتیں ایک سو بارہ فیصد بڑھا رہا ہوں۔'' جس پر جواب ملتا ہے کہ روٹی تو کسی طور کمانی پڑے گی۔گویا کہ روٹی کمانے کے لیے کوئی نہ کوئی اقدام کرنا ہو گا خواہ وہ خریداروں کے لیے زحمت ہی کیوں نہ بنے۔

اس کے بعد کیفے میں موجود رتن نامی شخص کے بدلے ہوئے رویہ کے متعلق گفتگو ہوتی ہے کہ اس کا سرکش کردار ختم ہو گیا ہے۔وہ پہلے جس طرح جوش اور غصہ کا مرقع ہوا کرتا تھا اب نہیں رہ گیا۔اس کی سرکشی سے وابستہ ایک واقعہ پر بھی گفتگو ہوتی ہے اور پھر اس کے مفاہمانہ انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اس نے مصنوعی دانت لگوا لیے ہیں۔ جو اس بات کا اشاریہ ہے کہ رتن جو پہلے خونخوار ہوا کرتا تھا اب وہ صرف بظاہر ایسا نظر آتا ہے،لیکن بہ باطن وہ موجودہ سیاسی پینتروں کو اپنا چکا ہے اس لیے غلط چیزوں کی پردہ پوشی کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔مصنوعی دانت لگوا لینا یا ایندھن کھانا ایسے منفرد اور نامانوس علامات ہیں جنھیں متن سے مربوط کر کے معنی اخذ کرنے میں دشواریاں درپیش ہیں۔بعض عمومی بیانات کے محل وقوع ایسے ہیں کہ روایتی مفہوم کے دائرۂ کار کو توڑ کر نئے تناظر تشکیل دیتے ہیں۔مثلاً انھیں میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ صرف رتن ہی کیوں ہم میں سے بیشتر ساتھیوں نے مصنوعی دانت لگوا لیے ہیں جن میں سے کچھ تو مر گئے اور کچھ کو لقوہ مار گیا یا سانپ نے کاٹ لیا۔اس بات پر آرٹسٹ کہتا ہے کہ اس نمائش میں شاید مجھے بھی سانپ کاٹ لے۔جس پر جواب ملتا ہے کہ پھر تو زندگی مزے میں کٹے گی۔کیوں کہ آدمی زندگی بھر سانپ کے کاٹنے کا انتظار کرتا ہے۔حقیقی صورت حال سے متضاد یہ کیفیت نت نئی تعبیروں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور ان کی یہ گفتگو افسانے کے استعاراتی پہلوؤں کو مستحکم کرنے کے علاوہ تخیلی عنصر کو وسعت دیتی ہے۔مصیبتوں اور اذیتوں سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش انسانی فطرت ہے لہٰذا یہ جملہ ''انسان زندگی بھر سانپ کے کاٹنے کا انتظار کرتا ہے'' قول محال کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور معنیات کے نئے طرفوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

اس مبہم گفتگو سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان لوگوں میں سب کے سب زمانہ شناس اور باخبر لوگ ہیں اور مادی دور کی آلائشوں اور خود غرضیوں سے خوب واقف ہیں۔اس لیے انسان کے ظاہر و باطن کے درمیان کے فرق کو سمجھنے پر بھی قادر ہیں۔اور بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج کرنے اور ہندوستانی آئین کے مطابق اظہار رائے کی آزادی کو استعمال میں لانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں مگر ذاتی مفاد کی خاطر رتن جیسے کچھ افراد بے ضمیر و بے زبان ہو جاتے ہیں۔ظلم و جبر کے خلاف آواز تو اٹھاتے ہیں لیکن پھر معمولی مفاد کے لیے صاحب اقتدار اور حکمراں طبقے کے حمایتی بن جاتے ہیں۔جس طرح رتن کیفے میں آہستہ بولنے کی تاکید پر کیفے کے مالک پر بھڑک اٹھا تھا اور اپنی بات منوالی تھی لیکن اس کے مرنے کے بعد جب اس کی بیٹی مالکن بنتی ہے تو اس سے دوستانہ رویہ برتنے لگتا ہے۔اس جمہوری ملک میں ہونے والی سیاست اور سیاسی رہنماؤں کی طرح جو کسی عہدے یا اہم کام کے لیے ظالم حکمرانوں سے در پردہ سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔اس طرح رتن اس ملک کے سیاسی رہنماؤں کا نمائندہ معلوم ہوتا ہے اور کیفے کی مالکن حکمراں طبقے کی علامت۔رتن مالکن کے نمائندے کے طور پر وہاں پر بیٹھے لوگوں کو یقین دہانی کراتا ہے کہ کل سے مالکن چیزوں کی قیمت اکتیس فیصد کم کر رہی ہیں۔جو اس بات کا راست اظہار ہے کہ عوام مہنگائی سے تنگ آ کر جب آواز اٹھاتی ہے تو حکومت کا کوئی مصلحت پسند نمائندہ پرفریب وعدوں اور یقین دہانیوں سے ان کی آواز دبا دیتا ہے۔عوام بھی بار بار ایک ہی وعدے سے تنگ آ کر بالآخر خاموش ہو جاتی ہے۔کیفے کی مالکن کے حاکمانہ رویے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں بیٹھے لوگوں کی آپسی گفتگو میں آنے والے بعض مباحث پر وہ سخت اعتراض کرتی ہے اور جواب بھی طلب کرتی ہے۔جو اس بات کا اشاریہ ہے کہ صاحب اقتدار طبقہ بولنے کی آزادی پر بھی قدغن لگانے کے درپے ہے۔

وزیر نامی آرٹسٹ کے ذریعہ نیوڈ پینٹنگ کا منظر پیش کر کے افسانہ نگار نے تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے زوال کا نوحہ کیا ہے۔یعنی آرٹ اور کلچر جو قوموں کے تشخص اور معیار کا تعین کرتے ہیں اس میں اس قدر مادیت کا عمل دخل ہو گیا کہ فن کار عوام کے احساس جمال کو نظر انداز کر کے محض شہوانیت کو پیش کر رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کی جا سکے اور دوسرے یہ کہ اخلاقی اقدار اور جمالیاتی ذوق میں اس قدر گراوٹ آ چکی ہے کہ انسان ننگے پن کو ہی اصل ذوق سمجھ بیٹھا ہے۔علوم و فنون میں غیر معیاری چیزوں کی پیشکش کی وجوہ دریافت کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اتنی تنگ اور دشوار گزار ہو چکی ہے کہ انسان بیزار ہو کر ایسے اقدام کرنے پر مجبور ہے۔

کرداروں کی زبان سے اس جملے ''زندگی سات بٹہ انیس ہو گئی ہے'' کی تکرار پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی ریاضی کے لاینحل فارمولے کی طرح ہو گئی ہے یا ان غیر منقسم ہندسوں کی طرح جامد ہو گئی ہے جو کاٹے نہیں کٹ رہی ہے۔

کیفے میں پیش آنے والے مناظر اس طرح معنی خیز انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ ہر منظر اپنے آپ میں مختلف زاویے رکھتا ہے لیکن اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح افسانہ کی تھیم سے ہے۔مثلاً کیفے میں تین لڑکیاں مردانہ لباسوں میں داخل ہوتی ہیں اور تنک مزاج مالکن ان سے خندہ پیشانی سے ملتی ہے۔کیفے میں بیٹھے لوگوں کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا مگر انھیں گفتگو کا ایک موضوع مل جاتا ہے۔ اور ان میں سے ایک شخص مزاحیہ لہجے میں آرٹسٹ وزیر سے کہتا ہے کہ وہ اپنی نیوڈ پینٹنگ کو یہ لباس پہنا دے۔تو آرٹسٹ جواب دیتا ہے کہ مگر یہ لڑکیاں ننگی ہو جائیں گی اور کہیں نہیں جا پائیں گی۔سیڑھیوں پر بیٹھنے والا بے نام شخص دراندازی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''انھیں بڑے سفید بالوں والا کتا پال لینا چاہیے جو ان کے اعضاء ڈھک سکے۔تشدد کے علامیے کے درمیان یہ واقعہ زمانہ حال کی تہذیب،آداب گفتگو اور رہن سہن کو متشکل کرنے کی غرض سے بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے غیر مربوط اور منتشر اشیا کے ذریعہ اس بے حسی کی توضیح کی ہے جو زمانہ حال کا خاصہ ہے۔نیوڈ پینٹنگ اور ننگی ہو جانے کے تلازمے کی توثیق افسانہ کے اختتامی حصہ سے ہوتی ہے۔واضح ہوتا ہے کہ پورے افسانے میں کوئی بیان لایعنی اور مہمل نہیں ہے۔

باتوں ہی باتوں میں بے نام شخص بتاتا ہے کہ گاؤں سے چٹھی آئی ہے کہ سرکار نے ایک آدمی کو کمبل ڈال کر شیر مارنے پر ایک ہزار روپے کا انعام دیا ہے۔جبکہ میرے باپ کو سرکار نے ایک سو ساٹھ روپیہ مہینے پر آدمی مارنے کے لیے رکھا ہوا تھا اس وقت وہ فوج میں تھا۔اس بات سے صاف واضح ہے کہ انسان کی زندگی کس قدر ارزاں ہو چکی ہے۔اس بے نام شخص کو افسانہ نگار نے اس دانشور طبقہ کا نمائندہ بنایا ہے جو علم و تدارک کے باوجود اس معاشرے میں مناسب جگہ حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ کم علم اور صلاحیت سے عاری افراد مسند نشین ہو جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ بیزار ہو کر سماج سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔قوت گویائی اور بینائی سے محروم افراد کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔بے نام بظاہر تو بیگانہ نظر آتا ہے لیکن وہ کیفے میں

بیٹھے تمام لوگوں کے مقابلے زیادہ معاملہ فہم اور باخبر ہے۔ لوگوں کی کم ظرفی انھیں اجازت نہیں دیتی کہ اس شخص کی بصیرت کا اعتراف کریں بلکہ وہ مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ارے یار اس سے بات کرنا فضول ہے۔ یہ کوئی اٹکلپچو تھوڑی ہے۔ اسے تو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایندھن چاہیے اور سیڑھیوں پر کا سائبان جو اسے گرمیوں کی گرمی اور سردیوں کی سردی سے بچائے رکھے۔'' وزیر نے کہا یہ ہماری پرابلم ہے جو رنگوں کے معنی جانتے ہیں۔ اسی لیے تو اس بار میں نے نیوڈ پینٹ کیے ہیں۔ یہ کیسے سمجھے گا اس کا مطلب؟''

اس گفتگو میں خود مرکزیت اور خوش فہمی کا عنصر صاف واضح ہے۔ جدید دور کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو عقل و فہم میں دوسروں سے برتر اور اعلی سمجھتا ہے۔ انکسار و مروت کا فقدان اس قدر ہے کہ انسان اپنے علاوہ ہر ایک کو احمق ثابت کرنے کے درپے ہے۔ کچھ لمحے توقف کے بعد بے نام شخص اپنے ایک خواب کا ذکر کرتا ہے جس کی تہہ تک پہنچے بغیر اور اس کی تعبیر پر غور کیے بغیر ہی ایک شخص کہتا ہے کہ یہ کیسا ایبسٹرڈ خواب ہے۔ اس کے بعد کیفے کی مالکن بھی اسے متنبہ کرتی ہے کہ یہ ریستوران ہے بیڈروم نہیں۔ یہاں پر بھی مالکن کا انداز تحکمانہ ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی کلاس ٹیچر کلاس میں بیٹھے ہوئے بچے کو غیر ضروری بات پر سرزنش کرے اور تنبیہ کرے وہی لہجہ مالکن کا ہوتا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جس زمانے میں یہ افسانہ لکھا گیا اس وقت ملک کی سیاسی فضا میں عوام کا سانس لینا تک دشوار رہا ہوگا۔ مالکن کے ٹوکنے کے بعد بے نام کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے تمام ساتھی جو اصل معنوں میں کچھ نہیں ایک ایک کرکے چلے گئے اور وہ بالکل تنہا ہے۔ وہ کیفے سے نکل کر باہر سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں کیفے کے اندر بیٹھا ہوا ایک شخص کہتا ہے کہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر پتہ چلا کہ یہاں زندگی کتنی مختلف ہے۔ بے نام مسکرا کر معنی خیز جواب دیتا ہے۔ ''سیڑھیوں پر بیٹھ کر زندگی کا اصلی مزہ اس وقت آتا ہے جب بے مکانی کا عالم ہو۔۔ بے سرو سامانی کا احساس ہو اور ذہن میں خلا کا گہرا گڑھا ہو۔'' کیفے میں بیٹھ کر خواب بیان کرنے کی وجہ سے کیفے کی مالکن اس ڈر سے اس کا داخلہ بند کر دیتی ہے کہ کہیں اس کے خواب دوسرے گاہکوں کی بینائی پر اثر انداز نہ ہوں۔ اس لیے وہ کیفے کے اندر جاتے لوگوں کو بیٹھا حسرت سے دیکھا کرتا ہے۔ لیکن مالکن نے اتنی رعایت کر دی کہ اسے کھانا اور ناشتہ سیڑھیوں پر بھیج دیا جاتا ہے۔ مالکن کا گاہکوں کے ساتھ اچھے اور برے تمام تر رویوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف کیفے کی مالکن ہے بلکہ ان سب کی زندگی اور ہر عمل پر اختیار رکھتی ہے۔ کیفے میں ہونے والی سرگرمیوں پر مالکن کا ردعمل اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے کہ حکومتی اقتدار قومیت کے تحفظ کے پردے میں لوگوں کو عوامی اختیارات سے محروم کرنے کی سازشیں کس طرح کرتا ہے۔

تصویروں کی نمائش والے دن بے نام بھی آرٹ گیلری میں جاتا ہے اور وہاں کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر وزیر کی پینٹنگ پر پڑتی ہے وہ دم بخود رہ جاتا ہے۔ کیوں کہ ''وہاں کوئی بھی تصویر ایسی نہیں تھی جس کا سبجیکٹ انسان ہو۔ ننگا نہ ڈھنپا ہوا۔ کچھ جانوروں کی تصویریں تھیں۔ اور کچھ تصویریں ان لباسوں کی تھیں جو اس دن ان تین لڑکیوں نے پہن رکھے تھے۔۔ اور ہر لباس کے ساتھ ایک ایک لمبے سفید بالوں والا ننھا سا کتا تھا۔'' اس تصویر کو دیکھ کر بے نام کا حیران ہونا بالکل فطری تھا کیوں کہ وہ انسان جس کے بولنے اور خواب بیان کرنے پر پابندی عائد کی جاتی ہو، جسے بے وقوف سمجھا جاتا ہو اور جسے دیکھ کر لوگوں پر خوف طاری ہوتا ہو اس کی دیے ہوئے اشارے پر تصویر پینٹ کرنا ایک حیران کن عمل نہیں تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ بین السطور سے نمو پانے والے مطالب پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بے نام شخص کی نگاہ پورے عصری افق پر ہے۔ جس کے اندر انقلاب کی آوازیں پیچ و تاب کھا رہی ہیں لیکن لوگ جبری قوتوں کے خوف سے اس کے ہم زبان ہونے سے قاصر ہیں اسی لیے مافی الضمیر کو پینٹنگ کی صورت میں پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ بے نام ایک ایسا مستقبل شناس ہے جسے معلوم ہے کہ اس کی بے باکی کا انجام اذیت ناک ہوگا لیکن وہ اس خوف سے بے نیاز ہو چکا ہے۔

اس نمائش میں ایک پینٹنگ ایسی تھی جس کی نقاب کشائی چیف گیسٹ کو کرنی تھی اس لیے لوگ بے تابی سے چیف گیسٹ کے منتظر تھے۔ چیف گیسٹ کے ہاتھوں تصویر کی نمائش ہوئی۔ لوگ تالیاں بجاتے ہوئے فن کار کی تعریف کرنے لگے۔ لیکن بے نام وہ تصویر دیکھ کر پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے اور شرم سے اس کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ وہ لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر آرٹ گیلری سے بھاگنا چاہتا ہے کیونکہ وہ بے نام کی ہی تصویر تھی جس میں وہ دونوں بازو پھیلائے ننگ دھڑنگ کھڑا تھا۔ نمائش کے دوسرے روز جب صفائی کی گئی تو کچرے کے ڈھیر پر ایک لاش پڑی ملی جس کے سینے پر گہرا زخم تھا اور انگلیاں خون میں لت پت تھیں۔ شام میں جب آرٹ گیلری کا دروازہ کھلا تو اس تصویر کا پورا کینوس خالی تھا۔ اس میں پینٹ ہوا ننگا آدمی غائب تھا اور جگہ جگہ اس پر خون کی انگلیوں کے نشان تھے۔ اس منظر میں موجود آئرنی قاری کو اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آرٹ گیلری جو ذوق جمال کی تسکین کی جگہ تصور کی جاتی ہے اسے خوف اور دہشت کا مسکن بنا دیا گیا ہے۔

بے نام کی زندگی کا دردناک انجام پیش کر کے افسانہ نگار نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے کے وہ افراد جو آگہی کے عمل سے گزرتے ہوئے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی چالبازیوں کو سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں انھیں کس کس طرح اذیتیں پہنچا کر زندگی سے بیزار کر دیا جاتا ہے۔ یاس و محرومی اور وجود کی بے وقعتی انھیں ذہنی خلفشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس افسانے میں بعض مسائل تو ایسے ہیں جو ہر زمانے میں درپیش رہے ہیں۔ مثلاً مہنگائی اور کمزور عوام کا استحصال۔ لیکن بعض مسائل صرف اسی زمانے سے مخصوص ہیں جب ملک میں ایمرجنسی لگی تھی اور برسر اقتدار طبقے کے ظلم و تشدد نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ افسانہ نگار نے علامتی انداز میں اس زمانے کے سیاست دانوں کی منافع خوری اور انسانیت سوز اقدامات پر گہرا طنز کیا ہے۔ افسانے میں جو مناظر پیش کیے گئے ہیں بظاہر تو منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں مگر ان سب کا تعلق افسانہ کے موضوع اور کرداروں کی مستور شخصیت کو سامنے لانے سے ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے مناظر کے ذریعے اقدار کی پامالی، معاشرے کی بے حسی، تنہائی کا کرب اور شکست خوردگی کا وہ المیہ سامنے آتا ہے جسے اس کیفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سوائے بے نام شخص کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ افسانے میں مختلف ڈرامائی وقوعات قاری کو حیرت زدہ ضرور کرتے ہیں مگر بے یقینی یا خواب آگیں کیفیت کے دلدل میں نہیں لے جاتے بلکہ غور کرنے پر ساری تصویریں پوری تابنا کی سے نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ عدم انسانیت، سفاکی، جبر اور اقتدار طلبی کی ہوس جیسے عناصر اس افسانے کو مقام اور وقت کی حد بندیوں سے آزاد کر دیتے ہیں۔

■

Ahsan Ayyubi
Mohammad Ahsan(Name On Cheque)
C-4/3, Suroor Apartment
Sir Syed Nagar
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 9616272524

ضیاء الرحمن غوثی

اردو صحافیوں کی پیشہ ورانہ تربیت کی ضرورت

(Need for professional training of Urdu Journalists)

سماجی اور قومی زندگی میں صحافت کی ہمیشہ اہمیت رہی ہے۔ صحافت میں معاشرے کے جذبات، احساسات اور مطالبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ صحافت نہ صرف وقت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے بلکہ صحت مند سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی رجحانات کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ انسانی فلاح و بہبود، مفادِ عامہ اور سماجی قدروں کی پاسبانی اس پیشے کے خمیر میں شامل ہے۔ صحافی کی نظر ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر رہتی ہے۔ وہ مستقبل میں رونما ہونے والے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کا احساس اپنی چھٹی حس کے ذریعے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ جلد کرلیتا ہے، اسی لیے صحافی کو سماج میں ایک منفرد مقام حاصل ہوتا ہے۔ خاص طور پر جمہوری نظام میں صحافت کا ایک اہم کردار ہوتا ہے۔ مقننہ، عاملہ اور عدلیہ کے بعد اسے جمہوری نظام کا چوتھا اہم اور مضبوط ستون مانا جاتا ہے۔ اسی لیے جرنلزم کو فورتھ اسٹیٹ بھی کہتے ہیں۔ ہم دنیا کی عظیم ترین اور کامیاب ترین جمہوریت ہیں اس لیے ہم صحافت کی اہمیت سے چشم پوشی نہیں کرسکتے۔

"To inform, to educate and to entertain" صحافت کے بنیادی فرائض ہیں یعنی اسے عوام کو مقامی، ملکی اور بین الاقوامی حالات و کوائف سے باخبر رکھنا ہوتا ہے۔ اسے ایک معلم کی طرح معاشرے کو صحت، اخلاقیات، ادب، شعر وسخن، سائنس وٹکنالوجی، تجارت، صنعت، زراعت، یہاں تک کہ بچوں کی پرورش و پرداخت ہی نہیں بلکہ کچن کے لوازمات کے درس بھی دینے ہوتے ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی، فلم، اسپورٹس، رقص، موسیقی، فکشن اور فنونِ لطیفہ کا سہارا لے کر لوگوں کے لیے تفریحِ طبع اور ذہنی تسکین کے سامان بھی پروسنے ہوتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اردو صحافت کی شاندار تاریخ اور روایت رہی ہے۔ اس کا آغاز ہفت روزہ 'جامِ جہاں نما' کی شکل میں کلکتہ سے ہوا تھا۔ اس طرح اردو صحافت کئی نشیب و فراز سے گزر کر آج ہم تک پہنچی ہے۔ تحریکِ آزادی کے دوران اردو صحافت کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ تقسیم ملک کا سانحہ کم جان لیوا نہ تھا، لیکن تحریکِ آزادی اور پھر حصولِ آزادی کے بعد ملک کی تعمیرِ نو دونوں ہی مرحلوں میں اردو صحافت نے اپنی ذمہ داریاں دوسری زبانوں کی صحافت کے شانہ بشانہ بخوبی نبھائی ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اردو صحافت پتھر، لیتھو، چربے وغیرہ کے فرسودہ دور سے گزر کر اب کمپیوٹر، انٹرنیٹ، فیس بک، واٹس ایپ، ٹوئٹر، ویب سائٹ اور آفسیٹ وغیرہ کے جدید دور میں داخل ہوچکی ہے۔

ہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرسکتے کہ اردو صحافت، خواہ وہ نیوز ایجنسی کی صحافت ہو یا الیکٹرانک میڈیا کی، آج بھی بڑی حد تک ترجمے کی صحافت بنی ہوئی ہے اور اس کے اعصاب پر انگریزی صحافت سوار ہے۔ اس تمہید کے پس منظر میں آیئے ہم اپنے موضوع بحث کی طرف رخ کریں۔ ذرائع ابلاغ اور مواصلات کے شعبوں میں رونما ہونے والے زبردست انقلاب اور عالمگیریت کے تصور کی روزافزوں عمل داری نے اردو صحافت کے سامنے بھی کئی چیلنج لا کھڑے کیے ہیں۔ انہی چیلنجوں نے اردو صحافت کے لیے پیشہ ورانہ تربیت اور ٹریننگ کی ضرورتوں کو لازمی بنا دیا ہے۔

ذرائع ابلاغ کی کرم فرمائیوں کے طفیل ہی آج دنیا سمٹ کر ایک دوسرے سے بہت قریب آگئی ہے۔ ہر پل رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کی اطلاع منٹوں میں ساری دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ جدید ترین ذرائع ابلاغ نے آج کے قاری کو پہلے سے کہیں زیادہ حساس، بیدار اور باخبر کردیا ہے، اس لیے دیگر ذرائع ابلاغ کی طرح اردو صحافت سے بھی لوگوں کی توقعات پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ چنانچہ شاید لوگ آج کی اردو صحافت سے پوری طرح مطمئن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو صحافت کو دوسرے ذرائع ابلاغ یا دوسری زبانوں کی صحافت سے سخت مسابقت کا سامنا ہے۔

ایسے میں طب، قانون اور درس و تدریس اور ٹکنالوجی سے وابستہ علوم وفنون کے پیشوں کی طرح اردو صحافت کے پیشے کے لیے بھی خصوصی نصاب، ضابطۂ عمل نیز پیشہ ورانہ تربیت کی سخت ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر پریس کمیشن نے اس سلسلے میں ایک سروے کیا تھا اور ڈھائی سو سوال نامے متعلقہ افراد کو بھیجے تھے، جن میں سے دو سو سے زیادہ افراد نے صحافت کے پیشے کے لیے باقاعدہ تربیت کو ضروری قرار دیا تھا۔

فروغ اردو سے متعلق گجرال کمیٹی نے بھی 1975 میں سفارش کی تھی کہ عثمانیہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اردو میڈیم کے ذریعے صحافت کی تعلیم و تربیت کے نصاب شروع کریں۔ چنانچہ جامعہ ملیہ کا ماس کمیونی کیشن کا ادارہ نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔

تحریک آزادی کے دوران ہندوستان میں اردو صحافت کے جو معیار، بلندی اور وقار حاصل کیا تھا، اسے پھر سے بحال کرنے کے لیے بھی صحافتی تربیت کی افادیت اور لزومیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ عام شکایت ہے کہ اردو اخبارات اور جرائد کے قارئین کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ اچھا خاصا اردو داں طبقہ اردو اخبارات و رسائل کی بجائے انگریزی یا ہندی اخبارات کو ترجیح دیتا نظر آتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو اخبارات و رسائل میں مواد کے تنوع اور پیش کش میں رنگارنگی اور خوش نمائی کی کمی اور زبان کی غلطیاں ہیں اردو اخباروں میں اب شاید پروف ریڈنگ کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جا رہی ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ تقسیم وطن کے بعد اردو زبان پر مسلمانوں کی زبان اور اردو صحافت پر مسلم صحافت کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے اور شاید ہم نے اس لیبل کو بخوشی قبول بھی کر لیا ہے۔ افسوس اس بات کا بھی ہے کہ اردو صحافت اپنی لیک سے ہٹ کر چلنے کو بھی شاید آمادہ نہیں۔ ضرورت موضوعات اور مواد میں توازن اور تنوع برتنے کی بھی ہے۔ مسلم اقلیت کے مخصوص مسائل کے ساتھ ساتھ بجلی، پانی، صحت، تعلیم، ترقیات اور قانون دانی، لا اینڈ آرڈر اور مفادِ عامہ جیسے دیگر مسائل کو بھی زیادہ سے زیادہ جگہ اردو اخبارات میں ملنی چاہیے۔

اردو آبادی کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ اقلیتی مسائل کی کوریج کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات میں نہ صرف فلم اور اسپورٹس بلکہ تجارت، صنعت، بینکنگ، انشورنس، سائنس، ٹکنالوجی، روزگار کے مواقع، کیریئر گائڈنس، ٹیکسیشن، قوانین، آئین، ایکسپورٹ، امپورٹ، حفظانِ صحت اور بین الاقوامی تعلقات جیسے موضوعات سے متعلق مواد بھی پڑھنا چاہتا ہے جن کی ہمارے اردو اخبارات میں کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ ہمیں حکومت کی فلاحی اسکیموں اور ترقیاتی پروجیکٹوں سے بھی اپنے قارئین کو باخبر رکھنا چاہیے۔ اردو صحافیوں کی پیشہ ورانہ تربیت اردو کے روشن خیال طبقے کی مذکورہ تشنگی کو بڑی حد تک دور کر سکتی ہے۔ اگر اردو اخبارات کا عملہ تربیت یافتہ ہو تو نہ صرف یہ کہ قارئین کی تعداد حسب خواہ ہو جائے گی بلکہ کاروباری نقطۂ نظر سے بھی اردو صحافت منفعت بخش ثابت ہوگی۔

اردو صحافت کا المیہ یہ بھی ہے کہ اس کے عملے کی تعداد بڑی محدود ہوتی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ کسی اخبار میں جو عملہ مقرر کیا جاتا ہے اس کے لیے عام طور پر دوسرے پیشوں کی طرح پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کی شرائط پوری کرنا لازمی نہیں سمجھا جاتا۔

ہم آئے دن اردو صحافت کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے رہتے ہیں جن کا تعلق سرمایہ، طباعت، نیوز پرنٹ، اشتہارات اور سرکولیشن وغیرہ سے ہوتا ہے لیکن یہ مسائل کوئی نئے مسائل نہیں، یہ قدیمی مسائل ہیں۔ آج سب سے فوری توجہ کا اہم ترین مسئلہ اردو صحافیوں کی پیشہ ورانہ تربیت کا ہے۔ عام طور پر ہمارے اردو صحافی تربیت یافتہ نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ وہ جدید صحافت کے بدلتے رجحانات اور تقاضوں نیز پیشے کی جدید ترین تکنیک سے بھی ان کی خاطر خواہ واقفیت نہیں ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ حالات بدل رہے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا محمد باقر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں اثر، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا عبدالماجد دریابادی، سلطان احمد، مولانا عثمان فارقلیط، ناز انصاری، کلدیپ نیر، حیات اللہ انصاری، مولانا رزاق ملیح آبادی جیسے صحافی پیشہ ورانہ طور پر تربیت یافتہ نہ ہوتے ہوئے بھی کامیاب صحافی تھے۔ تو عرض ہے کہ ان کے زمانے میں صحافت کی تربیت کی سہولتیں نہیں تھیں۔ ان کے زمانے کی صحافت ایک مشن، ایک فرض اور ایک مقصد کا نام تھا لیکن آج صحافت مشن نہیں رہی۔ آپ اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر ہی لیں کہ آج کی صحافت، خواہ وہ کسی زبان کی ہو، ایک تجارت، کاروبار اور روزگار بھی ہے اور محض ایک پیشہ نہیں، اس لیے اردو صحافت کو بھی اپنے پیشے کے جدید ترین تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید ترین صحافتی تکنیک کو اپنانا ہی ہوگا۔ اردو صحافیوں کو بھی اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر ہر فن مولا بھی بننا ہوگا، یعنی اپنے پیشے کے مختلف شعبوں سے متعلق Something of every thing کی وقتاً فوقتاً ٹریننگ لیتی رہنی ہوگی یعنی نیوز سنس اور ایڈیٹوریل کے ساتھ ساتھ طباعت، سرکولیشن، ایڈورٹائزنگ (Space marketing) نیز مینجمنٹ جیسے تمام کلیدی امور کی جدید تکنیک بھی سیکھنی ہوگی، جس کی کمی اردو صحافت میں نظر آتی ہے۔

جب وکالت، ڈاکٹری، معلّمی جیسے تمام پیشوں کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور ٹریننگ لازمی قرار دے دی گئی ہے تو پھر اردو صحافت اس سے مستثنیٰ کیوں؟ کوئی نیم حکیم زیادہ سے زیادہ سو دو سو مریضوں کے لیے خطرۂ جان بن سکتا ہے لیکن ایک نیم پختہ اور غیر تربیت یافتہ صحافی پورے معاشرے کو گمراہ کر سکتا ہے۔ پیشہ ورانہ تربیت صحافی کے اندر خود اعتمادی پیدا کرتی ہے۔ اس کے اندر نیوز سنس ڈیولپ کرتی ہے۔ اس کے اندر پیشہ ورانہ وقار اور ذمہ داری کا احساس جگاتی ہے۔ ایک تربیت یافتہ صحافی اپنے پیشے کے وقار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا، وہ سماج دشمن عناصر کا بے جا دباؤ بھی قبول نہیں کر سکتا، وہ اپنے پیشے کے Scope اور اس کی Limitations سے بھی بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ وہ قانون شکنی اور ضابطۂ اخلاق سے انحراف کا موردِ الزام ہونے سے بھی خود کو بہ آسانی بچائے رہتا ہے۔ اس لیے کہ اسے پریس لاز اور پریس کوڈ آف کنڈکٹ کی واقفیت ہوتی ہے۔

اظہارِ خیال کی جتنی آزادی ہندوستانی پریس کو آج حاصل ہے اتنی دنیا کے کسی دوسرے ملک کے پریس کو حاصل نہیں لیکن پیشہ ورانہ تربیت کی کمی کی وجہ سے غیر تربیت یافتہ صحافی عموماً پریس کی آزادی کا بے جا استعمال کرنے لگتا ہے۔

صحافیوں کی جدید تربیت میں رپورٹنگ، سب ایڈیٹنگ، فیچر رائٹنگ، ایڈورٹائزنگ، سرکولیشن، پروف ریڈنگ، ترجمہ نگاری، فوٹو جرنلزم، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، الیکشن رپورٹنگ، لٹریری اینڈ کلچرل رپورٹنگ، ریڈیو جرنلزم، ٹی وی جرنلزم، پریس لاز، جرنلسٹک کوڈ آف کنڈکٹ جیسے امور اور موضوعات شامل ہیں۔ صحافتی تربیت کے ضمن میں پریس کونسل آف انڈیا، پریس انفارمیشن بیورو، ڈی۔ اے۔ وی۔ پی، پریس ایڈوائزری کونسل، آئی۔ این۔ ایس جیسے اداروں اور تنظیموں کے دائرۂ عمل کی واقفیت بھی ضروری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اردو صحافیوں کی پیشہ ورانہ تربیت کی آخری صورت کیا ہو؟ اچھا تو یہ ہے کہ اردو کا صحافی جرنلزم کا ڈپلوما یا ڈگری لے کر ہی اس پیشے میں داخل ہو۔ اگر ایسا نہ ہو پائے تو کم از کم وقتاً فوقتاً پیشہ ورانہ تربیت ہی لیتا رہے۔ اس وقت جرنلزم کے کورس کا سب سے بڑا اور حکومت کی براہِ راست نگرانی والا تسلیم شدہ ادارہ ہے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن، جو نئی دہلی میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے قریب واقع ہے۔ پہلے یہ ساؤتھ ایکس میں ہوا کرتا تھا۔ یہ مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات و نشریات کے زیر نگرانی ہے۔ یہاں

ڈپلوما کورس کے علاوہ ورکنگ جرنلسٹوں کے لیے ریفریشر کورس کا بھی اہتمام ہے۔ اس کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ بھارتی ودیا بھون (نئی دہلی) میں بھی جرنلزم ڈپلوما کورس کا اہتمام ہے۔

اس کے علاوہ ملک کی تقریباً تین درجے سے زائد یونیورسٹیوں میں جرنلزم کی پوسٹ گریجویٹ ڈگری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے پروفیسر محمد حسن کے زمانے میں ماس میڈیا کا ڈپلوما سرٹیفکٹ کورس بھی شروع کر رکھا تھا۔

جامعہ ملیہ کا سنٹر آف ماس کمیونیکیشن جرنلزم کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا خصوصاً ٹیلی ویژن پروڈکشن کی ٹریننگ بھی دیتا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی (میرٹھ) میں بھی اردو میں جرنلزم کی پوسٹ گریجویٹ ڈگری کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی (میرے مشورے کے بعد) اردو صحافت کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس کا اہتمام ہوا ہے۔

راجستھان یونیورسٹی کے تحت کوٹہ شہر میں بھی جرنلزم میں ڈپلوما کے فاصلاتی کورس کا اہتمام ہے جس کا میڈیم ہندی ہے۔ کئی غیر سرکاری ادارے بھی جرنلزم کے کورسز چلاتے ہیں، ان میں کچھ تسلیم شدہ بھی ہیں اور کچھ غیر تسلیم شدہ بھی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی نے بھی اردو گھر میں چند سال قبل اردو صحافت کا کورس شروع کیا تھا جامعہ ملیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عثمانہ یونیورسٹی کے اردو کے شعبے اردو صحافت پر اکثر سمینار منعقد کرتے رہتے ہیں جن سے اردو کے صحافی استفادہ کر سکتے ہیں۔

ملک بھر میں اردو کی اوّلین اور واحد نیوز سروس یو این آئی ہے، جو اندرون ملک اور بیرون ملک سیکڑوں اخبارات کو اردو میں خبریں اور فیچرس فراہم کرتی ہے۔ اس نیوز ایجنسی سے رابطہ قائم کر کے اردو کے صحافی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اردو اخبارات کی مینجمنٹ کو تھوڑی سی کشادہ دلی اور صحافتی ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے غیر تربیت یافتہ عملہ کو اپنے خرچ سے موقع بہ موقع شارٹ ٹرم ٹریننگ دلوانی چاہیے۔ یہ بات ان کے اپنے ہی اخبار کے مفاد میں ہوگی، اس لیے کہ ایک تربیت یافتہ صحافی اپنے اخبار کے فروغ میں زیادہ معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ملک گیر پیمانے پر اردو کے جو چند بڑے اخبارات ہیں انھیں چاہیے کہ اردو صحافت کی تربیت کے لیے وظیفے جاری کریں۔ انھیں اردو کے چھوٹے اخباروں کے صحافیوں کو اپنے یہاں صحافت کی عملی تربیت کے لیے موقع بہ موقع مدعو کرنا چاہیے۔

اخبار آج کے انسان کی اہم ضرورتوں میں شامل ہو گیا ہے۔ ایک عام پڑھا لکھا انسان اپنی روزمرہ کی زندگی کی مصروفیات کا آغاز صبح کا اخبار پڑھنے کے بعد ہی کرتا ہے۔ اس لیے اب صحافت کے پیشے کی طرف تعلیم یافتہ نوجوانوں کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے اور وہ صحافت یا میڈیا کے کریئر کو دیگر پیشوں پر فوقیت دینے لگے ہیں۔ اس لیے اگر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو نصاب کو روزی روٹی سے جوڑنا ہے تو ضروری ہے کہ ملک کی تمام بڑی یونیورسٹیاں اپنے اردو کے نصاب میں اردو صحافت کو لازمی طور پر شامل کریں۔ ساتھ ہی سال میں ایک بار اردو صحافت کے ریفریشر کورس اور اردو صحافت کے موضوعات پر باقاعدگی سے سمیناروں کا انعقاد بھی کریں۔ اس سے نوجوانوں میں اردو زبان کے مطالعے سے دل چسپی بھی بڑھے گی۔

اردو صحافیوں کے لیے معیاری اور مستند صحافی زبان و اصطلاحات کی جامع فرہنگ کی کمی ہے۔ اس ضمن میں بھی تربیت کی ضروری ہے، NCPUL کو پہل کرنی چاہیے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک دونوں ہی میڈیا میں انگریزی کی نئی نئی اصطلاحات وجود میں آرہی ہیں، انھیں اردو کا جامہ پہنانے کا عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ وقتاً فوقتاً ورک شاپ کا انعقاد کرکے حسب ضرورت نئی اصطلاحات پر غور کیا جانا بھی ضروری ہے۔ اردو صحافیوں کو انگریزی یا ہندی کی خبروں کا اردو میں خالص صحافتی زبان میں معتبر اور قابل قبول ترجمہ کرنے میں اکثر دشواریاں محسوس ہوتی ہیں۔

ملک کی اردو اکادمیوں اور سرکاری گرانٹ سے چلنے والے فروغ اردو کے اداروں کو بھی مشاعروں اور دیگر ادبی تقریبات کے ساتھ ساتھ کم از کم سال میں ایک بار اردو صحافت کے ریفریشر کورس کا انعقاد کرنا چاہیے۔ یہ کورس ان کے لیے ہونا چاہیے جو کسی نہ کسی اردو اخبار یا رسالے سے وابستہ ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی کو بھی اردو صحافیوں کی تربیت کے مسائل اور اس کی ضرورت کی طرف خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ ان کے پاس کافی فنڈ اور وسائل بھی ہیں۔ ضرورت صرف قوتِ عمل کی ہے۔ اردو صحافت کی بقا اور اس کے فروغ کی ذمے داری سے ان اداروں کو چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ ان اداروں کے اردو آبادی سے براہِ راست رابطے کا واحد راستہ اردو صحافت ہے۔

ضروری نہیں کہ اردو صحافیوں کی ٹریننگ کا میڈیم اردو زبان ہی ہو، اردو کا صحافی انگریزی یا ہندی زبانوں کے ذریعے بھی صحافت کے بنیادی امور کی تربیت حاصل کر سکتا ہے۔ مقصد تو پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنا اور اجاگر کرنا ہے۔

آج الیکٹرانک میڈیا میں ٹی وی چینلوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ چونکہ اردو صحافیوں کے شین قاف اور لب و لہجہ دوسری زبانوں کے صحافیوں کے مقابلے میں بہتر ہوتے ہیں اس لیے ٹی وی چینلوں میں اردو والوں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ آج ٹی وی چینلوں کے آسمان پر اردو صحافت کے پس منظر والے کئی میڈیا پرسن درخشاں نظر آتے ہیں۔ اس لیے پیشہ ورانہ تربیت اردو صحافیوں کے لیے کامیابی کے کئی نئے دروازے بھی کھول سکتی ہے۔ ان کے علم اور تجربے کو ان کی تھوڑی سی پیشہ ورانہ تربیت جلا بخش سکتی ہے۔ بغیر پیشہ ورانہ تربیت کے کوئی اردو صحافی اپنے ڈسک سے سیدھے چھلانگ لگا کر ترقیوں کے زینے طے نہیں کر سکتا، اسے ضروری پیشہ ورانہ تربیت کے مرحلے سے گزرنا ہی ہوگا۔

اردو صحافیوں کے لیے معیاری اور مستند صحافی زبان و اصطلاحات کی جامع فرہنگ کی کمی ہے۔ اس ضمن میں بھی تربیت کی ضروری ہے، NCPUL کو پہل کرنی چاہیے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک دونوں ہی میڈیا میں انگریزی کی نئی نئی اصطلاحات وجود میں آرہی ہیں، انھیں اردو کا جامہ پہنانے کا عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ وقتاً فوقتاً ورک شاپ کا انعقاد کر کے حسبِ ضرورت نئی اصطلاحات پر غور کیا جانا بھی ضروری ہے۔ اردو صحافیوں کو انگریزی یا ہندی کی خبروں کا اردو میں خالص صحافتی زبان میں معتبر اور قابل قبول ترجمہ کرنے میں اکثر دشواریاں محسوس ہوتی ہیں۔ یہ مسئلہ اخباروں اور ریڈیو کے نیوز روم میں آکر درپیش ہوتا ہے۔ غیر معیاری اور ناقابل قبول الفاظ، اصطلاحات اور اسلوب بیان کی وجہ سے اردو کا تعلیم یافتہ قاری اردو اخبارات سے بے اعتنائی برتنے لگتا ہے۔

■

Syed Ziyaur Rahman Ghausi
K-94, Ground Floor, AFE (I), Jamia Nagar
New Delhi - 110025

روزنامہ منصف کی ادبی خدمات

شیخ عمران

شہر حیدرآباد کی اپنی ایک منفرد پہچان ہے۔ یہ شہر پوری دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ اردو کے ایک دبستان کے طور پر اس شہر سے ہم آشنا ہیں۔ شہر حیدرآباد نے اردو کو کئی بڑے شاعر، ادیب، نقاد و صحافی دیے ہیں۔ مطبوعہ صحافت کے معاملے میں بھی یہ شہر دیگر شہروں کے مقابلے میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ روزنامہ 'رہنمائے دکن' روزنامہ سیاست، اعتماد، صحافی دکن، ملاپ جیسے کئی اخبارات اس شہر سے جاری ہوئے اور آج بھی جاری ہیں ان ہی میں ایک اخبار روزنامہ منصف ہے۔ روزنامہ منصف کو اخبار کے بجائے ایک تحریک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

محمود انصاری صاحب نے اپنی ادارت میں 3/ مارچ 1979 کو اخبار 'منصف' کو اس نئے طرز پر متعارف کرایا کہ یہ نیا اخبار اپنے پرانے اخباروں سے کسی بھی لحاظ سے کم ثابت نہیں ہوا بلکہ کئی معنوں میں تو بہت آگے نکل گیا۔ اس نے اردو صحافت میں بہت سے نئے تجربے کیے اور یہ تمام تجربات کامیاب بھی ہوئے۔ یہ اخبار اپنے سیاسی تجزیوں، مذہبی مضامین کے علاوہ تبصروں اور کالموں کے لیے بھی بہت معروف ہوا۔ 1980 میں اس میں ادبی کالموں کی شروعات ہوئی اور اس کی ذمے داری اخبار کے ایک ملازم وقار خلیل کے سپرد کی گئی جنھوں نے اسے بخوبی نبھایا۔ ان میں ادبی مقالوں، انٹرویو، شخصی خاکوں، تنقیدی مضامین کے علاوہ شعری نشست اور طنز و مزاح کے خصوصی کالم تھے۔ طنز و مزاح کا مستقل کالم، 'ادھر ادھر' بہت مقبول ہوا۔ اس کے قلم کاروں کا قلمی نام 'من موجی' اور 'ہرفن مولا' تھا۔ جو اصل میں بالترتیب احمد جلیس اور احسن علی مرزا ہیں۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خصوصی مواقع کے لیے بھی بہت سے شمارے شائع کیے گئے۔ یہ مختلف موضوعات پر تھے۔ اس کے منظوم طنز و مزاح کا بہترین کالم اس کو دیگر اخباروں سے منفرد اور ممتاز کرتا رہا۔ یہ کالم اوج یعقوبی کا 'طنز و تبسم' تھا۔ یہ راز بھی تب کھلا جب اوج یعقوبی کا انتقال ہوگیا۔ اس بات پر سب لوگ حیران تھے کہ یہ کالم حیدرآباد کے مشہور و معروف شاعر کا تھا۔

اپنی بہترین کمپوزنگ اور خوبصورت طباعت کی بدولت یہ اخبار دیگر زبانوں کے روزناموں کے ہم پلہ نظر آنے لگا۔ اس کا معیار اعلیٰ ہے اس میں شائع ہونے والے مضامین بھی اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ ملک بھر کے تقریباً جید صحافیوں اور دانشوروں کی خدمات اس میں لی جاتی ہیں۔ جہاں تک اخبار کی پالیسی کا تعلق ہے۔ اس کا شروع سے ہی رخ اقلیتی مسائل کو بے باکی سے اٹھاتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس اخبار کو کئی بار سرکاری زیادتیوں کا بھی شکار ہونا پڑا۔ اگر چہ ایسا ہر اردو اخبار کی قسمت میں لکھا ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی حکومت کے عتاب کا شکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ 'منصف' کو بھی حکومت کے عتاب کا شکار ہونا پڑا اور نتیجے کے طور پر 'منصف' کے دفتر کو پولیس نے مہر بند کر دیا اور یہ سلسلہ پندرہ روز تک جاری رہا۔ حکومت کی غیر قانونی اور غیر آئینی حرکت کے خلاف پریس کونسل آف انڈیا اور ہائی کورٹ میں مقدمہ چلا اور پی سی آئی کی کوششوں کی بدولت آخر کار اخبار کو کامیابی ملی اور اس کی مہر کھولی گئی۔ لیکن گیارہ ماہ تک اخبار کے لیے سرکاری اشتہارات بند کر دیے گئے۔ جس کے بغیر اردو اخبارات کی اشاعت ممکن نہیں ہوتی۔ البتہ ادارے کی حوصلہ مندی سے یہ اخبار مسلسل جاری رہا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

اس اخبار کے بانی محمود انصاری کے دور سے ہی ان کے پاس ایک بہترین ادارتی ٹیم موجود تھی۔ آج اس کی ادارت محمد لطیف خان کر رہے ہیں۔ ان کے پاس بھی اچھے صحافیوں کی ایک ٹیم موجود ہے۔ موضوعات اور صفحات کے معاملے میں یہ بھی اردو کا معیاری اخبار ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ہر روز 12 سے زائد ہوتی ہے۔ پیر اور جمعرات کو 16 صفحات اور جمعہ کو 18 صفحات ہوتے ہیں۔ جمعہ کو 8 صفحات کا خصوصی مذہبی ضمیمہ ہوتا ہے، جب کہ پیر کو بچوں کے لیے 4 صفحات کا 'گلدستہ' جس میں خواتین و دیگر سماجی موضوعات پر بھی اعلیٰ معیار کے تجزیاتی مضامین ہوتے ہیں۔ جمعرات کو 'آئینہ ادب' کے 4 صفحات ہوتے ہیں جن میں ادب کی مختلف اصناف پر مضامین، تبصرے اور شعری کالم ہوتے ہیں۔ اس میں منظوم، نثر اور طنز و مزاح کے کالم اتوار کو باقاعدہ ہوتے ہیں۔ روزمرّہ کے صفحات میں صفحہ اول تو عموماً اہم خبروں کے لیے مختص ہوتا ہے صفحہ 2 پر ریاستی، صفحہ 3/ پر قومی، صفحہ 4/ پر ادارتی، صفحہ 5/6 ریاست کی دیگر خبریں، صفحہ 7 پر بین الاقوامی، صفحہ 8/ پر کھیل اور کچھ کاروبار کی خبریں ہوتی ہیں۔ جبکہ صفحہ 9-10 پر آندھرا پردیش، تلنگانہ کی خبروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ اخبار صرف حیدرآباد ہی نہیں ریاست کے دیگر علاقوں بلکہ پڑوسی ریاستوں میں بھی مقبول ہے۔ 4 صفحات پر مشتمل کسی نہ کسی موضوع پر خصوصی ضمیمہ ہوتا ہے جس کی شروعات اس نے پہلی بار کی ہے۔ عموماً یہ اردو کا واحد اخبار ہے جو روزانہ ضمیمہ شائع کرتا ہے۔

'منصف' نے مقامی نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کو جگہ دی جہاں نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کی حوصلہ افزائی

کی وہیں معیاری مضامین کو بھی جگہ دی۔ جہاں نئے لکھنے والوں کی تخلیقات ملتی ہیں وہیں مشاہیر ادب کا قلمی تعاون بھی اس اخبار کو حاصل رہا۔ جن میں پروفیسر گیان چندجین، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر سیدہ جعفر، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، ڈاکٹر بیگ احساس، خواجہ عبدالغفور، ابوالفیض سحر اور محمد رضوان القاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ 'منصف' نے جہاں 'میرا مطالعہ' جیسے تبصرے اور تنقید والے منفرد کالم کو مستقل طور پر شائع کیا وہیں کتابوں پر علیحدہ سے تبصرہ کو بھی اہمیت دی۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین کو نمائندگی دی لیکن افسانے کو شدت سے نظر انداز کیا اس لیے کہ مدیر نے یہ بات ذہن نشین کر لی ہے کہ افسانہ اور ناول صرف اور صرف ماہناموں میں ہی شائع ہونا چاہیے۔ 'منصف' کی خصوصی اشاعتوں میں ادبی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ متفرق مضامین شعری تخلیقات کے نمایاں طور پر شائع کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی کے مضامین جو محرم سپلیمنٹ میں ہر سال شائع کیے جاتے ہیں۔ یہاں اہمیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ خصوصی اشاعتوں کے علاوہ جو ادیب وشاعر بیرون شہر سے آتے ہیں ان کا خصوصی طور پر تعارف شائع کیا جاتا ہے۔ مشاہیر کے انتقال پر تعزیت ناموں کے ذریعے ادبی خدمات کا حق ادا کیا جاتا ہے۔

1997 سے روزنامہ 'منصف' میں باضابطہ ادبی ایڈیشن کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ جس کو 'ایوان ادب' کا نام دیا گیا۔ بعد ازاں 2007 سے اس کا نام بدل کر 'آئینہ ادب' کر دیا گیا پہلے یہ ایڈیشن یکشنبہ کو شائع ہوا کرتا تھا۔ مگر اب یہ جمعرات کے روز شائع ہوتا ہے۔ روزنامہ 'منصف' میں جمعرات کو سپلیمنٹ 'آئینہ شہر' شائع ہو رہا ہے۔ جو 4/صفحات پر مشتمل ہے جس میں قدیم وجدید شہر سے متعلق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس سپلیمنٹ کے پہلے صفحہ پر مسز اودیش رانی کا مستقل کالم 'مجھ کو لوٹا دو مری عمر گذشتہ کی کتاب' اور ابھی کچھ دنوں سے 'مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا' شائع ہو رہا ہے۔ جس میں اودیش رانی نے قدیم حیدر آباد کے محلوں، مدرسوں، بازاروں، شاہراہوں، عید تہوار، قدیم حویلیوں، راجہ مہاراجاؤں اور نوابوں کی شادی، بیاہ، دسترخوانوں، ان کے کھانوں (ڈشیز)، طرز تعلیم نسواں، سواریوں، کالجوں اور جامعہ عثمانیہ کے حالات کو موثر انداز میں قلمبند کیا ہے۔ جس کو حیدر آباد میں عوام دلچسپی سے پڑھتی ہے۔ آصف سادس نواب میر محبوب علی خاں اور آصف سابع حضور نظام میر عثمان علی خان کی شخصیت اور کارناموں پر بھی قسط وار مضامین شائع ہوتے ہیں۔

سپلیمنٹ 'آئینہ شہر' کے دوسرے صفحہ پر 'آئینہ ادب' میں ادبی علمی تحقیقی وتنقیدی مضامین اور شعراء کرام کا کلام مع تصاویر شائع ہوتا ہے۔ جس میں کہنہ مشق شعرا کے علاوہ اضلاع کے شعرا اور جدید شعرا کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ جن میں پروفیسر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر مسعود جعفری، انجم شافعی، نادر المسدوسی، تاندر اسلوبی، رئیس اختر، صلاح الدین نیر، خواجہ شوق، بشیر احمد، تاج مضطر، مظفر مجاز، اشرف رفیع اور عزیز ناگپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صفحہ 3/ پر کالم نئی کتابیں نئے رسالے اجمالی تعارف میں کتابوں پر تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کالم یادرفتگاں میں کسی شاعر ادیب یا صحافی کا تعارف اور اس سے وابستگی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس صفحہ پر اظہر افسر سابق پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو کالم 'کچھ باتیں کچھ یادیں' تحریر کرتے ہیں۔ جس میں وہ گزرے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ سپلیمنٹ کے آخری صفحے پر کالم 'ہجوم میں چہرہ' کسی گم نام لیکن خاص شخصیت کے کارناموں کو مع تصویر شائع کیا جاتا ہے۔ اس صفحہ کے ایک جانب سٹی راؤنڈ آپ میں شہر کے موجودہ حالات جیسے ''شہر میں سردی کا آغاز وائرل فیور جیسی موسمی بیماریوں میں اضافہ اور 'نشہ کرنے والے ڈرائیورس کو چیک کرنے کے نئے آلات' وغیرہ، سینئر صحافی شیخ سلیم اللہ تحریر کرتے ہیں۔ روزنامہ منصف کا یہ سپلیمنٹ علمی وادبی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مظفر مجاز نے بحیثیت ادبی صحافی ممتاز مقام حاصل کیا۔ وہ 'منصف' کے ادبی ایڈیشن کے مرتب تھے گذشتہ کچھ ماہ قبل آپ کا انتقال ہوگیا۔ اس ادبی ایڈیشن کو انہوں نے اپنی مدیرانہ صلاحیتوں سے نہایت بلند معیار عطا کیا تھا۔ یہ ایڈیشن اپنی ترتیب، مواد اور معیار کے اعتبار سے کسی ادبی رسالے سے کم نہیں ہے۔ اس کی تہذیب و ترتیب میں مظفر مجاز نے خلاقانہ و ناقدانہ ذہن کی کار فرمائی پوشیدہ ہے۔ اس ادبی ایڈیشن کے ذریعے مظفر مجاز نے ہمیشہ معیاری شعر و ادب پیش کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ مظفر مجاز صاحب کی وجہ سے اس روزنامے کے ادبی صفحہ کو ملک گیر پیمانے پر شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اور یہ روزنامہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ آپ کا اس دنیائے فانی سے کوچ کر جانا یہ روزنامہ منصف کا بہت بڑا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

روزنامہ 'منصف' شہر حیدر آباد کا ایک ایسا روزنامہ ہے جس نے اردو زبان وادب کی فلاح و بہبودی کے لیے ہمیشہ جدوجہد کی اور آج بھی کر رہا ہے۔ روزنامہ 'منصف' ایسے دور میں جاری ہوا جب شہر حیدر آباد پر بہت نازک حالات تھے۔ اردو زبان کا معیار ایسے وقت برقرار رکھنا یہ روزنامہ 'منصف' کا ایک اہم کارنامہ ہے ایسے پر آشوب دور میں روزنامہ 'منصف' نے قارئین کے ذوق کا سامان فراہم کیا ساتھ ہی ساتھ زبان کی حفاظت بھی کی جس سے اس اخبار کے مدیر کی محنت ولگن کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس دن سے محمود انصاری نے اس روزنامہ کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی اس دن سے اس اخبار کے سنہری دور کا آغاز ہو گیا۔ محمود انصاری نے اس روزنامہ کے ذریعہ اردو داں طبقہ کو اردو زبان سے واقفیت دلانے کے لیے بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیے۔ روزنامہ 'منصف' نے اردو زبان کی وکالت کرتے ہوئے زور دیا کہ یہ وہ زبان ہے جس نے ہمارے ملک میں مختلف تہذیبوں کے قوام تیار کرنے میں مدد دی اور اس کو استحکام بخشا اس میں اتنی صلاحیت و وسعت ہے کہ وہ عصری تقاضوں کا مقابلہ کرتے ہوئے خود کو ہم آہنگ کرسکتی ہے۔

آج ہم دکن کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ ناقابل تردید حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ 'روزنامہ منصف' کی اشاعت کے بعد اردو بولنے، سیکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے ایک نوید مسرت اور نتیجہ خیز تحریک کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اردو والوں کو حالاتِ حاضرہ سے مربوط رکھنے، واقف کروانے، ان کی رائے سازی، جمہوریت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں یہ اخبار 'منصف' نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ خان لطیف خان نے اس اخبار کو فن کی بلندیوں پر پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ وہ خود شاعری کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا اردو مشاعروں کو انھوں نے سراہا، معاشی طور پر بھی ان کی مدد کی۔ خان عبدالطیف خان کی ہدایت پر روزنامہ 'منصف' کے اشتراک وتعاون سے شہر حیدر آباد میں کئی ادبی مجلسوں، کئی مشاعروں اور اردو سے وابستہ سرگرمیوں کا انعقاد عمل میں آیا جس کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ غرض اس طرح روزنامہ 'منصف' اردو زبان و ادب کی ترقی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے حیدر آباد کے دیگر اخبارات کے مقابلے میں یہ روزنامہ ادبی، سیاسی، سماجی ہر معاملہ میں پیش پیش ہے آج بھی یہ اخبار شہرت و مقبولیت کی راہ میں پر گامزن ہے۔

■

Dr. Shaikh Imran
Vasant Rao Nanak Govt Institute
of Arts & Sciences
Nagpur
Mob: 09921986904 (MS)

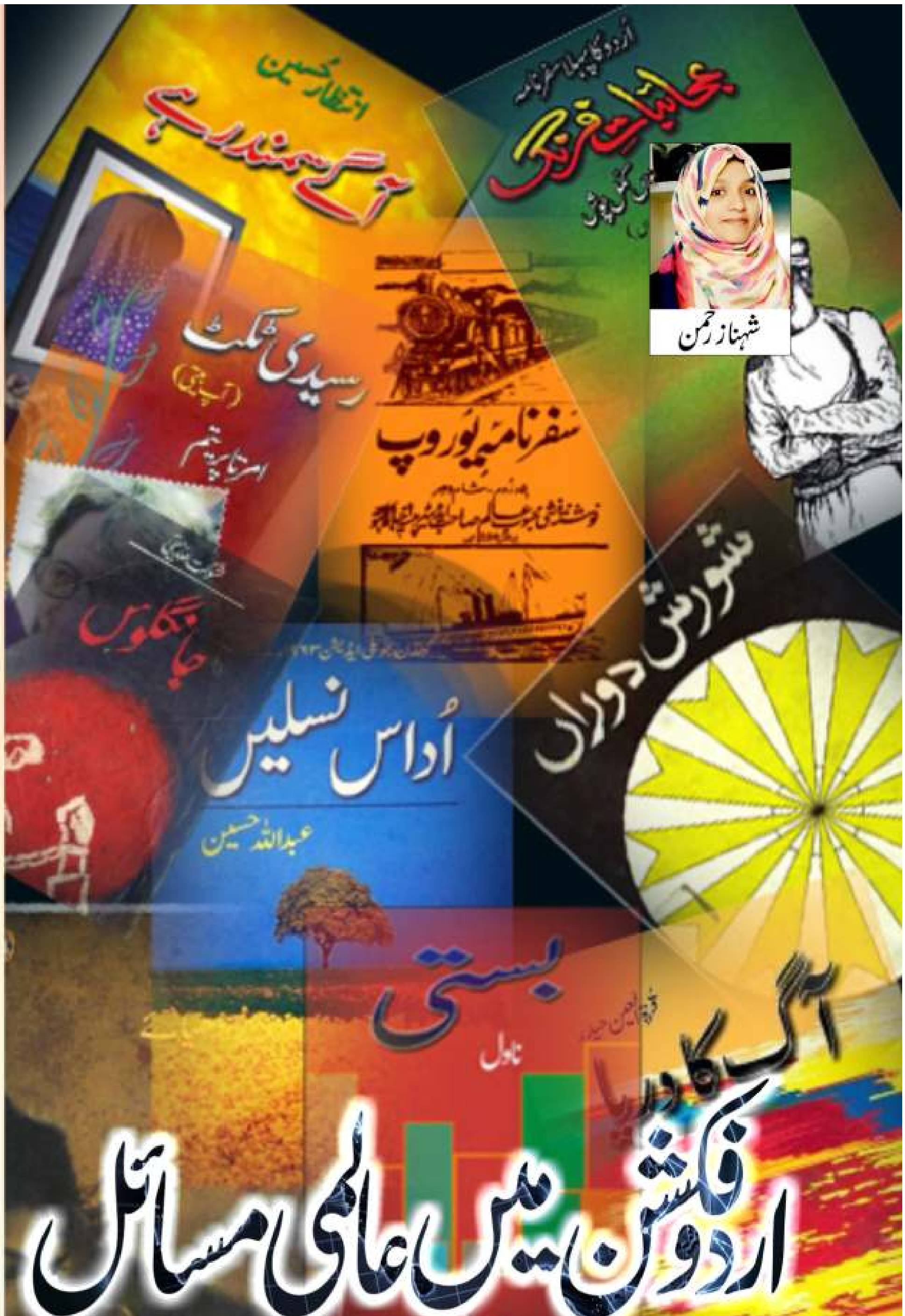

اردو فکشن میں عالمی مسائل

شہناز رحمن

ادیب اور فنکار کی نظر اگر چہ پوری دنیا کے معاملات و مسائل پر ہوتی ہے لیکن جس معاشرے میں وہ زندگی گزارتا ہے اس کی تحریروں پر اس معاشرے کا عکس غالب آنا فطری ہے۔ چونکہ فکشن کا بیانیہ صحافتی بیان سے قطعی مختلف ہوتا ہے اس لیے اردو فکشن میں قومی اور علاقائی سطح پر ہونے والے مسائل کو عالمی مسائل سے علیحدہ کر کے دیکھنے کی کوشش فکشن شعریات کے برخلاف ہوسکتی ہے۔ کیونکہ فکشن میں بعض ایسے مسائل بھی پیش کیے جاتے ہیں جو کسی ایک خطے یا علاقے سے ہوتے ہیں لیکن اس کی شدت میں تھوڑی کمی یا بیشی کر دی جائے تو عالمی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً غربت ہندوستانی معاشرے کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر مبنی دو چار افسانے ہر افسانہ نگار کے یہاں مل جائیں گے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ غربت صرف ہندوستان یا ایشیائی ممالک کا مسئلہ ہے تو یہ بات ناقابل قبول ہوگی کیوں کہ اس دنیا کا ہر خطہ اپنی اپنی سطح پر اقتصادی کشمکش سے دوچار ہے۔ اردو فکشن کے موضوعاتی تنوع کے باوجود غور کرنا ضروری ہے کہ عالمی مسائل کی نوعیت کیا ہے۔

'اردو دنیا' جنوری 2018 کے اداریہ میں لکھا گیا ہے کہ:

''ادب ہی کی وجہ سے انسان کے سینے میں سارے جہاں کا درد پیدا ہوتا ہے اور یہی درد کا رشتہ ہے جو ہمیں قوم اور ملک سے ماورا پوری انسانی وحدت اور جمعیت سے جوڑتا ہے۔ اسی لیے ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہم جن مباحث میں الجھے ہوئے ہیں کیا ان سے معاشرے کا کوئی فائدہ ہے... آج انسانی زندگی سے جو مسائل جڑے ہوئے ہیں ان میں غربت، بھکمری، تشدد، ہجرت، پناہ گزینی منطقائی تنازعے، مہلک امراض، نیوکلیائی ہتھیار، بچہ مزدوری، غذائیت کی کمی، گلوبل وارمنگ، ماحولیاتی تبدیلی، کثافت، جنگی جرائم، نسلی امتیاز اور مذہبی و ثقافتی تصادم بہت اہم ہیں۔ ان مسائل کی تفہیم کی کئی سطحیں ہیں۔ جہاں سماجی و سیاسی سطح پر ان مسائل پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔ وہیں حساس اور باشعور فنکار بھی ادبی و ثقافتی سطح پر ان مسائل کی تفہیم کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ عالمی ادبیات میں بیشتر مسائل زیر بحث رہے ہیں اور ان کے تعلق سے مضامین، افسانے، ناول لکھے جاتے رہے ہیں۔ ہمارے بیشتر ادبا انسانی ہمدردی کے احساس کے تحت ان مسائل پر نہ صرف غور کرتے رہے ہیں بلکہ اس معاشرے کی بیداری کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے ہیں مغرب میں بہت سے ناول اور افسانے انہی مسائل پر لکھے گئے ہیں... اردو زبان و ادب میں بھی انسانی حیات و کائنات کے بنیادی مسائل پر ماضی میں بھی گفتگو ہوتی رہی ہے اور حال میں بھی مکالمہ جاری ہے۔ اردو کا ایک عالمی تناظر ہے، اردو کا فنکار عالمی شعور رکھتا ہے۔ غربت، بھکمری، تشدد ہجرت اور نسلی امتیازات مذہبی تصادم وغیرہ کے تعلق سے بہت سے افسانے لکھے گئے ہیں اور اب بھی لکھے جاتے ہیں۔'' (اردو دنیا، جنوری 2018)

اداریہ کے یہ جملے نہ صرف اردو ادب کی تنگ دامنی کا شکوہ کرنے والے قارئین اور معترضین کو لمحہ فکریہ عطا کرتے ہیں بلکہ ناقدین کو بھی تلاش و جستجو کی راہ پر گامزن کرتے ہیں تاکہ ان فن پاروں کو منظر عام پر لایا جا سکے جن میں عالمی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ غور کیا جائے تو اردو شعر و ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں جو عالمی مسائل کا احاطہ نہ کرتی ہو خواہ وہ شعری اصناف ہوں یا نثری۔ قدیم ادبیات پر نظر ڈالیں تو بڑی حد تک وہاں بھی ایسے مواد کی دریافت ہوسکتی ہے جو اس عہد کے بقدر عالمی مسائل سے تعلق رکھتا ہو۔ اردو شاعری خصوصاً اردو کی نئی نظم میں شروع سے لے کر اب تک پوری دنیا میں رونما ہونے والے مسائل پر مختلف انداز سے اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے لیکن نثری اصناف یعنی خودنوشت، آپ بیتی، سفرنامے، رپوتاژ اور صحافتی تحریروں میں تجربات کے بیان کی گنجائش

زیادہ ہوتی ہے اسی لیے اردو کے کئی سفرنامے ایسے ہیں جن کے ذریعہ مغربی ممالک کے سماجی و معاشرتی احوال، ان کے مسائل و مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یوسف کمبل پوش کا سفرنامہ 'عجائبات فرنگ' منشی محبوب عالم کا 'سفرنامہ یوروپ' قاضی عبدالغفار کا 'نقش فرنگ' احتشام حسین کا 'ساحل اور سمندر' ثریا حسین کا 'پیرس و پارس' رام لال کا 'خواب خواب سفر' امرتا پریتم کی آپ بیتی 'رسیدی ٹکٹ' اور حمیدہ سالم کی یادیں 'شورش دوراں' قابل ذکر ہیں۔ ان سفرناموں اور آپ بیتیوں میں متعدد مقامات پر ایسے مشاہدات و تجربات بیان کیے گئے ہیں جن سے عام انسانی مسائل کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔

موضوع خواہ کوئی بھی ہو، ہر موضوع کے پس پشت انسان دوستی، امن و امان اور مثبت فکر کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لیے زندگی کے حقیقی احوال کا احاطہ کرنے والی اصناف میں مصنف اور قاری کے ردعمل کی گنجائش محدود ہوتی ہے جبکہ فکشن میں واقعات، کردار اور مقامات تصوراتی اور تخیلاتی ہوتے ہیں اسی لیے اس کے واقعات آفاقی پہلو رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ فکشن میں بیان کردہ مسائل میں غیر جانب داری کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ فکشن ہی ہے جو ابتدا سے لے کر اب تک مختلف مراحل سے گزرا اور اس پر مختلف تحریکوں اور رجحانات کے لیبل لگائے گئے مگر اس کے موضوعات انسان اور انسانی مسائل ہی رہے۔ انسانی مسائل کے اس بیان میں گرچہ یہ تفریق نہیں رکھی گئی کہ یہ کسی فرد کا مسئلہ ہے یا تمام عالم انسانی کا، کیونکہ فکشن کا تخیلاتی بیان اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر بات دوٹوک انداز میں بیان کردی جائے۔ دراصل یہ بات بڑی حد تک فن پارے کے اسلوب، انداز بیان اور متن میں پوشیدہ نکات اور قاری کے عندیے سے طے ہوتی ہے۔

اردو فکشن میں عالمی مسائل کی کارفرمائی شروع سے ہی رہی ہے۔ مارکسزم، سوشلزم، انقلاب روس، کوریا کی جنگ، ہیروشیما کی تباہی، عالمی جنگیں پوری دنیا کے ممالک پر مختلف انداز میں اثرانداز ہوئی تھیں۔ ان اثرات نے یوروپ کی مادہ پرست اقوام کو نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے بعض جگہ اخلاقی انقلاب کی ضرورت محسوس کی گئی اور بعض مقامات پر روحانیت کے سلسلے میں شک و تردد کی فضا مزید گہری ہوگئی لیکن ہندوستانی عوام پر اس جنگ کی وجہ سے سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ ادیب و فنکار پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل کو شوکت صدیقی نے ناول 'کمین گاہ'، قرۃ العین حیدر نے 'آگ کا دریا' میں بیان کیا ہے، ان ناولوں کا محل وقوع اگرچہ ہندوستان ہے مگر جس کشمکش کا بیان ان واقعات میں ہوا ہے اس سے دنیا کا ہر شخص دوچار تھا۔ اس وقت اقتصادی بدحالی بیشتر ممالک کا عام مسئلہ تھی جس کا اظہار اردو فکشن میں کثرت سے ہوا۔ انتظار حسین کا ناول 'بستی' انسانی ایجادات کی تمدنی تاریخ سے شروع ہوکر پاکستان کے قیام تک رونما ہونے والے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ جس میں 1971 کی جنگ سے پیدا ہونے والے حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' ایک مخصوص انداز میں عالمی مسئلے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ مصنف نے ماضی کے پس منظر میں حال کے واقعات و مسائل کو دوررس بنانے میں بڑی فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ ورنہ اخباروں کے ذریعہ ہر روز کئی ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جو تواتر کے ساتھ پوری دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں پیش آتے ہی ہیں جن سے وقتی اذیت تو ہوتی ہے لیکن پھر وہ ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ مگر عبداللہ حسین کے ناول 'اداس نسلیں'، انتظار حسین کے ناول 'آگے سمندر ہے' شوکت صدیقی کے 'جانگلوس' جیسے واقعات ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً مضطرب کرتے ہیں۔ 'جانگلوس' میں شوکت صدیقی نے Night of the great suspence اور

> **اردو فکشن میں عالمی مسائل کی کارفرمائی شروع سے ہی رہی ہے۔ مارکسزم، سوشلزم، انقلاب روس، کوریا کی جنگ، ہیرو شیما کی تباہی، عالمی جنگیں پوری دنیا کے ممالک پر مختلف انداز میں اثرانداز ہوئی تھیں۔ ان اثرات نے یوروپ کی مادہ پرست اقوام کو نئے سر سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے بعض جگہ اخلاقی انقلاب کی ضرورت محسوس کی گئی اور بعض مقامات پر روحانیت کے سلسلے میں شک و تردد کی فضا مزید گہری ہوگئی لیکن ہندوستانی عوام پر اس جنگ کی وجہ سے سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ ادیب و فنکار پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔**

قیصر تمکین نے افسانہ 'اندھیری روشنی' میں Mystery party کے حوالے سے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ اس وقت پوری دنیا میں عام ہو چکا ہے۔ 'لطف اندوزی' کے نام پر ثروت مند گھرانوں کے مرد اور عورتیں پولینیسین کلب کی راہ لیتی ہیں اور غربت و تنگدستی سے جوجھ رہی عورتیں کال گرل اور One night stand جیسے عوامل میں ملوث ہو جاتی ہیں۔ اس وقت چھوٹے چھوٹے شہروں میں کال گرلز بآسانی دستیاب ہیں۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تنگدستی اور معاشی کشمکش اگر صرف ایشیائی ممالک کے مسائل ہوتے تو یوروپ میں طوائفوں کے کارخانے کیوں کر چل رہے ہوتے۔

جنگوں کے تناظر میں لکھے گئے ناول اور افسانوں میں غربت، بھوک، دربدری، عزت و انا کی قربانی، تشدد، ہجرت جیسے موضوعات کثرت سے سامنے آئے۔ کرشن چندر نے 'ٹوٹے ہوئے تارے'، 'ڈرائیور کا خط' اور 'میں انتظار کروں گا'، احمد ندیم قاسمی نے 'ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد' 'بابا نور' اور 'سپاہی بیٹا'، رضیہ سجاد ظہیر نے امن عالم سے متعلق 'نیلی گھڑی' جیسے افسانے تحریر کیے۔ ایٹمی جنگوں کے پس منظر میں حیدر قریشی کے افسانے 'حوا کی تلاش'، 'گلاب شہزادے کی کہانی' اور 'کاکروچ' اہم ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''1980 کے وسط میں میرا ذہن بار بار ایٹمی جنگ کے امکانی خطرہ کی طرف جاتا تھا۔ بعض آسمانی صحیفوں اور مذہبی کتب میں مجھے ایک بڑی تباہی کی خبریں پڑھنے کو ملیں تو میرے اندر کی بے چینی نے مجھ سے کہانی 'حوا کی تلاش' لکھوائی۔ اس میں ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کو آسمانی صحیفوں اور مذہبی کتب کی روشنی میں دیکھنے کی کاوش تھی۔ میری یہ خواہش کہ میں رہوں نہ رہوں، نسل آدم اس دھرتی پر آباد رہنی چاہیے، اس کہانی میں کہانی تقاضے کے مطابق آئی تھی۔ اس میں ایک ہلکا سا سیاسی اشارہ بھی تھا۔ عربوں کی تیل کی دولت کی لالچ میں بڑی طاقتوں کا ٹکراؤ اور دونوں کی تباہی۔''

(ایٹمی افسانے، حیدر قریشی، معیار پبلی کیشنز، دہلی 1999، ص 4)

کشمیری لال ذاکر نے ایڈز جیسی مہلک بیماری پر ناول 'آخری ادھیائے' (2008) لکھا۔ جس سے پوری دنیا میں سیکڑوں افراد دوچار ہیں۔ انھوں نے اس بیماری کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہونے والے اخلاقی زوال کی صورتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

ماحولیات سے متعلق نیر مسعود کا افسانہ 'مارگیر' قابل ذکر ہے۔ اس میں انھوں نے درختوں کو کاٹے جانے اور اس کے فوائد سے محروم ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مصنوعی زرخیزی اور خوبصورتی کے لیے پوری دنیا میں جنگلات کو ختم کرنے کی ایک مہم چلائی گئی جس کی وجہ سے

جڑی بوٹیوں سے تیار ہونے والی دواؤں کا تصور جاتا رہا۔ افسانہ نگار نے یہ احساس دلایا ہے کہ قدرتی چیزوں کے خاتمہ اور مصنوعی اشیا کی بہتات کی وجہ سے ماحولیاتی توازن درہم برہم ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس بہاؤ کی زد سے انسانی رشتے ناطے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ جب بڑھتی ہوئی صنعتی سرگرمیوں نے جنگلات ختم کیے، انسانوں نے اپنی سہولت کے لیے پل، باندھ، کالونیاں فلک بوس عمارتیں تعمیر کرالیں، کمپنیوں سے نکلنے والے دھوئیں اور زہریلی گیسوں نے قدرتی ہریالی کھلسا کر رکھ دیا اس وقت تمام مما لک کے گرم علاقوں میں گرمی سے بلبلا رہے لوگوں نے آواز بلند کی اور ماحولیات کے تحفظ کے لیے محکمے قائم کیے گئے۔ اس پیشہ سے وابستہ کردار 'باگھ' (عبد اللہ حسین) 'خزاں کے پھول' (قیصر تمکین) وغیرہ میں موجود ہیں۔ عبداللہ حسین کا افسانہ 'فریب' اگرچہ ایک چھوٹی سی بستی لوہاراں میں پیش آنے والے واقعہ پر مبنی ہے مگر اس کے پس پشت پوری دنیا میں ہونے والی ماحولیاتی تخریب کاری کا منظر سامنے آجاتا ہے کہ کس طرح اہل زر کروڑوں عوام کی پروا کیے بغیر صرف اپنے مفاد کے لیے پانی میں زہریلے کیمیکل شامل کرنے پر ذرا بھی نہیں ہچکچاتے اور پھر اپنا کاروبار چمکانے کے لیے عوام کو مزید دھوکہ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں نہ صرف انسان بلکہ مویشی اور فصلیں تک تباہ و برباد اور بستیاں ویران و بنجر ہوجاتی ہیں۔

سمندری ساحلوں پر Mangrove forest ناپید ہوتے جارہے ہیں، سونامی کی تباہیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ Mangrove جھاڑیاں جو پانی روکنے کے لیے قدرتی ڈھال بنتی تھیں وہ انسانی ہوس کی نذر ہوگئیں۔ ڈاکٹر نجمہ محمود کے افسانے 'جنگل کی آواز' میں اس مسئلہ کے خلاف احتجاجی آواز سامنے آتی ہے۔ مذکورہ متن میں استعمال کردہ لفظیات کے جمالیاتی پہلوؤں، تہہ در تہہ معنوی امکانات اور فنی محاسن کے علاوہ اگر عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو اس متن کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اپنے اس افسانے کے ذریعہ مصنفہ نے تقریباً تمام عالمی مسائل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ میکانکی انداز میں انھوں نے مسائل کی فہرست سازی نہیں کی ہے بلکہ ایسا منظر تشکیل دیا ہے جس کی تہہ میں ان مسائل کے اسباب وعلل بھی پوشیدہ ہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ یہ کہ افسانے کا پورا ماحول قدرتی مناظر سے اس طرح مزین کیا گیا ہے کہ راوی کے ساتھ قاری پہ سحر آگیں کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ

صاف اور تازہ ہوا جس طرح مختلف بیماریوں کا علاج ہے اسی طرح روح کی سرشاری اور ذات کے عرفان کا ذریعہ بھی۔ فلیٹ اور بلند و بالا عمارت کی محبوس گلیوں کی طرح انسانی ذہن جس قدر تنگ ہوتا جا رہا ہے اس کا رمزیہ اظہار بھی اس افسانے میں موجود ہے:

''یہ صحیح معنوں میں آزاد زندگی ہے۔ پہاڑی چشمہ کی طرح آزاد۔ آزاد نفرتوں سے، منافقتوں، احسان فراموشیوں، خود غرضیوں اور مصلحت پسندیوں سے، آزاد مجبوریوں سے، دھوکے اور فریب سے، یہاں مخلص اور معصوم انسانوں کو استعمال نہیں کیا جاتا، نہ ہی ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اچھے اور نیک انسان یہاں پھول کی طرح کھلتے اور کھلتے ہیں خوشبوؤں سے جنگل کی یہ کائنات مہکتی ہے۔''

اس نے سرگوشی میں سوال کیا۔ ''جنگل جب اتنا زندگی بخش ہے تو درختوں کو لہولہان کیوں کیا جا رہا ہے؟ فطری ماحول کی تباہ کاریاں اور انجیلی نے کہا تھا'' پتہ پتہ پر خدا کا نام ہے''۔ کیا ہمیں جنگلوں کی ضرورت اس لیے نہیں کہ ہم انسان بن سکیں ریزہ ریزہ ہونے کے بجائے مکمل انسان؟''

(جنگل کی آواز، نجمہ محمود، وژن پبلی کیشنز، 2003، ص 214)

اس افسانے کے ذریعہ مصنفہ نے یہ باور کرایا ہے کہ شجر، حجر، معدنیات، ہوا، پانی، حیوانات، چرند پرند اور خود انسان اس ماحول کا حصہ ہے۔ ان تمام مخلوقات کا فطری انداز میں ہونے اور اپنے مدار میں روبہ عمل رہنے سے کائنات کا توازن بہتر رہ سکتا ہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی آبادی سائنسی انکشافات کے غلط استعمال اور قدرتی مشیت میں انسانی ہوس کی دراندازی نے سارا نظام حیات بدل کر رکھ دیا۔ اسی وجہ سے راوی کی خواہش ہے کہ انسانوں کو جنگل کی سمت بلالیا جائے۔ کیوں کہ جنگل کے پرسکون اور فسوں خیز ماحول میں بھی راوی کی یادوں سے وہ مناظر محو نہیں ہوتے جن کے سبب پورا عالم تباہی کے دہانے پہ آگیا ہے۔ اس سلسلے کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''دنیا شعلے اگل رہی ہے... معصوم انسانوں کو جنگل کی طرف بلالو... اس دہشت ناک دنیا کے درندے ان متنفسوں پر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ خطا جن کی فقط یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کو بچانے کی سعی کی ہے۔ ایک دوسرا سیلاب عنقریب آنے والا ہے اور کشتی تیار ہے نسل انساں کے تحفظ کے لیے۔ ہم آہنگی سے خائف، عشق سے متنفر، برباد شدہ دنیا ہماری جلا وطنی کی سبب جو بنی۔ درندہ صفت انسان نما شیطانوں کو سردار کوئی نہ چڑھا سکا جب کہ ہم جیسوں کو دار و رسن کی آزمائش سے گزرنا... زہر حیات پینا پڑا۔ خون کی ندیاں بہتی رہیں، دجلہ کا پانی سرخ ہوتا رہا، بارود کی بو سے فضائیں مسموم ہوتی رہیں، عزتیں نیلام ہوتی رہیں، معصوموں کی آہیں بلند ہوتی رہیں اور وہ دنیا محض تماشائی بنی رہی۔'' (ایضاً، ص 215)

نجمہ محمود نے وقت اور مقام کے تعین کے بغیر ان تمام مسائل کی طرف اشارہ کردیا ہے جو برسہا برس سے انسان کو درپیش رہے ہیں اور اس وقت بھی اخبار کی سرخیوں میں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس افسانے سے ہریالی، زرخیزی، آبشار، جھرنے اور دوسری قدرتی نعمتوں کے ساتھ پانی کے حیات بخش ہونے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ پانی کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی نہیں ایشیا، افریقہ یوروپ سمیت پوری دنیا میں ناقابل تصور حد تک سنگین ہوچکا ہے۔ بے شمار علاقے آلودہ پانی پینے پہ مجبور ہیں۔ جس کی وجہ سے مہلک بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ تیسری عالمی جنگ کی پیش گوئی پانی کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ زیرزمین پانی کی صورت حال یہ ہے کہ ٹیوب ویل لگوانے کے لیے ہزار ہزار فٹ کھدائی کے بعد پینے کے قابل پانی دستیاب ہو رہا ہے۔ جھیلیں اور تالاب سوکھ رہے ہیں اور جو باقی ہیں ان کا پانی اتنا گدلا اور آلودہ ہو چکا ہے کہ جانور بھی نہ پی سکیں۔ اردو افسانے میں اس مسئلہ پر کثرت سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا افسانہ 'پانی اور پیاس'، اختر آزاد کا افسانہ 'پانی'، صادقہ نواب سحر کا افسانہ 'میٹر گرتا ہے' پانی کی قلت سے متعلق ہیں۔ اسلم جمشید پوری کا افسانہ 'پانی اور پیاس' پانی کی طلب، شدت اور مستقبل میں پانی کی کمی پر سامنے آنے والی اذیت ناک صورتحال کی پیشگوئی سے عبارت معلوم ہوتا ہے۔ اسلم جمشید پوری کے اس افسانے سے

واضح ہوتا ہے کہ پانی کا نہ ہونا ایک بڑی آفت کی آمد کا اشاریہ ہے۔ آنے والے دنوں میں پانی کے تعلق سے جن خدشات کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ سارے عناصر اس کی تہہ میں موجود ہیں۔ اس ضمن میں قمر صدیقی کی مرتب کردہ کتاب 'پانی' بھی اہم ہے جس میں پانی کے مسائل سے متعلق مختلف نوعیت کی تحریریں جمع کی گئی ہیں اور خورشید حیات کا افسانہ 'پہاڑ، ندی، عورت' علامتی پیرایے میں اس مسئلہ کا اظہار ہے۔ ان تحریروں سے ذرا مختلف مظہر الزماں خاں کا افسانہ 'بستی' اس ضمن میں قابل ذکر ہے۔ بستی میں ایک اجنبی شخص کسی مخصوص ضرورت کے تحت تمام گھروں کے نام اور تعداد معلوم کرنے پہ متعین کیا گیا ہے لیکن کوئی بھی صاحب مکان نام بتانا تو دور پیاس بجھانے کے لیے پانی دینے کا بھی روادار نہیں ہے۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

''آپ سے ایک گزارش ہے کہ اگر ایک گلاس پانی مل جائے تو مہربانی ہوگی۔ بڑی پیاس لگی ہے۔''

پانی!'' دروازے کے پیچھے سے عورت نے حیرت انگیز آواز میں کہا۔'' آپ کس پانی کی بات کر رہے ہیں یہاں کسی بھی گھر میں پانی موجود نہیں ہے کہ سب کے سب ہر طرح کے پیاسے ہیں اور یہ پیاس روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے اور اس پر چلچلاتی ہوئی دھوپ ڈال دی گئی ہے۔''

(بستی، مظہر الزماں خاں، مطبوعہ امروز شمارہ4، ایڈیٹر ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ 2017، ص169)

مذکورہ افسانے میں پانی سے محروم رکھنے کا ظاہری سبب تو پانی کی قلت ہے لیکن اس کے بعد اگلا ہی جملہ پورے اس مکالمے کا پس منظر تبدیل کر دیتا ہے۔ جس سے سماج کی روحانی تشنگی اور محرومی کا اشارہ ملتا ہے۔ افسانہ بنیادی طور پر شناخت کے مسئلے پر مبنی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں 'شناخت' ایک اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ اس دور میں اخلاقی زوال نے رشتے ناطے کی شناخت ختم کر دی ہے۔ لوگ سماجی برتری اور کمتری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ شہری زندگی میں ایک ہی عمارت کے مکین ہونے کے باوجود ایک شخص کا دوسرے سے لاتعلق ہونا یا ایک ہی شہر کے بیشتر افراد کا ایک دوسرے سے ناواقف ہونے کا المیہ مصروفیت اور صارفی کلچر کی دین ہے۔ جرائم پیشہ افراد کی شناخت نہ ہونے کے باعث بے قصور انسانوں کی گرفتاری کا واقعہ ہر دوسرے دن رونما ہونے کی وجہ سے انسان اپنے آپ میں محدود ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح شناخت کے یہ تمام مسائل اس افسانے کے متن کا حصہ نظر آتے ہیں۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میرا اور میرے گھر والوں کا نام کیا ہے۔''... اور ہاں برائے مہربانی آپ اس گھر پہ کوئی نشان وغیرہ مت لگائیے کیوں کہ اب تک اس بستی کے ہر گھر پہ اتنے نشان لگائے جا چکے ہیں۔ اتنے نشان لگائے جا چکے ہیں کہ اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے۔ پہلے ہی کیا کم نشانات موجود تھے جو اور لگائیں جائیں اور نشانات لگا لگا کر ہمیں نشانہ بنانے کا عمل جاری ہے کہ ہر گھر سے کوئی نہ کوئی غائب ہو جاتا ہے۔'' (ایضاً، ص168)

مظہر الزماں خاں نے اس افسانے میں اختصار کے ساتھ کئی اہم مسائل کی طرف اشارے کر دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل دوسرے فکشن نگاروں کے یہاں قدرے وسیع تناظر میں موجود ہے۔ عبدالصمد کے ناول 'دھمک' کی پوری فضا سیاسی ہے جس میں سیاست دانوں کی عیاری، سماجی کارکنوں کی مصلحت اندیشی اور فرضی انکاؤنٹر وغیرہ جیسے حقائق موجودہ دور کی کشمکش کا خاکہ سامنے لاتے ہیں۔

مال و زر کی جنگ میں ہر روز پوری دنیا میں مختلف نوع کے بے شمار حادثات، بم دھماکے اور سازشی قتل کی خبریں دیکھ کر انسان اپنا ذہنی توازن کھوتا جا رہا ہے۔ رضوان احمد کے افسانے ''گیس چیمبر'' میں ایک ایسے ہی شخص کا واقعہ ہے جس کے دل و دماغ پہ دہشت ناک فضا کے اثرات اپنے نقوش ثبت کر چکے ہیں اور وہ اس طرح کے احساسات سے دوچار رہتا ہے:

''آنکھیں جل رہی تھیں اور سانس سینے میں گھٹ رہی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا۔ ساری جان سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھی۔ میری نظروں کے سامنے موت ناچ رہی تھی....
زہریلی گیس کی گھٹن سے سڑتی ہوئی سیکڑوں لاشیں...
ٹرک سے کچل کر خون سے لتھڑی ہوئی لاش/ قطار در قطار لاشیں۔ گرتی ہوئی۔ مگر سب لوگ ان کی جانب سے بے توجہ اور ان لاشوں کے گرد منڈلاتے ہوئے آدم خور لالچی گدھ۔
اپنی باری کے انتظار میں کھڑی ہوئی لاشیں...
زہریلی گیس میرے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ اب میں مرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ جینے سے بڑی کوئی سزا نہیں ہے۔''

(کن فیکون، رضوان احمد، تخلیق کار پبلشرز دہلی 1997، ص36)

جنگلات جو بارش برسانے، زمینی تخریب کاری کو روکنے، آکسیجن کی مقدار متعین کرنے، فضائی توازن برقرار رکھنے کے ساتھ جانوروں کا مسکن ہوا کرتے تھے، مفاد پرست انسانوں نے ان سے رہنے کے ٹھکانے چھین لیے۔ جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ بے شمار جانوروں کی نسلیں معدوم ہو گئیں۔ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں جانور ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ صرف نمونے کے طور پر انھیں عجائب گھروں میں قید کر کے رکھا جا رہا ہے۔ عاطف علیم کا ناول 'مشک پوری کی ملکہ' علامتی پیرایے میں اسی انسانی ہوس پر مبنی ہے۔ برسوں تک جنگلاتی تخریب کاری کے بعد جب انسانی زندگی اس کمی کی وجہ سے متاثر ہونے لگی، سیلاب اور سونامی عالمی صورت اختیار کر گئے تب مختلف اداروں ں اور ایجنسیوں نے اس کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا لیکن اس میں بھی بدعنوانیاں راہ پا گئیں۔ اس ضمن میں محمد حمید شاہد کا افسانہ 'برشور' قابل ذکر ہے جس میں قحط سالی کے بعد زراعت کے شعبہ میں آنے والی تبدیلی اور کسانوں کی کسمپرسی کو بیان کیا گیا ہے۔

ماحولیات اور دوسرے عالمی مسائل کو ڈاکٹر سلیم خان نے اپنے ناول کے بیانیہ میں شامل کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ یہی نہیں انھوں نے سازشی اور طاقتور اقوام کے چہروں کو بھی بے نقاب کیا ہے جس کی وجہ سے اس وقت کمزور ممالک آزمائشوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا ناول 'آتش صلیب' قابل ذکر ہے۔ اس ناول کا جائے وقوع 9/11 کے بعد کا امریکہ ہے۔ اس کے ابتدائی مناظر فتحیابی کے جشن پر مبنی ہیں جو عراق اور افغانستان سے جنگ اور ان ممالک کی بربادی کے نتیجے میں اسے نصیب ہوئی ہے۔ جہاں جشن سے کہیں زیادہ نئی جنگ پر عوام کو آمادہ کرنے کے لیے مجمع کو خطاب کر کے جوش و ولولہ پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس ناول کے ذریعہ مصنف نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ 'بے روزگاری' ایک عالمی مسئلہ ہے۔ صرف ہندوستان یا ایشیائی ممالک کے افراد اس اذیت سے نہیں گزر رہے

ہیں بلکہ ہر ملک کے فرد کے لیے اپنی اپنی سطح پر معاشی مسائل درپیش ہیں۔اس کا اندازہ ناول میں پیش کردہ ایک منظر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''ولیم جانتا تھا کہ ٹام بے روزگار ہے۔اس ملک میں بے روزگار کا پیٹ تو بھر سکتا ہے لیکن وہ گھر نہیں بسا پاتا۔اس لیے کہ ایسے معاشرے میں جہاں خواتین کی اکثریت برسر روزگار ہو کوئی عورت بے روزگار مرد سے بیاہ کیوں رچائے ؟ولیم چاہتا تھا کہ ٹام کو کہیں ملازمت مل جائے لیکن اس کے حلقہ احباب میں نہ جانے کتنے ٹام جیسے اعلی تعلیم یافتہ نوجوان تھے۔وہ لوگ اپنی قابلیت کی بنا پر معمولی نوکری نہیں کرنا چاہتے تھے۔معاشی کساد بازاری کے چلتے اچھی نوکری نہ ملنے کے سبب وہ دربدر کی ٹھوکریں کھارہے تھے۔''

(آتش صلیب،ڈاکٹر سلیم خان،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،2016، ص20)

اس ناول میں ایک جگہ ماحولیات کے حوالے سے زبردست احتجاج کا منظر پیش کیا گیا ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماحولیات کے تحفظ کے اصول بنانے والے تخریبی اذہان کی وجہ سے ہی جنگلات خاکستر ہورہے ہیں،گلیشیر پگھل رہے ہیں،بحری سونامی اور طوفان کے آنے کی قدرتی وجوہ ہونے کے ساتھ خود انسانی تخریب کاری بھی ہے۔اسی طرح ناول 'زر پرست سر پرست' Globalization (عالمگیریت) یعنی مغربی سائنسدانوں اور دانشوروں کے مطابق اس دنیا کی تشکیل نو۔عالم کاری اور عالمی تجارتی تنظیم کے قوانین پوری دنیا میں نافذ ہونے کے بعد جو خطرات سامنے آئے ان کا بیان اس ناول میں بڑے فنکارانہ انداز میں ہوا ہے۔اقتدار کی ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو ایک معمولی جزیرے کو دنیا کا اہم ترین سیاحتی مرکز بنانے کے لیے کوئی بھی سطحی اور غیر اخلاقی حرکت کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔معروف فکشن نگار،م۔ناگ نے اس ناول کو گلوبل زندگی کے عالمی کینوس پر نقش ونگار ابھارنے سے تعبیر کیا ہے۔

ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ،نیوکلیر اسلحہ سازی کے سامان کی فراہمی سے دہشت گردی اور تباہی کے خطرات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔امریکہ جیسی عظیم طاقتیں Nuclear strategy (جوہری حکمت عملی) پر فخر کررہی ہیں اور نئے نئے اسلحہ بنانے پر کانفرنسیں ہورہی ہیں لیکن ان ہتھیاروں کے غلط استعمال سے جو جانیں تباہ ہورہی ہیں اس پر کسی کی نظر نہیں جاتی بلکہ اسے امن وامان قائم رکھنے کے عملی اقدام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔عالمی سطح پر رونما ہونے والے مسائل کا اظہار محمد حامد سراج کے یہاں خردمشین، ایک اور داؤ، چوب دار وغیرہ میں موجود ہے۔عالم کاری اور اربنائزیشن جیسے معاملات پہ محمد حامد سراج کا افسانہ 'گلوبل ویلج' قابل ذکر ہے۔اس افسانے میں ایٹمی ہتھیاروں کی ایجاد اور اس کے ذخائر جمع کرنے والی مملکتوں پر شدید طنز کیا گیا ہے۔اس میں امریکہ کی اس نیوکلیر حکمت عملی کو موضوع بنایا گیا ہے جو اس نے ایٹمی ہتھیاروں کی ضرورت کے متعلق دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔اسی طرح افسانہ 'میکینک کہاں گیا' عالمی یوم صحت منانے والی تنظیموں پر ایک سوالیہ نشان قائم کرتا ہے کہ اس مخصوص دن پر WHO کے بین الاقوامی اور قومی سطح پر صحت کے مسائل گلوبل ہیلتھ کاؤنسل میں پیش تو کیے جاتے ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا صحت کے متعلق اس مخصوص موقع پر فکرمندی ظاہر کرنے سے مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔کیا 'میکینک' جیسے عام آدمی کی بیماری کا علاج ممکن ہے،کیا اس شخص کے لیے حکومتیں فکرمند ہوسکتی ہیں جس کے پاس کڈنی ٹرانسپلانٹیشن کے لیے وافر رقم نہیں ہے۔حامد سراج کے یہاں عالمی مسائل کی شمولیت اوپر سے لادی ہوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔کیوں کہ ان مسائل کا اظہار کرداروں کے مکالموں یا ان کی خود کلامیوں میں شامل ہے جو رواں بیانیہ کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔مثلاً افسانہ 'بے انت صحرا' میں ایک کردار کہتا ہے کہ ''ابھی تک کینسر کی طرح 'کیپلیریا' کا علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔'' اس افسانے میں ٹی وی چینل کیبل کے مضر اثرات اور اخلاقی زوال کو پیش کیا گیا ہے۔

ٹی وی پر نشر ہونے والی خبروں کے حوالے سے ڈاکٹر صبیحہ انور نے افسانہ 'بند کھڑکی' کے ذریعہ کئی مسائل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔شروع میں اس بات کا

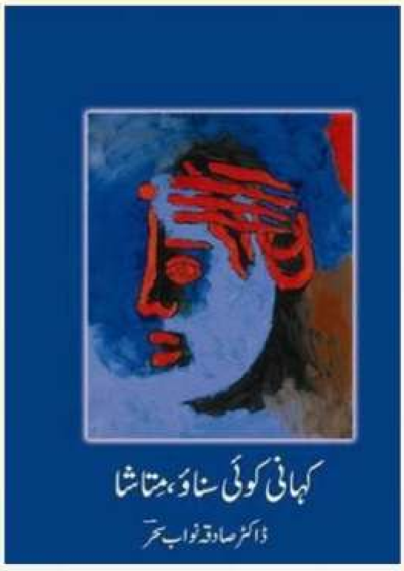

ذکر ہوا تھا کہ مسائل خواہ کسی بھی نوعیت کے بیان کیے جائیں لیکن ادبی تخلیق کی بنیادی ترجیح منفی رویوں کے خلاف احتجاج اور مثبت افکار و خیالات کی ترسیل ہوتی ہے۔چنانچہ مذکورہ افسانہ میں ڈسکوری چینل کے حوالے سے جو منظر کشی کی گئی ہے وہ علامتی پیرائے میں انسانی ہوس اور تخریبی میلانات کی روداد ہے۔اس قبیل کے افسانوں میں ذکیہ مشہدی کا افسانہ 'لاٹھیوں والے' محمد حمید شاہد کا 'جنگ میں محبت کی تصویر نہیں بنتی' اور ابرار مجیب کا افسانہ 'جنگ بند' اہمیت رکھتے ہیں۔

طبی علاج ومعالجہ اور اسپتالوں میں بدعنوانی صرف ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کا مسئلہ ہے۔ہمارے معاشرے میں بیشتر مسائل غربت و افلاس اور معاشی کمزوری کی دین ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ صارفیت نے غریبوں کی زندگی المناک بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ Pharmaceutical industries سے جو دوائیں تیار ہوکر بازار میں آتی ہیں نصف سے زیادہ منفعت کے ساتھ فروخت کی جاتی ہیں۔بعض دوائیں اتنی مہنگی ہوتی ہیں کہ مالی کمزوری کے سبب کچھ لوگ خریدنے سے قاصر رہتے ہیں۔اس سے زیادہ خطرناک یہ ہے کہ اسپتالوں میں عام مریضوں کے لیے معقول ومناسب انتظام نہیں ہوتا جس کی وجہ سے بے شمار جانیں موت کا شکار ہوجاتی ہیں۔ بیدی کے افسانے 'حیاتین ب' اور 'لاروے' میں دواؤں کی قلت اور نامناسب انتظام کے علاوہ ماحولیات سے متعلق بھی کچھ اشارے موجود ہیں۔المیہ یہ ہے کہ گلوبلائزیشن اور نئی حکمت عملی اختیار کرنے کے دو دہائی بعد بھی بے شمار ایشیائی ممالک کی کروڑوں آبادی غربت سے بھی نچلے درجے،بھکمری اور غذائیت کی کمی کا شکار نظر آتی ہے۔

صادقہ نواب سحر کا ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے۔جو مالی اعتبار سے خوشحال ہے۔لیکن ایک فرد کی کڈنی خراب ہونے کی وجہ سے پورے گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ہر چھ ماہ پر ڈائیلیسس اور پھر آخر میں کڈنی امپلانٹ کے بعد وہ خاندان financial crisis سے گزرنے لگتا ہے۔صادقہ نواب سحر کا دوسرا ناول 'جس دن سے' موجودہ عہد کے تناظر میں لکھا گیا ہے ۔اس ناول میں مسائل اور واقعات اس طرح شیر وشکر ہو گئے ہیں کہ دونوں کو الگ الگ بیان کرنا مشکل ہے۔اس میں ایک جدید معاشرہ سانس لے رہا ہے جس کے لیے امریکہ سے تجارتی تعلق بنانا اور ختم کرنا، سوفٹ ویئر ڈیل،ایچ آئی،وی ٹیسٹ،جنسی تعلقات بنانا

کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ناول کے بیان کردہ واقعات میں عالمی مسائل کے بجائے عالمی معیار اور گلوبل دنیا کی تشکیل کردہ طرز زندگی کے مکمل نمونے ملتے ہیں۔

فہمیدہ ریاض کا ناول 'کراچی' کا پس منظر اگر چہ شہر کراچی ہے لیکن بعض واقعات ایسے بھی آئے ہیں جو اس شہر کے علاوہ پوری دنیا کے کسی بھی شہر سے وابستہ کیے جا سکتے ہیں۔مجرم کی قانونی پشت پناہی، پولیس محکمہ کی بدعنوانی، سیاست دانوں کی عیاری، شہریوں کے لیے سماجی، سیاسی اور معاشی نا انصافی، اشتہار بازی کی بنیاد پر پھیلائی جانے والی صارفیت، جنسی، اخلاقی اور معاشی جرائم، بے ایمانی، بدعنوانی، گینگ ریپ، آنر کلنگ جیسے مسائل صرف 'کراچی' نہیں بلکہ برصغیر کے ہر دوسرے شہر میں آئے دن رونما ہوتے ہیں۔آنر کلنگ پہ 'کہانی کی کوہ ندا'، 'کفارہ' (ناصر عباس نیر) اور 'حجرے والی بی بی' (ثمینہ سید) کے ذریعہ ایشیا ئی معاشرے کے حیرت انگیز حقائق سامنے آتے ہیں۔

معاصر فکشن نگاروں میں مشرف عالم ذوقی ایک ایسا نام ہے جس کی افسانوی ہی نہیں بلکہ غیر افسانوی تحریریں بھی روزہ مرہ کے مسائل سے متعلق ہیں۔اس ضمن میں 'عالمی مسائل اور ہماری کہانیاں' ایک بہترین مثال ہے۔وہ ایسے فن پاروں پر مکالمہ قائم کرتے ہیں جن میں جدید تر مسائل اور مشتعل جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔نئے اور تازہ تر کی جستجو ان کا بنیادی منشاء ہے۔انھوں نے قومی اور بین الاقوامی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اپنے بیانیہ کا حصہ بنایا ہے۔

وحید احمد کا ناول 'زینو' پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسائل کا بحر ذخار ہے۔جو ادب کے روایتی قاری کو نئے فکری اور فنی تجربات سے روشناس کراتا ہے۔اس ناول میں شہنشاہیت، ملوکیت، سامراجیت، استعماریت نو آبادیاتی نظام، حکومت کرنے کی مختلف شکلیں، عالمگیریت، پوری دنیا میں معاشی بحران کا مد و جزر، نئی نئی اختراعات، پبلسٹی، اشتہار بازی کی رنگینیوں کے نتیجے میں نمودار ہونے والے ہیجان اور پوری دنیا کے معاشی، سیاسی اور تہذیبی عروج و زوال کے واقعات سے پلاٹ ترتیب دیا گیا ہے۔اس ناول کے کردار ان مسائل سے نبرد آزما نظر آتے ہیں جن مسائل سے اس وقت پوری دنیا جوجھ رہی ہے۔ان کے مکالموں کے ذریعہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر سوالیہ نشان قائم ہوتا ہے کہ دنیا میں معاشی ترقی کا توازن برقرار رکھنے کے لیے جو ادارے تشکیل دیے گئے تھے وہ عالمی معیشت پر قابو کرنے میں ناکام کیوں ہیں۔مال و زر کی ترقی انسانوں کو اخلاقیات سے عاری کیوں بنا رہی ہے۔درج ذیل اقتباس سے صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"کہانی کچھ یوں ہے کہ دنیا میں ایک سو ترانوے ممالک ہیں۔کل آبادی سوا چھ ارب کے قریب ہے۔دنیا کے صرف پانچ ممالک ساری دنیا کی معیشت چلا رہے ہیں یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان باقی ایک سو اٹھاسی ممالک ان پانچ کے باج گزار ہیں۔ان پانچ ملکوں کی آبادی ساری دنیا کا نوے فیصد ہے۔ساری دنیا کی آدھی مصنوعات ان پانچ ممالک میں پیدا ہوتی ہیں۔جدید ترین ٹکنالوجی بھی یہ پانچ ہی پیدا کرتے ہیں۔گزشتہ صدی میں ان پانچ ممالک میں معاشیات کے الگ الگ تجربے کیے گئے ہیں، جو ناکام ہوئے۔گویا دنیا میں ہر پانچواں انسان مفلس ہے۔آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک بھی ان پانچ ملکوں کی کرنسی کو بنیاد بنا کر بین الاقوامی معیشت چلاتے ہیں۔دنیا میں سو ارب لوگ نہایت غریب ہیں اور روزانہ ایک ڈالر کما کر غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔مگر لطیفہ یہ ہے کہ غریب ممالک امیر ملکوں کی کفالت کر رہے ہیں۔امیر ممالک من مانی شرائط پر غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں۔غریب ملکوں سے اجناس اور خام مال سستے داموں میں درآمد کرتے ہیں اور اپنی مصنوعات مہنگے داموں انھیں برآمد کرتے ہیں، یہ امیر ممالک اپنی پسند کے ڈکٹیٹر اور حکمراں غریب ممالک پر مسلط کرتے ہیں جو قرضے کی رقم خرد برد کر کے دوبارہ امیر ملکوں کے بینکوں میں بھیج دیتے ہیں۔امیر ممالک اس رقم کو دوبارہ قرضے کی صورت میں غریب ملکوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔اس طرح غریب ممالک قرضے کی دلدل میں دھنسے رہتے ہیں۔یہ انتہائی گھناؤنا استحصالی نظام ہے اور تم اس کے کرتا دھرتا ہو۔اکیسویں صدی شروع ہوئے تین سال گزر چکے ہیں مگر انسان ابھی تک استحصال کا شکار ہے۔یہ ترقی کی کون سی قسم ہے کہ ایک طرف انسان خلا میں چہل قدمی کرتا ہے تو دوسری طرف قحط سالی سے مر جاتا ہے۔"

(زینو، وحید احمد مثال پبلشرز فیصل آباد 2007 ص 163)

درج بالا اقتباس سے پہلے عالمی معیشت کے توازن بگڑنے پر جو سوال قائم کیا گیا تھا اس کا جواب ان چند سطروں سے بخوبی سامنے آ جاتا ہے کہ استحصالی نظام ابھی اس دنیا کا بڑا مسئلہ ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں پانی کی قلت اور آلودگی، جنگلات کے کٹنے، تیل اور معدنیات کے لیے ملکوں کے مابین کشاکش، سمندری علاقوں میں جینے والوں کے مسائل اور ماحولیاتی مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

گزشتہ صفحات میں جو مسائل بیان کیے گئے ہیں وہ عالمی سطح پر رونما ہو رہے ہیں، بڑی حد تک ان سب کا تعلق معاش سے جا کر ملتا ہے۔جنگوں، بم دھماکوں، زہریلی

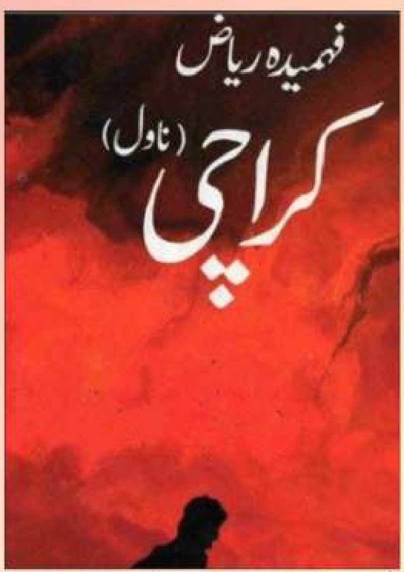

گیسوں، ایٹمی ہتھیاروں، آلودہ پانی، سیلابوں، سونامیوں اور ماحولیات کی دوسری تخریب کاریوں سے پیدا ہونے والے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے غریب عوام کے پاس اتنی مالی فراوانی نہیں ہوتی کہ اپنی مدافعت کر سکے جبکہ اہل زر اپنے پیسوں کے بل بوتے پہ بآسانی مدافعاتی انتظامات کر لیتے ہیں۔معاش کا یہ مسئلہ پوری دنیا کے عوام کے سامنے درپیش ہے اور ایشیائی ممالک میں کچھ زیادہ۔

یوں تو عالمی مسائل پر مبنی فن پاروں کی طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے لیکن موضوع کو تلاش کرتے ہوئے فنی وسائل کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔اسی لیے اس مضمون میں صرف ان فن پاروں کو زیر بحث لایا گیا ہے جو موضوع، مواد اور فنی اعتبار سے مکمل اور معیاری کہے جا سکیں۔کیونکہ عالمی مسائل کی شمولیت، اس پر مبنی پلاٹ کی ترتیب، کرداروں کے درمیان مکالمے اور فضا سازی کا مرحلہ اتنا آسان نہیں کہ ہر مصنف اسے فن کاری سے نبھا سکے۔اس کے علاوہ افسانوی بیانیہ میں توازن اس طرح قائم رکھنا کہ مسائل کا بیان اخباری رپورٹ یا صحافتی واقعہ کی صورت نہ اختیار کرے۔اس طرح کے موضوعی مطالعات میں یہ آزمائش ہمہ وقت چلتی رہتی ہے کہ فن پارہ مطلوبہ موضوع پر مبنی ہونے کے ساتھ فنی اصولوں کا بھی پابند ہوگا یا نہیں۔پیش نظر مضمون میں موضوع کی تحدید کی وجہ سے گرچہ زیر بحث افسانے اور ناولوں کے فنی جہات کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے لیکن معیار کا خیال ضرور رکھا گیا ہے۔

■

Shahnaz Khatoon (Shahnaz Rahman)
C/o Syed Ziya Imam
C-4/3, Suroor Apartment
Sir Sayyed Nagar
Aligarh - 202002 (UP)

الطاف احمد

اردو سفرناموں میں عالمی امن اور انسان دوستی کا پیغام

(آزادی کے بعد)

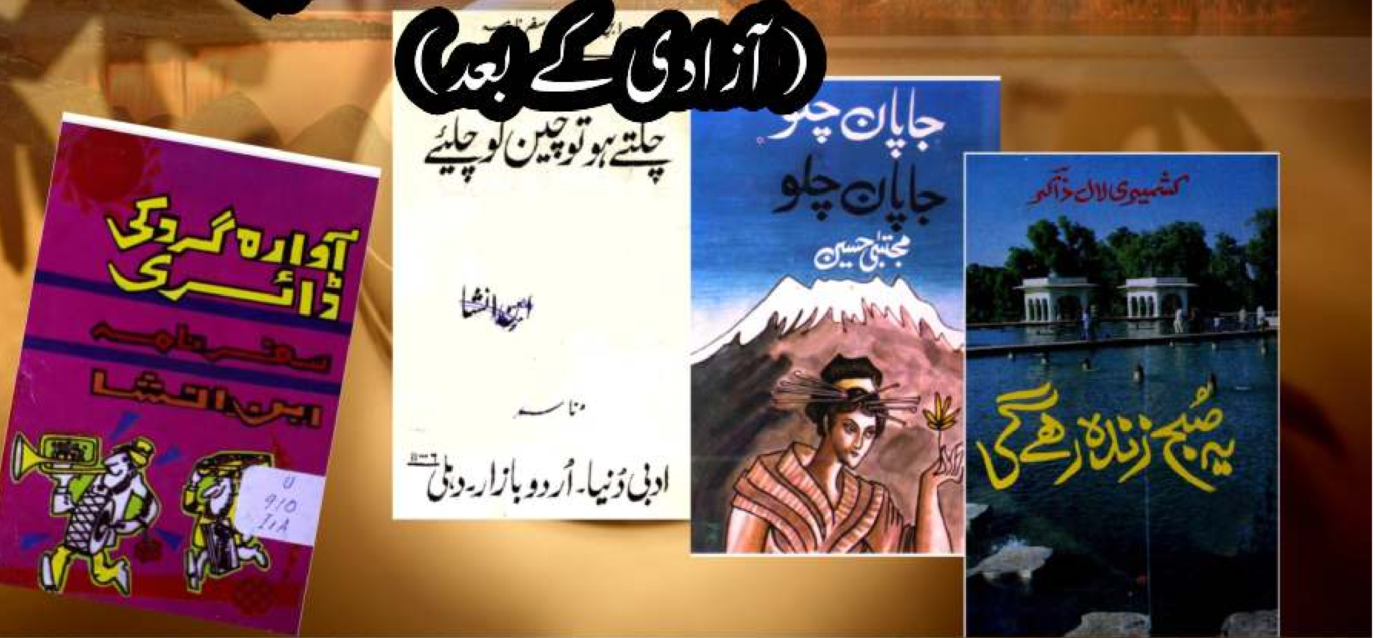

زبان آوازوں اور لفظوں کے مجموعے کا ایک ایسا نام ہے جو انسانوں کو آپس میں جوڑے رکھنے کا کام کرتی ہے۔ کیونکہ زبان کی مدد سے ہی انسان اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے اور ادب کسی بھی زبان کی شستہ و شائستہ تحریروں کا نام ہے۔ ادب کے بارے میں ایک بات ہمیشہ کہی جاتی ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے سماج میں جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے ادب کے ذریعے ہی ہم تک پہنچتا ہے۔ ادب کو اگر سماجی آگہی کا وسیلہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ ادب انسان کو زندگی کی حقیقتوں کی سیر کراتا ہے۔ سماج میں جو کچھ اچھا یا برا، مناسب یا غیر مناسب، سچ یا جھوٹ، حق یا باطل پیش ہوتا ہے ادب اس کی ہو بہ ہو عکاسی کر کے ایک عام قاری تک پہنچا دیتا ہے تاکہ وہ غور و فکر کر کے اس گتھی کو سلجھا دے۔ ادب کا کام سماج کو آئینہ دکھانے کا ہے اور پھر یہ سماج میں رہنے والے اشخاص کے ذمے ہے کہ وہ سماج کو کتنا بناتا اور سنوارتا ہے۔ دنیا میں اس وقت مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور ہر زبان میں ادب کی اشاعت ہو رہی ہے۔

زبانوں میں سے ایک زبان اردو زبان ہے جو اپنے وسیع ولامحدود سرمائے کی بدولت دنیا کی بلند پایہ زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ نہ صرف زندہ و جاوید، دلکش و شیریں، خیر سگالی و اتحاد پسندی، رواداری، آشتی اور انسانیت سے عبارت بھائی چارے کی زبان ہے بلکہ زبانوں کی تاجدار بھی ہے شاید اسی لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو کہنا پڑا 'اردو، زبانوں کا تاج محل ہے۔' زبان و ادب کے عالمی امن میں کردار کے حوالے سے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ ایک ادیب کی لکھی ہوئی تحریر اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلے ہی بیان ہوا کہ زبان احساسات و جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ایک ادیب امن کا پجاری ہوتا ہے۔ اس میں انسان دوستی، رواداری، جذبہ اتحاد، قوت برداشت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ دنیا کا سب سے امن پسند انسان بھی ایک ادیب و شاعر ہے جسے ہر وقت یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ کس طرح دنیا کے تمام انسان امن و آشتی سے رہیں۔ جس کی مثال اردو زبان کے ان چند اشعار میں دیکھنے کو ملے گی۔

تمام دھرتی پے بارود بچھ چکی ہے خدا
دعا زمیں کہیں دے تو گھر بناؤں میں
زمیں کو اے خدا وہ زلزلہ دے
نشاں تک سرحدوں کے جو مٹا دے
محبت میں بدل جائے سیاست
خدا لاہور دلی سے ملا دے

نہ ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
بہتر ہے کہ نہ ڈالو ستاروں پے کمندیں
انساں کی خبر لو کہ وہ دم توڑ رہا ہے

درج بالا اشعار میں جس امن کی بات کی گئی ہے اس سے مراد عالم میں ایک ایسی کیفیت کی تشکیل ہے جہاں تمام افراد کے معاملات و واقعات معمول کے ساتھ بغیر کسی تشدد اور اختلاف کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جہاں معاشرے کے تمام افراد کو سماجی،

معاشی، مساوات اور سیاسی حقوق وتحفظ حاصل ہوتے ہیں اور اس کی غیر موجودگی سماج میں بگاڑ کا باعث ہوسکتی ہے۔ یہاں سے یہ بات روشن ہوگئی کہ عالم میں امن کا قیام کس حد تک ضروری ہے۔

سفر نامہ کی تعریف کرنا بھی اس لیے ضروری ہے کیونکہ ابھی تک بیشتر طلبہ و طالبات اس صنف سے ناواقف ہیں۔ سفر نامہ ایک ایسی بیانیہ صنف کا نام ہے جس میں ایک سیاح اپنے سفر کے دوران کے حالات و واقعات کو تحریری صورت میں پیش کرتا ہے۔ میں اسے ایک ایسی صنف سمجھتا ہوں جس میں ایک مسافر اپنی زبان میں متعلقہ ملک کی جس کا وہ سفر کر رہا ہوتا ہے تہذیب و معاشرت کو بیان کرتا ہے اور اپنے ملک کی عوام کو اپنے مثبت یا منفی تاثرات سے غائبانہ طور پر اس ملک کا عاشق یا حاسد بنا دیتا ہے۔ سفر کے مقاصد میں ایک یہ بھی شامل ہے کہ دو ملکوں کے درمیان صلح کرائی جائے اس لیے سفر نامہ نگاروں نے زیادہ تر اپنے سفر ناموں میں اس طرح اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے کہ دو ملکوں کے درمیان صلح کا باعث ہو۔ شاید اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے سفر نامہ کو دو ملکوں کے درمیان میں پل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آیئے اب دیکھیں کس طرح سے اردو زبان کے ان سفر نامہ نگاروں نے عالمی امن میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

1945 کے بعد دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا مقصد دنیا میں امن کا قیام تھا لیکن اسی سال امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرا کر نہ صرف دنیا کے ترقی یافتہ Developed nations ممالک کو Arms race میں لگا دیا بلکہ ترقی پزیر ممالک بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اب دنیا ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے کہ اگر ایک اور جنگ ہوتی ہے تو پوری دنیا تباہ و برباد ہوسکتی ہے۔ اردو کے سفر نامہ نگاروں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے انھیں یہ جنگ و جدل اور ایٹمی دنیا میں انسانوں کی تباہ کاری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ اور ایسے میں اگر انھیں کوئی آواز متاثر کرتی ہے تو وہ ہے امن کی آواز جس میں ابدیت ہے جو نہ صرف آپسی دوستی اور رواداری کو فروغ دے گی بلکہ قوموں کی ترقی اور خوشحالی کی بھی ضمانت ہے۔ کشمیری لال ذاکر اپنے سفر نامہ 'یہ صبح زندہ رہے گی' میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گولی کی آواز ہمیشہ مر جاتی ہے۔ صرف ایک ہی آواز کو ابدیت حاصل ہوتی ہے اور وہ ہے امن کی آواز اور اس آواز کا خالق وہی شخص ہوتا ہے جو الفاظ کو جوڑ جوڑ کر دھیرے دھیرے اپنی بات کہتا ہے۔ چیختا ہے مگر دھاڑتا نہیں۔'' (یہ صبح زندہ رہے گی، کشمیری لال ذاکر، ص 21)

ابن انشا کا شمار اردو کے اہم سفر نامہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے یکے بعد دیگرے کئی سفر نامے لکھ کر اردو سفر نامہ نگاری کی تاریخ کو فروغ دیا ہے۔ ابن انشا ایک مزاح نگار ہیں اس لیے انھوں نے اپنے مزاحیہ انداز میں ایسی ایسی باتوں کو پیش کیا ہے جو قابلِ اصلاح تھیں۔ ان کے سفر ناموں میں بھی عالمی امن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنے سفر ناموں کے ذریعے انسان دوستی، رواداری، اتحاد، خیر سگالی اور عدم تشدد کا درس دیتے ہیں۔ اور اس کے لیے انھوں نے طنز و مزاح کا سہارا لیا ہے۔ ان کا یہ اقتباس انسان کا انسانیت کے درجے سے گرنے اور آپسی رنجش و تشکیک کو پیش کرتا ہے:

''اس زمانے میں سفر کا ایک لطف یہ بھی تھا کہ نور کے تڑکے کسی نئے شہر کے دروازے پر پہنچ اور وہاں کا بادشاہ لاولد مرا تو لوگ پکڑ کر سر پر تاج بھی رکھ دیا کرتے تھے..... اب تو شہر کا دروازہ کھولنے سے پہلے ویزا دیکھتے ہیں، ہیلتھ سرٹیفکیٹ کا پوچھتے ہیں۔ مسافر کا بقچہ کھولتے ہیں کہ پیش کر غافل کوئی عمل اگر دفتر میں ہے۔''

(نگری نگری پھرا مسافر، ابن انشا، ص 72)

انھیں انسان انسانیت کی معراج سے اس قدر گرا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں وہ جانوروں سے بھی بدتر اور ذلیل تر دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ انسان کا انسان کو بدتر سمجھنا اور اس کا استحصال کرنے کو قرار دیتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت بھی ہے موجودہ دور جس میں ہم اور آپ رہ رہے ہیں لالچ اور خود غرضی کا دور ہے۔ یہاں انسان اپنے مفاد کے لیے دوسروں پر ظلم کرتا ہے۔ دوسروں کے ہاتھوں سے نوالے چھین کر اپنا اور اپنے اہلِ خانہ کا پیٹ بھرتا ہے اور ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ جانور بھی اسے دیکھ کر شرماتے ہیں۔ ابنِ انشا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ سچ ہے کہ بعض لوگوں کو اس شجرے کے صحیح ہونے میں شک ہے..... لیکن بندر تو قریب قریب سب کے سب ڈارون کی اس تحقیق پر ناخوش اور ناراض ہوں گے..... وہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری اولاد ہوتی تو ایسی چھچھوری حرکتیں کبھی نہ کرتی۔ بندروں میں نابرابری اور استحصال کہیں نہ ملے گا۔'' (نگری نگری پھرا مسافر، ابن انشاء، ص 162)

ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں اگر ابنِ انشاء کے اس ایک اقتباس پر توجہ کی جائے تو دنیا میں امن قائم ہونے میں دیر نہیں لگتی:

''زمانہ شجاعت کی اکثر کہانیاں اور وارداتیں جھوٹ سہی لیکن باتیں کتنی اچھی تھیں۔ جنگجو لوگ پہلے مخالف کو وار کرنے کی دعوت دیتے تھے کہ پہلے آپ۔ وہ بھی نسب کا اصیل ہوتا تھا پہلے آپ سے جواب دیتا تھا..... آج کے لوگوں سے آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ طبل جنگ بج رہا ہو اقوام متحدہ کے سبھی ممبران چھتریاں لگائے کالے چشمے پہنے تھرماس کندھے سے لٹکائے ہمہ تن اشتیاق کھڑے ہیں اور امریکہ اور روس اپنے ہاتھوں میں ہائڈروجن بم لیے آمنے سامنے کھڑے تکلف کر رہے ہیں اجی پہلے آپ، اجی پہلے آپ۔''

(نگری نگری پھرا مسافر، ابن انشاء، ص 205)

عصر حاضر میں ہی نہیں بلکہ صدیوں سے مذہب کو بنیاد بنا کر لوگوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے آئے دن یہ خبریں نشر ہوتی ہیں کہ فلاں مذہب کے آدمی کو فلاں مذہب کے آدمی نے قتل کر دیا اس کی کیا وجہ ہے۔ انسان کا مذہب اس کا اپنا انفرادی عمل ہے جس پر کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا ہے یہاں تک کی مذہب کی کتابوں میں بھی اس کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اسلام میں جہاں اپنے مذہب پر چلنے کی تلقین کی گئی ہے وہیں دوسروں کے مذہب کا احترام کرنے کو بھی کہا گیا ہے۔ ہمسائے کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر مذہب کی کتابوں میں مذہب کے نام پر لڑنے، کسی پر ظلم و ستم کرنے، کسی کا حق تلف کرنے سے منع کیا گیا ہے تو پھر لوگ اس طرح مذہب کے نام پر کیوں مر مٹ رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین جاپان کے سفر پر ہیں اور وہاں ان کو ہیروشی ایما مورا کے گھر دعوت پر جانا ہوا وہاں انھوں نے جو منظر دیکھا اور قاری کو دکھایا ہے اگر اس طرح کی صورت حال پیدا کی جائے تو مذہب کے نام پر جو آئے دن فسادات ہوتے ہیں وہ جھگڑا کسی حد تک کم ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان سے میں نے پوچھا 'آپ کا مذہب کیا ہے' بولے عیسائی ہوں۔ ان کی بیوی کے مذہب کے بارے میں پوچھا تو اپنی اہلیہ کو باورچی خانہ سے طلب کر کے پوچھا 'تمہارا مذہب کیا ہے' ہماری جستجو اور بے تکے سوالات کے باعث مسٹر ایما مورا کو پہلی بار پتہ چلا کہ ان کی اہلیہ محترمہ کا مذہب کیا ہے۔ اگر ہم ان کے گھر نہ جاتے تو اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں ان کے معلومات میں اتنا اضافہ کیونکر ہوتا..... ان کے ہاں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی ان سے پوچھا کہ اُن کا مذہب کیا ہے۔ اس نے اچانک اپنی بائیں آنکھ کی پتلی کو نیچے کیا اور دائیں آنکھ کی پتلی کو اوپر لے جا کر سوچنا شروع کیا.....

بولی۔عجیب سوال ہے میں نے ابھی اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔جب مذہب کی ضرورت لاحق ہوگی تب سوچا جائے گا۔'' (جاپان چلو جاپان چلو،مجتبیٰ حسین،ص 92-91)

اس اقتباس کے ذریعے مجتبیٰ حسین اصل میں یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح ایک ہی چھت کے نیچے بسنے والے لوگ مذہب کے مسئلے سے بیگانے ہو کر اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔اسی کو انھوں نے جاپان کی ترقی اور خوشحالی کی دلیل کہا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ مذہب کے نام پر جن جن ممالک میں آئے دن فسادات ہوتے ہیں ان کی ترقی کے آثار بہت کم ہیں۔اس طرح کے واقعات بیان کر کے سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفرناموں میں کئی صفحات ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ قاری کو اس طرح کی باتیں بتا کر ان میں اس طرح کے جذبات کو پیدا کیا جائے جن سے دنیا میں امن و آشتی،سکون اور خوشحالی کی فضا قائم ہو۔ایسا ہی ایک اقتباس جمیل زبیری نے جن کا تعلق پاکستان سے ہے ہندوستان کے سفر کے دوران نقل کیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

''وہاں مسلمانوں کو کوئی دن رات ان کے فرائض یاد نہیں دلاتا۔وہاں کسی ہندو کو پوجا پاٹ کرنے کی تلقین نہیں کی جاتی۔وہاں کسی سکھ سے یہ نہیں کہا جاتا کہ تمھارے مذہب میں داڑھی رکھنا،کڑا پہننا اور کیس بڑھانا فرض ہے۔وہاں کوئی کسی ڈیوڈ کو نہیں ڈانٹتا کہ تم اتوار کو گرجا کیوں نہیں جاتے۔''

(موسموں کا عکس،جمیل زبیری،ص 93-92)

عصرِ حاضر میں پوری دنیا میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ مذہب کے نام پر مختلف فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے اردو سفرنامہ نگاروں نے دنیا میں امن و امان قائم کرنے پر زور دیا ہے۔تاکہ انسانیت پھر سے انسان میں جاگ اٹھے اور عالمی رواداری اور بھائی چارہ قائم ہو۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی اپنے سفر پاکستان کے دوران اس طرح رقمطراز ہیں:

''لاہور کی سیر کرنے والا یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ پاکستانیوں نے اس شہر میں رہتے ہوئے جو ہندوؤں اور سکھوں سے بالکل خالی ہو چکا ہے کبھی انفرادی یا اجتماعی طور پر یہ کوشش نہیں کی کہ وہ اپنے مکانوں اور دکانوں سے گلیوں اور محلوں سے،سڑکوں اور بازاروں سے سکھوں اور ہندوؤں کے نام و نشان مٹا دیں۔کرشن نگر اب تک کرشن نگر ہے،گنگا رام اسپتال ہنوز گنگا رام اسپتال ہے اور بخشی رام مارکیٹ اس وقت بھی بخشی رام مارکیٹ ہے۔''

(سیر و سفر،سفرنامہ لاہور و حیدرآباد،ڈاکٹر تنویر احمد علوی،ص 92)

سفرنامہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس کا مقصد ہی دو ملکوں کے درمیان صلاح اور امن کو قائم کرنا ہے۔یہ سب کچھ ایک ادیب پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح اپنے اس مقصد کو پیش کرتا ہے۔اردو میں بہت سے سفرنامہ نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے سفرناموں کے ذریعے اپنے اس مقصد کو برتنے سے کوتاہی کی اور ان کی تخلیقات تعصب اور تنگ نظری جیسی اصطلاحات سے عبارت کی جاتی ہے۔اس طرح اگرچہ وہ سفرنامہ نگاروں کی صف میں کھڑے ہو گئے مگر وہ مقام و مرتبہ نہیں پیدا کر سکے جو بہت سے سفرنامہ نگاروں کو حاصل ہے۔سفرنامہ نگار کو چاہئے کہ اپنے سفر کے دوران جو جو منفی تجربات پیش آئیں ان کو نظر انداز کرتے ہوئے مثبت پہلوؤں کو پیش کرے تاکہ پڑھنے والے کو لگے کہ واقع جس ملک کا سفرنامہ نگار نے سفر کیا ہے وہاں کے لوگوں کے خصائل ہم سے اچھے ہیں اور وہ بھی اس طرح بننے کی کوشش کریں۔اردو کے بہت سے سفرنامہ نگاروں نے جہاں جہاں کا سفر کیا وہاں کی محبت،ہمدردیاں انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے تصویروں کی صورت میں اتار دی ہیں۔ڈاکٹر کیول دھیر ہندوستان کے رہنے والے ہیں انھیں پاکستان میں جو ہمدردیاں،خلوص اور محبت ملتی ہے وہ اس کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں:

''میں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ میں اجنبی نہیں ہوں،مہمان بھی نہیں ہوں۔جیسے اس گھر کا فرد ہوں۔بشریٰ کی ہر بات میں پیار تھا،اپنے پن کا احساس تھا۔'' (خوشبو کا سفر،ڈاکٹر کیول دھیر،ص 42)

اور مجتبیٰ حسین اس پیار و محبت کو ایک ایسی شے تصور کرتے ہیں جسے سرحدوں پر کسٹم ڈیوٹی سے مفت پاتے ہیں:

''یوں بھی ٹوکیو میں ہمیں جاپانیوں کی محبت اور خلوص کے سوا کچھ نہیں خریدنا تھا کیوں کہ یہی وہ شے ہے جس پر وطن عزیز میں کسٹم والے کوئی ڈیوٹی نہیں لگاتے۔''

(جاپان چلو جاپان چلو،مجتبیٰ حسین،99)

رفعت سروش اپنے سفر پاکستان کے دوران اس طرح رقمطراز ہیں:

''میرے کرم فرماؤں نے مجھے محبت اور خلوص کے آب حیات میں نہلا دیا۔کوئی صبح ایسی نہ تھی جو احباب کی محبت کی خوشبو کے بغیر طلوع ہوئی ہو اور کوئی شام ایسی نہ تھی جب قدر دانوں اور خلوص نے میرے گلے میں باہیں نہ ڈالی ہوں۔'' (یادوں کے چاند ستارے،رفعت سروش،ص 7)

ان اقتباسات کو یہاں پیش کرنے کا یہ مقصد ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کے دوران سفرنامہ نگاروں کے لیے محبت و خلوص وہاں کی قیمتی شے ہے۔

کشمیری لال ذاکر کا شمار اردو کے اچھے افسانہ اور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش پاکستان میں ہوئی وہاں کی مٹی سے انھیں اس قدر جذباتی لگاؤ ہے کہ تقسیم کے بعد بھی اس لگاؤ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انسان کو انسانوں سے وقتی طور پر جدا کیا جا سکتا ہے لیکن دائمی طور پر اس کے اندر موجود محبت،خلوص کو شکست نہیں دی جا سکتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس:

''دل تو میرا ابھی چاہتا ہے کہ میں پاکستان جاؤں اور ان جگہوں کو دوبارہ دیکھوں جن سے میری جذباتی وابستگی تھی اور ان دوستوں سے ملوں جن کے ساتھ میں نے لکھنا شروع کیا۔''

(یہ صبح زندہ رہے گی،کشمیری لال ذاکر،ص 23)

تقسیم کا سانحہ ہندوستان کی تاریخ میں وہ سیاہ اور بدنما داغ ہے جس کا ذکر اردو ادب ہی نہیں دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود ہے۔اس تقسیم نے نہ صرف ہندوستان کو زمینی سطح پر دو حصوں میں تقسیم کیا بلکہ یہاں کی عوام کو بھی تقسیم کر دیا۔اردو میں اس کا تذکرہ منٹو،عصمت،کرشن چندر،قرۃ العین حیدر،انتظار حسین، وغیرہ نے کیا ہے۔ اردو کے سفرنامہ نگاروں نے تقسیم کے اس سانحے کی تردید کی ہے اور اسے ایک انسانیت سوز مسئلے سے تعبیر کیا ہے کیوں کہ اس تقسیم نے دونوں طرف ایک وحشت کا عالم برپا کر دیا تھا۔لوگوں کا قتل و عام،عصمت دری،نقل مکانی کی داستان ان سفرنامہ نگاروں نے اس طرح بیان کی ہے کہ وہ نہ صرف خود روئے بلکہ قاری کو بھی اپنے ساتھ رلاتے ہیں۔اس مسئلے نے اس وقت ایک عالمی مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔جس نے کئی دوسرے مسئلوں کو جنم دیا ہے۔کشمیری لال ذاکر اپنے سفرنامہ 'یہ صبح زندہ رہے گی' میں یوں رقمطراز ہیں:

''یہ جو تقسیم کا اتنا بڑا المیہ تھا اس کا باعث تو یہی تھا جس نے جو کہہ دیا دوسروں نے سچ مان لیا۔تجزیہ کرنے والا کون تھا ؟ کوئی نہیں تھا۔سب بہکاوے میں آنے کو تیار تھے۔بات بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ رات کی رات میں صدیوں کے پڑوسی مرنے مارنے پر تیار ہو گئے.... گھر خالی ہو گئے،آنگن اجڑ گئے،چھتیں ویران ہو گئیں،کھیت جل گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورا ملک تلوار کی دھار سے کٹ گیا۔''

(کشمیری لال ذاکر،یہ صبح زندہ رہے گی،ص 18)

عبدالماجد دریابادی اپنے سفرنامے 'ڈھائی ہفتے پاکستان میں' میں اس تقسیم سے ہوئے دونوں طرف قتل عام،ظلم و جبر،عصمت دری کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''کتنے معصوم بچوں اور بچیوں کا معصوم خون اس سر

زمین میں جذب ہوا ہوگا۔ کتنے بوڑھے اور بوڑھیوں کے لاشے اس علاقے میں تڑپ تڑپ کر سرد ہوئے ہوں گے۔ کتنی عصمتیں دن دہاڑے بیدردی سے لٹی ہوں گی۔"

(عبدالماجد دریابادی، ڈھائی ہفتے پاکستان میں، ص 13)

ہندوستان اور پاکستان ایک ہی ماں کے دو گمشدہ بچے ہیں۔ جو انجانے میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ دونوں ملکوں کی تہذیبیں ایک ہیں، سماجی قدریں ایک ہیں، بولی ایک ہے، دونوں ملکوں کے رہن سہن، رسم و رواج ایک ہیں، دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے عزیز بستے ہیں جو ایک دوسرے سے ملنے کے اشتیاق میں اس جہاں سے رخصت ہو گئے لیکن اس کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان ایک سرحد کے کھنچ جانے سے ان میں اس قدر دوری بڑھ گئی کہ لندن اور نیو یارک کا سفر کرنا آسان مگر ان ملکوں کی سرحدوں کو عبور کرنا بہت مشکل ہے۔ اردو کے سفر نامہ نگاروں نے سرحدوں کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ ان سرحدوں پر کھڑے دو سپاہیوں کی وجہ سے ملکوں کے درمیان اس قدر دوری پیدا ہوگئی ہے کہ آگ پر گزرنا آسان ہوتا ہے لیکن سرحدوں پر سے بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے نکلنا بہت مشکل۔ صالحہ عابد حسین اس حوالے سے امن کا پیغام دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"کیا کوئی دن آئے گا میری زندگی میں نہ سہی بعد میں ہی آئے۔ جب ہم دو ملک ہوتے ہوئے بھی دلوں سے نفرت بالکل باہر نکال دیں گے۔ تعصب کی جگہ خلوص اور اعتماد لے گا۔ الفت زمیں کے ٹکڑوں سے نہیں اس کے باسیوں سے ہوتی ہے۔"

(صالحہ عابد حسین، سفر زندگی کے لیے سوز و ساز)

انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ شعور، احساس اور ادراک ایسی تین چیزیں ہیں جو اسے جانوروں سے الگ کرتی ہیں۔ اس کے اندر خیر اور شر دونوں کا مادہ رکھا گیا ہے۔ شر سے بچنے کے لیے اسے دوزخ کا خوف رکھا گیا ہے اور اچھائی کا بدل جنت ہے۔ اب انسان کیا کرتا ہے یہ اس پر منحصر ہے۔ انسان کی پیدائش سے لے کر آج تک فسادات کا سلسلہ جاری ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کا پہلا فساد پیغمبروں کی اولادوں کے درمیان ایک عورت پر ہوا۔ شاید ہابیل اور قابیل کا واقعہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ دنیا میں مختلف طرح کے مسئلوں کو بنیاد بنا کر عالمی امن و بھائی چارے کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ جن میں مذہبی، سیاسی، خواتین کے ساتھ نابرابری، تعصب و تنگ نظری عالمی دہشت گردی، فرقہ پرستی اور نسلی تعصب وغیرہ اہم ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے زیر اثر دنیا جس قدر نزدیک آتی جا رہی ہے اور Global village کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ اسی قدر ان مسائل کی وجہ سے دوریاں بڑھ رہی ہیں۔ نسلی تعصب کا مسئلہ اس قدر شدت اختیار کر چکا ہے کہ اس سے امن پر منفی اثرات پڑھ رہے ہیں۔ اردو کے سفر نامہ نگاروں نے بھی اس مسئلے کو اپنے سفر ناموں میں ابھارا ہے اور اس طرح کا تعصب کرنے والے ممالک کو بے نقاب کیا ہے جو رنگ کے نام پر، نسل کے نام پر، فرقوں کے نام میں انسانوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر پھوٹ کو جنم دیتے ہیں۔ سید احتشام حسین کے اپنے سفر نامہ 'ساحل اور سمندر' میں اس مسئلے کو یوں بیان کیا ہے:

"جس شخص کو بھی امریکہ کے متعلق غور کرنے یا پڑھنے یا جا کر اپنی آنکھوں سے وہاں کے حالات دیکھنے کا موقع ملا وہ حبشیوں کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے کیونکہ یہ امریکہ کے دامن پر ایک ایسا دھبہ ہے جو ہر وقت صاف نظر آتا ہے..... وہ علم و فضل، موسیقی اور اداکاری، ادب اور فن میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن نسلی امتیاز کے اندھے تصورات نے انھیں ذلیل بنا رکھا ہے۔ بعض علاقوں میں ان کے اسپتالوں، اسکولوں اور کالج، محلے اور گاؤں بالکل الگ ہیں اور ان سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔" (سید احتشام حسین، ساحل اور سمندر، ص 360)

زبان اظہار بیان کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔ زبانیں اپنی تاثیر، اپنی شیرینی، اپنی دلکشی اور جاذبیت کی بدولت پہچان بناتی ہیں مگر زبانوں کو بنیاد بنا کر بھی عالمی امن کو بگاڑنے کی کوشش کی گئی۔ اردو زبان اس وقت دنیا کی ان گنی چنی زبانوں میں شمار ہوتی ہے جو اپنی بین الاقوامی پہچان بنا چکی ہے۔ اس کے بولنے والے دنیا کے مختلف ممالک میں پائے جاتے۔ اس کا ثبوت اردو کی وہ نئی بستیاں ہیں جہاں سے اردو کے اخبار، رسائل و جرائد شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کو جاپان کے سفر کے دوران وہاں کے ایک ریڈیو اسٹیشن پر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے انچارج کو طوطی کی طرح اردو زبان میں بات کرتے ہوئے پا کر اس کے متعلق سوال کرتے ہیں تو اس انچارج کا جواب تھا وہ سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ اگر اس طرح کی پالیسی اپنائی جائے تو زبانوں کو بنیاد بنا کر جو آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں وہ جھگڑا کسی حد تک ختم ہو جاتا۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس:

"قبلہ یہ اردو اور ہندی کے جھگڑے آپ کے ملک کو مبارک ہوں۔ ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا..... ہم جاپانی کاروباری آدمی ٹھہرے۔ ہم نے دل میں سوچا کہ اے کاش ہمارے ملک میں بھی لوگ زبانوں کے معاملے میں کم از کم اتنے ہی کاروباری ہوتے تو ہندی اور اردو کا جھگڑا نہ ہوتا۔"

(مجتبیٰ حسین، جاپان چلو جاپان چلو، ص 50-49)

اردو کے سفر نامہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں انسان دوستی، عالمی امن، بھائی چارے، بین الاقوامی اتحاد کا درس دیا ہے۔ ان کی یہ تخلیقات قاری کو انسانیت کا درس دیتی ہیں۔ ان سفر نامہ نگاروں نے جہاں جہاں کا سفر کیا ہے انھوں نے نہ صرف وہاں کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے بلکہ وہاں کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، معاشرتی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو بھی بیان کیا ہے اور پھر ان کے حل کرنے کے راستے بھی اختیار کیے ہیں۔

مختصراً اردو کے سفر نامہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں انسان دوستی، عالمی امن، بھائی چارے، بین الاقوامی اتحاد کا درس دیا ہے۔ ان کی یہ تخلیقات قاری کو انسانیت کا درس دیتی ہیں۔ ان سفر نامہ نگاروں نے جہاں جہاں کا سفر کیا ہے انھوں نے نہ صرف وہاں کے حالات وواقعات کو بیان کیا ہے بلکہ وہاں کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی، معاشرتی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو بھی بیان کیا ہے اور پھر ان کے حل کرنے کے راستے بھی اختیار کیے ہیں۔ اردو کے یہ سفر نامے جہاں قاری کو گھر بیٹھے ہوئے دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کرا لیتے ہیں وہیں ان سفر نامہ نگاروں کے مثبت رویے قاری کو زندگی کا درس بھی دیتے ہیں۔ عالمی سطح پر لوگوں کو جن جن تکلیفوں و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے سفر نامہ نگاروں نے ان کا احوال جوں کا توں بیان کیا ہے۔ اردو کے سفر نامہ نگاروں نے نسل پرستی، فرقہ پرستی، مذہبی بنیادوں پر انسانوں کی تقسیم، نابرابری، تنگ نظری، تعصب اور خودغرضی سے بار بار بچنے کی تلقین کی ہے اور اس کے مقابلے میں عالمی امن، بھائی چارہ، اتحاد اور مساوات کی حمایت کی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان سفر ناموں کا مطالعہ کیا جائے اور اردو کی دوسری اصناف کی طرح ان کو بھی نصاب میں جگہ دی جائے تاکہ اردو کی یہ صنف جس میں داستان، ناول، افسانے، انشائے، رپورتاژ، خودنوشت اور آپ بیتی کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں زندہ اور تابندہ رہے۔

■

Mr. Altaf Anjum
Lecturer Urdu
Govt Higher Secondary School
Sezan Doda - 182202 (J&K)

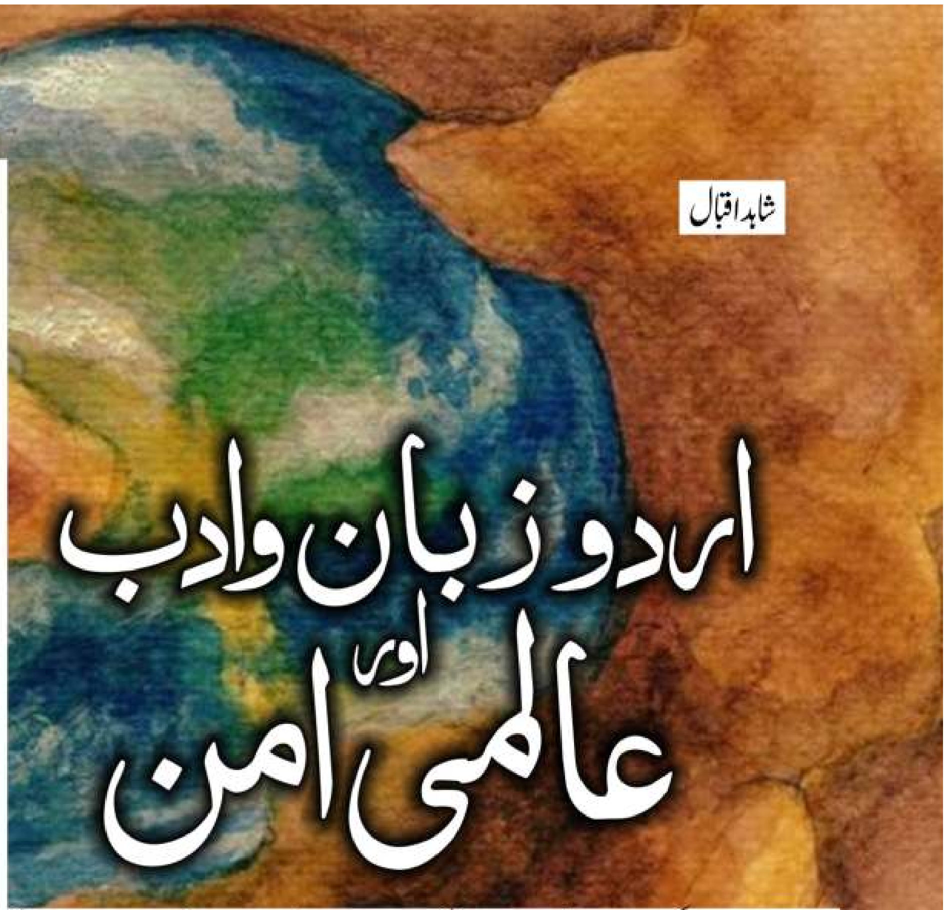

اردو زبان وادب اور عالمی امن

شاہد اقبال

معروف امریکی ماہر لسانیات ولفرڈ پی نے دنیا کی تمام زبانوں کو سات لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہند یورپی ان تمام خاندانوں میں سب سے بڑا لسانی خاندان ہے۔اردو زبان کا تعلق بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر اسی لسانی خاندان سے ہے اور یہ زبان اپنی شائستگی، شگفتگی، سلاست اور روانی جیسی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنے سحر طراز لب ولہجہ کی وجہ سے پوری دنیا کو خلوص ومحبت اور امن واتحاد کا پیغام دیتی ہے۔عصر حاضر میں عالمی امن کا موضوع کافی نازک اور پیچیدہ ہو چکا ہے کیونکہ دنیا کے تمام ممالک میں امن اور خوشحالی کا فقدان ہے ہر طرف انتشار اور افرا تفری کا بازار گرم ہے۔ جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے تو دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو امن و اتحاد کا پیغام نہیں دیتی۔ یہ ایک فطری اصول ہے کہ کسی بھی زبان کا شاعر یا ادیب اپنے گرد ونواح جو کچھ دیکھتا ہے اسے اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی و اخلاقی اقدار کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔زبان بنیادی طور پر ایک وسیلہ اظہار ہے لیکن جب وہ کسی مخصوص علاقے، ریاست یا ملک کی نمائندگی کرتی ہے تو وہ اس علاقے یا ملک کی سیاسی وسماجی اور تہذیبی وثقافتی سرگرمیوں کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔

کسی ملک میں امن اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب اس کی بنیادیں مضبوط و مستحکم اور اعلیٰ سماجی واخلاقی اقدار پر قائم ہوں اور باشندگان ملک بھی ان اقدار پر روبہ عمل ہوں اور اس کے بعد ہی اس ملک کا ادب امن واتحاد کو فروغ دے سکتا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ روز اول تا حال عالمی سطح پر کبھی مکمل طور پر امن قائم نہیں ہوا لیکن زبان وادب نے ہمیشہ انتشار وانحطاط کے خلاف آواز بلند کی اور غیر اخلاقی سماجی رویوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان نے بھی قومی یکجہتی کو برقرار رکھنے میں کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

اردو زبان ربط اور اتحاد پیدا کرنے کا اہم ذریعہ ہے اور اپنی اسی انفرادیت کی بنا پر یہ زبان گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔اردو زبان کے اسی مخلصانہ اور دل افروز رویے سے متاثر ہوکر خواجہ الطاف حسین حالی نے کیا خوب فرمایا ہے ملاحظہ کیجیے۔

شہد وشکر سے شیریں اردو زباں ہماری
ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری

اس حوالے سے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اگر چہ ہندی ہے لیکن عام بول چال میں اردو زبان ہی مستعمل ہے یہاں اردو اور ہندی کا تقابل نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اردو زبان کے اس مخصوص اور ہر دلعزیز لب ولہجے کی طرف اشارہ کیا ہے جو بلا تفریق مذہب وملت عوام الناس میں سرایت کر چکا ہے۔ اس حقیقت سے ہندوستان کا ہر شہری آشنا ہے اور ہندوستان میں بنائی جانے والی فلمیں اس کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہیں لیکن زبانوں کو ہم نے مذہب وملت کا لبادہ پہنا دیا ہے اس لیے مذکورہ حقیقت کو قبول کرنا عوام کے لیے مشکل ترین کام بن گیا ہے۔ اردو زبان کی مرکزیت و انفرادیت کا اعتراف کرتے ہوئے اردو کے نامور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ ہندوستان کے نمائندہ انگریزی اخبار 'ٹائمز آف انڈیا' میں اسے ہندوستان کا لسانی تاج محل قرار دیتے ہیں اس حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں

'Urdu belongs niether to muslim nor hindu,it will survive so long as india remains multicultural, urdu's sophistication and charm captivate everyone that's why i call urdu india's linguistic taj mahal"

گوپی چند نارنگ کے اس خیال کی وضاحت قیصر شمیم کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے۔

میرا مذہب عشق کا مذہب جس میں کوئی تفریق نہیں
میرے حلقے میں آتے ہیں تلسی بھی اور جامی بھی

زبان چاہے کوئی بھی ہو اس کا تعلق کسی مخصوص جماعت، مذہب یا گروہ سے نہیں ہوتا بلکہ سماجی ضروریات کی بنا پر اس کا وجود عمل میں آتا ہے اور جب اس کے بولنے اور سمجھنے والے کثیر التعداد ہو جاتے ہیں تو اس میں ادب تخلیق کیا جانے لگتا ہے جو مذہب وملت کو بالائے طاق رکھ کر عوام کے تمام بنیادی مسائل کو منظر عام پر لاتا ہے۔

اسی طرح اردو زبان نے ابتدا تا حال کسی ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی نہیں کی بلکہ اس کی دور بین اور دور رس نگاہ ہمیشہ عالم انسانیت پر رہی ہے۔اردو زبان کے اسی غیر جانبدارانہ کردار کی نمائندگی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے وہ تمام شعراء اور ادبا کرتے ہیں جنھوں نے ذریعہ اظہار کے لیے اردو زبان ہی کا انتخاب کیا۔عصر حاضر میں پوری دنیا جنگ وجدل، قتل وغارت، انتشار، بدامنی اور بے شمار نفرت انگیز لڑائی جھگڑوں سے دوچار ہے۔اردو شعر وادب نے ان تمام نامساعد حالات اور نفرتوں کے خلاف احتجاج درج کیا اور نفرتوں کے اس ماحول میں خلوص ومحبت کا چراغ روشن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

کیسا اس نفرت کے سناٹے میں گھبراتا ہے دل
اے محبت کیا تیرے ہنگامہ آرا سو گئے

یہ شعر محض کسی ایک ملک یا شہر کے پر آشوب ماحول کی داستان نہیں بلکہ پوری دنیا میں آج نفرتوں کا جو بازار گرم ہے اسے جڑ سے اکھاڑنے اور ایک جذبہ محبت پیدا کرنے

میں محو نظر آتا ہے۔کسی بھی اخلاقی یا غیر اخلاقی نظریے کا آغاز دراصل سماج سے ہوتا ہے اور پھر سماج کے اراکین وقتاً فوقتاً ان نظریات پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں۔آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی گھر کے افراد آپس میں دشمنی اور رنجش کی تمام حدود سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔اولاد اپنے والدین کو بھول جاتی ہے، بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے، میاں بیوی کی لڑائی فوراً طلاق تک پہنچ جاتی ہے اور اسی طرح ایک متحد اور خوشحال گھرانہ دشمنی، رنجش اور سازشوں کی بنا پر تقسیم ہو جاتا ہے اردو زبان نے معاشرے کے اس المیے کو بھی بے نقاب کیا ہے اس حوالے سے مخمور سعیدی کا یہ شعر غور طلب ہے۔

کتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیان
گھر کہیں گم ہو گیا دیوار و در کے درمیان

اردو زبان کو جب ہم عالمی تناظر میں دیکھتے ہیں تو کہیں جارج فلیکس، مورس جان، ڈاکٹر مسیح یوسف یاد جیسے ادیب نظر آتے ہیں اور کہیں میر، درد، سودا، غالب، اقبال، نسیم، چکبست اور فراق محفل سخن آراستہ کیے بیٹھے ہیں اور کہیں منشی پریم چند، منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین شر پسند عناصر کے خلاف احتجاج اور ایک پر امن معاشرہ قائم کرنے میں سر گرم نظر آتے ہیں۔اگر چہ کہ اردو زبان کا آغاز ہندوستان میں ہوا لیکن اردو زبان و ادب نے پوری دنیا میں امن و اتحاد کا پیغام دیا۔ابتدائی ایام کے اردو ادب پر مذہبی نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن اس دور کے ادب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندو اور مسلم تصوف کا حسین ترین امتزاج نظر آتا ہے اس طرح ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان اپنے آغاز سے ہی قومی یکجہتی کی ترجمان رہی ہے۔اس دور کی اردو شاعری پر اگر چہ کہ تصوف کا رنگ غالب ہے لیکن تصوف کے اس مخصوص رنگ میں بھی وہ پیار و محبت کا پیغام دے کر اپنی بوقلمونی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔تصوف کے اس رجحان کے بعد اردو شاعری جب ادب برائے زندگی کی نمائندگی کرنے لگی تو اس نے سماج کو غیر اخلاقی عناصر سے مبرا کرنے میں کارہائے نماں انجام دیے اور ہمیشہ خلوص و محبت کا درس دیتی آئی ہے۔ آفاق صدیقی اردو زبان کے اس مخلصانہ پیغام کو اردو شاعری میں کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں ان کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

دیدہ و دل کی رفاقت کے بغیر
فصل گل ہو یا خزاں کچھ بھی نہیں
ایک احساس محبت کے سوا
حاصل عمر رواں کچھ بھی نہیں

متذکرہ بالا اشعار کو کسی مخصوص علاقے یا سماج تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان میں عالم انسانیت کو بھائی چارے اور انسان دوستی کا بیش قیمتی پیغام دیا ہے عالمی سیاست میں آج جو ہنگامہ برپا ہے اردو شاعری نے اس کی مذمت کرتے ہوئے انسان کو انسانیت کی بنیاد پر متحد کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر راحت اندوری کا یہ شعر قابل داد ہے۔

ملانا چاہا ہے انساں کو جب بھی انساں سے
تو سارا کام سیاست بگاڑ دیتی ہے

اردو کے شعرا جب مذہب و ملت کے نام پر قتل و غارت کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو وہ اس تفریق کو جڑ سے ختم کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔اس ضمن میں اکبرالہ آبادی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

کہتے ہیں کہ اگر مذہب خلل ہے ملکی مقاصد میں
تو شیخ و برہمن پنہاں رہیں دیر و مساجد میں

مذہب و ملت کی یہ تفریق جب انسانوں میں فاصلے بڑھا کر انھیں سرحدوں تک محدود کرنے لگتی ہے تو اردو کے شعرا اور ادبا بلا تفریق مذہب و ملت ان فاصلوں کو مٹانے اور انسان دوستی کا درس دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جس کی وضاحت کنول ضیائی کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

ہمارا خون کا رشتہ ہے سرحدوں کا نہیں
ہمارے خون میں گنگا بھی ہے چناب بھی

آج پوری دنیا میں جو ہنگامہ بھرپا ہے انسان خود اس کے لیے ذمہ دار ہے اور اس کے مادہ پرست ذہن نے انسانیت کو مادیت، مذہب، قوم، ملک اور شہر کی بنیادوں پر بانٹا اور اب انسان ان برے اعمال کے خوفناک نتائج دیکھتا ہے اور ان کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔امن و شانتی قائم رکھنے کے لیے کئی قومی اور بین الاقوامی ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں ان اداروں میں اولاً تو عدل و انصاف کا فقدان ہے اور اگر ان میں سے کوئی انسانی مساوات کی بات کرے بھی تو اسے عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا۔اس طرح انسان نے دنیا کو ایک تماشا گاہ بنا رکھا ہے۔اس حوالے سے مجتبیٰ حسین کے ایک طنزیہ مضمون 'ہوٹل شبانہ' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''دنیا کا بڑے سے بڑا مسئلہ اس ہوٹل میں پہنچ کر چھوٹا ہو جاتا ہے کئی پیچیدہ بین الاقوامی مسائل کے بارے میں یہاں کھٹا کھٹ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں یہ اور بات ہے ان فیصلوں پر عمل کوئی نہیں کرتا۔مرزا کہتے تھے کہ جب دنیا اقوام متحدہ کے فیصلوں پر عمل نہیں کرتی تو ہوٹل شبانہ کے فیصلوں کو کون سنے گا۔''

آج پوری دنیا میں جو ھنگامه بھر پا ھے انسان خود اس کے لیے ذمه دار ھے اور اس کے ماده پرست ذھن نے انسانیت کو مادیت، مذھب، قوم، ملک اور شھر کی بنیادوں پر بانٹا اور اب انسان ان برے اعمال کے خوفناک نتائج دیکھتاھے اور ان کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا ھے۔ امن و شانتی قائم رکھنے کے لیے کئی قومی اور بین الاقوامی ادارے بھی قائم کیے گئے ھیں ان اداروں میں اولاً تو عدل و انصاف کا فقدان ھے اور اگر ان میں سے کوئی انسانی مساوات کی بات کرے بھی تو اسے عملی جامه نهیں پهنایا جاتا۔اس طرح انسان نے دنیا کو ایک تماشا گاه بنا رکھا ھے۔

اردو زبان کے ادیبوں نے ادب کے ذریعے انسان کو ہمیشہ ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کرنے اور امن و انصاف پر قائم رہنے کی تلقین کی ہے۔عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی ملک کی ترقی اور خوش حالی کا انحصار اس کی سیاست اور حکومت کے اراکین پر ہوتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قومی ترقی میں سب سے اہم اور متحرک کردار ملک کے عام شہری کا ہوتا ہے۔اردو زبان و ادب نے انسان کو خود شناس اور خوددار بنانے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی فلاح کے لیے از خود فکر مند بنانے میں مرکزی رول ادا کیا ہے جس کی وضاحت سر سید احمد خان کے ایک مضمون 'اپنی مدد آپ' کے اس اقتباس سے ہوتی ہے :

''ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی شخصی خود غرضی اور شخصی برائیوں کا۔''

میں اپنے مقالے کا اختتام اردو زبان کے اس اعلیٰ اخلاقی پیغام پر کرتا ہوں جس میں مولانا الطاف حسین حالی فرماتے ہیں ۔

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

■

Shahid Iqbal
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

پنڈت ماتر دت مشر کیف واصفی ردولوی

انور حسین خاں

تاریخ شاہد ہے کہ اردو زبان و ادب کا مزاج و کردار اور عمل ہمیشہ سیکولر، اتحاد و اتفاق، محبت و الفت اور امن و آشتی کا رہا ہے۔ اس زبان کے فروغ و ارتقا میں جہاں مسلم شعرا و ادبا نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہیں ہمارے غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں نے بھی اپنے خونِ جگر سے اردو کے خوبصورت چمن کی آبیاری کی ہے، جس کا ثمرہ ہمیں یہ حاصل ہوا کہ ہماری یہ خالص ہندوستانی زبان دنیا کی اہم ترین جدید اور ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے لگی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عہد شاہجہانی کے ممتاز شاعر اور شہزادہ داراشکوہ کے پرائیویٹ سکریٹری چندر بھان برہمن (وفات 1662) سے لے کر موجودہ عہد تک بے شمار شاعروں اور ادیبوں جیسے پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت دیاشنکر نسیم، تلوک چند محروم، آنند نرائن ملا، سردار مہندر سنگھ بیدی سحر، کرشن بہاری نور، ہنومان پرساد شرما، عاجز ماتوی اور پنڈت گلزار دہلوی کا اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت نیز معاشرت میں ایک مثبت کردار رہا ہے۔ باعث افتخار و مسرت ہے کہ ردولی ضلع فیض آباد (سابق ضلع بارہ بنکی) کے پنڈت ماتر دت مشر کیف واصفی اسی شاندار روایت کی مضبوط کڑی کے روپ میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔

پنڈت ماتر دت مشر کیف واصف شہرحق قصبہ ردولی ضلع فیض آباد (سابق بارہ بنکی) کے محلہ صوفیانہ میں 4 جولائی 1928 کو پنڈت چندر بھوشن مشر اور شریمتی ...... راجی کے یہاں پیدا ہوئے۔ اپنے وطن ردولی میں ابتدائی تعلیم کی حصولیابی کے بعد فاربس کالج، فیض آباد سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات پاس کیے، جبکہ گریجویشن لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ سرکاری ملازمت میں آ گئے، جہاں سے 1986 میں بہ حیثیت اے ڈی او سبکدوش ہوئے۔ ہمیں یہ شرف حاصل ہے کہ میں اپنے بچپن سے ہی محترم کیف صاحب سے بطور خاص واقف رہا ہوں کہ آپ میرے والد جناب اظہر حسین خان مرحوم کے تعلیمی دور کے جونیئر ساتھیوں میں تھے، جب آپ کبھی نیورہ تشریف لاتے تو والد مرحوم سے بے تکلف ہو کر گفتگو کرتے اور اپنا تازہ کلام ضرور سناتے۔ ہم نے ہمیشہ محسوس کیا کہ کیف صاحب قصباتی تہذیب کے پروردہ، علم دوست اور ایک مہذب و شائستہ انسان تھے، جنھیں زبان و ادب سے از حد دلچسپی تھی۔ فیض آباد کے فاربس کالج میں جب کیف صاحب زیر تعلیم تھے تو اس وقت کالج میں فارسی کے ایک جید استاد منشی عبدالواحد مرحوم تھے، جن سے آپ نے بہ طور خاص فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھیں استاد محترم کے زیر اثر آپ شاعری کی طرف متوجہ ضرور ہوئے لیکن شاعری میں باقاعدہ آپ کے استاد حکیم محمد مرزا واصف ردولوی تھے، جن کی عملی تعلیم و تربیت نیز فیضان صحبت سے آپ نے بہت جلد دنیائے شاعری میں ایک معتبر اور نمایاں مقام حاصل کیا۔

چودھری سید علی محمد زیدی (ننھن میاں مرحوم) کی مشہور کتاب 'اپنی یادیں، ردولی کی باتیں' میں بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ کیف صاحب ردولی کے غیر مسلم شاعروں میں سب سے بہتر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کا نام اور کام اردو شعرا کے درمیان کبھی محتاج تعارف نہیں رہا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ نے آپ کی وہ قدر و قیمت نہیں کی، جس کے صحیح معنوں میں مستحق تھے جس کا سبب جہاں لوگوں کی آپ کے تئیں بے اعتنائی نیز علم و ادب سے لوگوں کی دلچسپی کا فقدان ہے، وہیں موصوف کی تلون مزاجی اور سیمابی کیفیت کا بھی کچھ کم دخل نہیں ہے۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ آپ اردو کے ایسے خوش فکر، کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے جن کے یہاں شعری روایت و اصول کی مکمل پاسداری موجود ہے۔ آپ کے کلام میں کیف و سرور، ترتیب و تہذیب نیز زبان و بیان کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

محترم کیف صاحب نے مقدس کتاب رگ وید کے گائتری منتر کو اپنے جذبہ صادق کے ساتھ بڑے موثر اور دلکش انداز میں، اردو میں منتقل کر کے اپنے فن کو عروج

کیف صاحب قصباتی تہذیب کے پروردہ، علم دوست اور ایک مہذب و شائستہ انسان تھے، جنھیں زبان و ادب سے ازحد دلچسپی تھی۔ فیض آباد کے فاربس کالج میں جب کیف صاحب زیرتعلیم تھے تو اس وقت کالج میں فارسی کے ایک جید استاد منشی عبدالواحد مرحوم تھے، جن سے آپ نے بہ طور خاص فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انہیں استاد محترم کے زیراثر آپ شاعری کی طرف متوجہ ضرور ہوئے لیکن شاعری میں باقاعدہ آپ کے استاد حکیم محمد مرزا واصف ردولوی تھے، جن کی عملی تعلیم و تربیت نیز فیضان صحبت سے آپ نے بہت جلد دنیائے شاعری میں ایک معتبر اور نمایاں مقام حاصل کیا۔

بخشا ہے۔ بلاشبہ آپ کا یہ منظوم کارنامہ اردو میں ایک خوشگوار اضافہ ہے، جس کا اعتراف بھی اہل نظر نے کیا ہے۔ نافع کمیل ردولوی نے اپنے ایک مضمون 'گائتری منتر موازنہ علامہ اقبال و کیف ردولوی' روزنامہ پرتاپ دہلی 18 مارچ 2014 میں اس منظوم ترجمہ کا منصفانہ جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے کہ کیف صاحب کی اس نظم کو حمدیہ شاعری کا ایک بہترین نمونہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا اردو کے ممتاز ادیب و ناقد ڈاکٹر شارب ردولوی نے بھی اپنے ایک خط محررہ 13 مارچ 2008 میں گائتری منتر کے اس ترجمے کی ستائش کی ہے۔ چند بند ملاحظہ فرمایئے۔

روحِ عشرت گاہ عالم بانیِ لیل و نہار
خالقِ کونین ہے تو، تو ہی ہے پروردگار
تیرے دم سے مہر و مہ ہیں باعث نشو و نما
تیرے ہی دم سے ہے رشتہ زندگی اور موت کا
نور تیرا ہر طرف، جلوہ ہے تیرا ہر جگہ
دل کی دھڑکن تجھ سے قائم سانس ہے تیری رضا
ہو عنایت کی نظر ہم پر بہ ایں فیضان نور
عقل و دانش میں زمانے کی سما جائے شعور

یہ حقیقت ہے کہ کیف صاحب نے بھی دیگر غیر مسلم شعرا کی طرح پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰﷺ کی شان میں بڑے والہانہ انداز میں نعت گوئی کی سعادت حاصل کی ہے۔ ماہانہ 'ندائے اعتدال' علی گڑھ کے جواں سال ایڈیٹر اور متعدد کتابوں کے مصنف و مؤلف ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے اپنے ایک مضمون 'اردو میں نعتیہ شاعری، غیر مسلم شعرا کے حوالے سے مشمولہ کتاب آئینہ افکار صفحہ 153,154 میں آپ کی نعتیہ شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ "کیف صاحب بڑی مدت سے نعت گوئی کے ذریعے اپنے فکر و فن کو سنوار رہے ہیں، نعت گوئی (ان کی) پہچان بن چکی ہے، بہت چھوٹی بحروں میں بڑے دلکش انداز میں وصف نگاری کا ملکہ انھیں حاصل ہے، بہ طور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

تصور میں آئیں تو بے خود بنائیں
مقدس فضائیں، معطر ہوائیں
وہ محبوب سب کے وہ مطلوب سب کے
جو تحفے میں پائیں، وہ سب کو لٹائیں
کمال بلاغت یہ حسن فصاحت
عرب جھوم جائیں، عجم جھوم جائیں
عروج امانت یہ حسن صداقت
مخالف بھی آئیں تو سر کو جھکائیں

ہماری اردو شاعری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس شیریں زبان کے شعرا نے حب الوطنی کے گیت ہر دور میں ضرور گائے ہیں، کیف صاحب کو بھی یقیناً اپنے وطن سے والہانہ محبت و عقیدت ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک بڑی خوبصورت اور موثر نظم میں کیا ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس نظم میں سادگی، روانی، دلکشی اور بلند خیالی کے علاوہ الفاظ کی چستی و برجستگی جیسی خوبیاں بھی موجود ہیں۔

گلشن سے اٹھیں گے تو یہ آکاش چھوئیں گے
یہ جہدِ مسلسل ہے، یہی رسم کہن ہے
ہر پھول کی خوشبو ہے الگ رنگ الگ ہے
صد رنگیِ گلشن کی نرالی یہ پھبن ہے
چکبست کی دھرتی ہے تو رحیمن کی زمیں بھی
ہندی کا اگر دیس تو اردو کا وطن ہے

آپ نے اسی جذبہ محبت سے اپنی جائے پیدائش کی عظمت کو بھی سلام کیا ہے، ملاحظہ فرمایئے چند اشعار۔

مولوی سید علی فوق و اثر کی سرزمیں
شاعران باکمال و خوش بیاں کا شہر ہے
دور کا اپنے مسیحا وقت کا اپنے کلیم
یہ حکیم واصف شیریں زباں کا شہر ہے
کیف زارِ زندگی ہے یہ ردولی کی زمیں
کیف کا مسکن مجاز نغمہ خواں کا شہر ہے

کیف صاحب نے اردو شاعری کی روایت کے پیش نظر اپنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ غزل گوئی کے میدان میں نہایت کامیابی کے ساتھ کیا ہے، لیکن افسوس! زمانہ کی دست برد سے ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا، پھر بھی دستیاب شعری سرمایہ کی بنیاد پر ہم بخوبی کہہ سکتے ہیں کہ موصوف نے ردولی کے شعر انگیز ماحول اور ادبی فضا سے فیض یاب ہوکر اپنے پیش رووں کی روش اور روایت پر گامزن رہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آپ کی غزلوں میں رچاؤ، نکھار، جدت، صداقت، روانی اور دلکشی جیسی بنیادی صفات و خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے، چند اشعار۔

حالاں کہ فضاؤں میں تعصب کی گھٹن ہے
جیسی بھی ہے پھر صبح وطن صبح وطن ہے
فیض مضراب ستم ہو تو غزل ہوتی ہے
زندگی ساز الم ہو تو غزل ہوتی ہے
فکر کی میری پرواز اپنی جگہ ہے
سوز اپنی جگہ ہے، ساز اپنی جگہ ہے
ان کا طرزِ سخن مختصر مختصر
میری روداد غم داستاں داستاں
رنگ و رخسار و لب گلستاں گلستاں
پرتو حسن ہے گلستاں گلستاں

کیف صاحب کے شعری محاسن و کمالات کا محاکمه و محاسبه کرنے کے لیے ضروری هے که کاش! آپ کا مکمل شعری اثاثه هم سب کی نظر میں هوتا، تبھی شعر و ادب کی دنیا میں ان کا مقام متعین هوسکے گا، لیکن سردست جو شعری سرمایه دستیاب هے، وه هم سب کے لیے مفید، قیمتی، دلچسپ اور اهم هے۔ دراصل آپ نے همیشه اردو زبان و ادب اور تهذیب و ثقافت سے واسطه رکھا، اور حتی المقدور خدمت انجام دی، بلاشبه آپ هماری شاعری کے سیکولر کردار و اقدار نیز اصولوں کے مستند امین اور گنگا جمنی تهذیب کی روشن علامت تھے، جن پر اهل اردو کو عموماً اور اهل ردولی کو خصوصاً بجا طور پر فخر و ناز هے۔

جشن مسرت لکھ دے یارب اس کی اک اک رات کے نام
جس نے غم منسوب کیے ہیں، تنہا میری ذات کے نام
ایک قصیدہ اہل وطن کو، ایک رجز حالات کے نام
غزلیں پھر تحریر کریں گے، میخانہ کی رات کے نام

کیف صاحب کے شعری محاسن و کمالات کا محاکمہ و محاسبہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کاش! آپ کا مکمل شعری اثاثہ ہم سب کی نظر میں ہوتا، تبھی شعر و ادب کی دنیا میں ان کا مقام متعین ہو سکے گا، لیکن سردست جو شعری سرمایہ دستیاب ہے، وہ ہم سب کے لیے مفید، قیمتی، دلچسپ اور اہم ہے۔ دراصل آپ نے ہمیشہ اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت سے واسطہ رکھا، اور حتی المقدور خدمت انجام دی، بلاشبہ آپ ہماری شاعری کے سیکولر کردار و اقدار نیز اصولوں کے مستند امین اور گنگا جمنی تہذیب کی روشن علامت تھے، جن پر اہل اردو کو عموماً اور اہل ردولی کو خصوصاً بجا طور پر فخر و ناز ہے۔

افسوس! اردو شعر و ادب کا یہ روشن ستارہ اپنے ہی وطن ردولی میں 19 فروری 2016 کو ہم سب کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا، لیکن کیف صاحب اپنی موت پر اہل دنیا کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

جب کیف نہیں ہوں گے تو کیا کیف نہ ہوگا
اک آتا ہے اک جاتا یہ دنیا کا چلن ہے

■

Dr. Anwar Husain Khan
Village & Dak Khana: Neora
Distt: Fizabad (Ex. Barabanki) - 224117 (UP)
Mob.:9794619742

فلم میکنگ اور ڈراما

مزمل سرکھوت

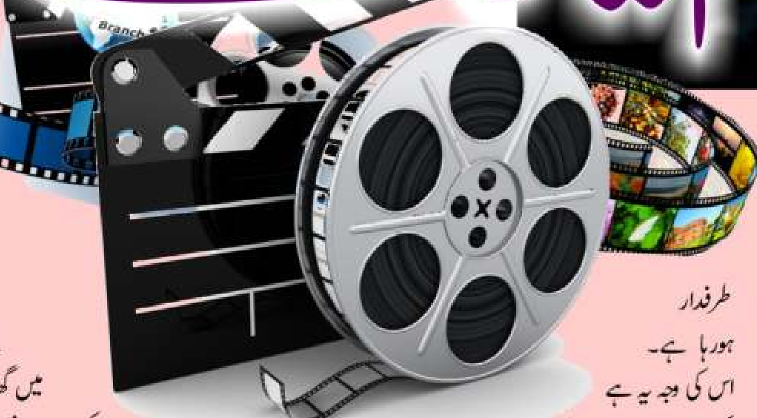

علامہ اقبال نے کسی خاص نقطہ نظر کے تحت کہا ہے مگر یہ بات تو تقریباً ہر شعبہ حیات پر صادق آتی ہے کہ۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

فلم میکنگ کا شعبہ یوں تو غلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا مگر اس شعر کے پہلے مصرعے کی بات اس شعبہ پر صد فی صد درست ثابت ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں فلم بندی یا عکس بندی کا تصور شروع ہی سے مبہم رہا ہے۔ ایک طبقہ اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہے اور اسے مذہبی طور پر ممنوع قرار دیتا آرہا ہے۔ دوسرا طبقہ اس کے استعمال بلکہ اس میں اپنی کارکردگی (مظاہرے) تک کو جائز سمجھتا رہا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک اور طبقہ موجود رہا ہے جو بوقتِ ضرورت فلم میکنگ کو جائز سمجھتا رہا ہے۔

فلم میکنگ ہے کیا؟ سب سے پہلے اسے سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں چلتی پھرتی تصویریں ہوتی ہیں، اداکاری کرتے ہوئے کردار ہوتے ہیں۔ ان تصویروں یا ان کرداروں کے ذریعے فلم کار کسی سماجی، سیاسی یا معاشی اور تفریحی موضوع کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ کسی اہم پیغام کو عام کرنے کا بھی یہ ایک اہم ذریعہ ہے۔ کسی موضوع کی فلم بندی کی نمائش کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ کم وقت میں دنیا بھر میں اپنی بات کی ترسیل ہو جاتی ہے۔ فلم میکنگ میں ارادہ، منصوبہ بندی، جدید تکنالوجی سے واقفیت، دنیا کے حالات پر نظر ضروری اجزا قرار پاتے ہیں۔ ہمارے یہاں جو طبقہ فلم میکنگ یا کسی بھی قسم کی عکس بندی کا مخالف رہا ہے وہ بھی اب اس کی اہمیت کا طرفدار ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دن بہ دن وجود میں آنے والی تکنالوجی نے آسانیاں پیدا کردی ہیں وہیں پر ہمیں آسائشوں میں بھی مبتلا کرنے کا کام کیا ہے۔ ہماری خواہشات بھی بے لگام ہوتی جارہی ہیں۔ خود شناسی کے جراثیم بھی ہم میں سرایت کرتے جارہے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر جس طرح پہلے شوٹنگ کے لیے نارضامندی نظر آتی تھی اب وہ کم ہوتی جارہی ہے۔ لوگ باگ اپنی مرضی سے شادی بیاہ کی ویڈیو گرافی کرتے ہیں۔ اور اسے یادگار کے طور پر محفوظ کرلیتے ہیں۔ اس طبقے کے لوگ جو شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی شوٹنگ کی مخالفت پر کمر بستہ ہوتے تھے ان میں بھی اب خودنمائی کا ذوق ابھر رہا ہے۔ تاہم اس بات کے قبول کرنے میں بھی کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ کچھ لوگ آج بھی تصویرکشی اور فلم میکنگ کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جہاں وہ بدعت اور مردود عمل ٹھہرائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ نئی تکنالوجی کا یہ تیز رفتار گھوڑا (فلم میکنگ) بغیر اجازت اور خواہش کے بھی زندگی میں دخیل ہوا جارہا ہے۔ دنیا کے غیر محفوظ ہونے اور زندگی کے خطرے میں گھرے رہنے کی وجہ سے نئی دریافت کی طلب دنیا کے ہر معاشرے میں بڑھی ہوئی ہے۔ وہ نئی دریافت سی سی ٹی وی کیمرے ہیں۔ یہ کیمرے صرف آپ کی تصویر نہیں اتارتے بلکہ وہ شوٹنگ بھی کرتے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں آپ اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ سنیما گھروں میں، بڑے بڑے ہسپتالوں میں، شاپنگ مالس میں تقریباً ہر جگہ انھوں نے اپنا وجود لازم کرلیا ہے۔ کئی ذرائع سے فلم میکنگ ہماری زندگی میں سرایت کرگئی ہے۔ سی سی ٹی وی کیمروں کی جہاں تک گفتگو ہوگی، اس میں شوٹنگ کے لیے پہلے سے کسی قسم کی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی، کسی فلم میکر، سرمایہ دار، کردار، مناظر وغیرہ کی حد بندی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کیمرہ غیر محسوس طور پر آپ کی حرکتیں قید کرتا جاتا ہے اور اہم موقع پر یا ضرورت پڑنے پر اس کی نمائش بھی کرتا رہتا ہے۔

فلم میکنگ کو فلم کرافٹ اور فلم پروڈکشن کا شعبہ بھی کہا جاتا ہے۔ فلم میکنگ کے لیے ایک جامع تصور، ایک پلاٹ، ایک کہانی، کردار، مکالمے، شوٹنگ، ترتیب، فلم

بندی جیسے عناصر ضروری قرار پاتے ہیں۔فلم میکنگ کے مختلف مراحل ہوتے ہیں، ان میں اول کہانی کا تانا بانا بنا جاتا ہے، اس پر مالی تخمینہ طے کیا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلہ میں کردار اور شوٹنگ کی جگہوں اور تاریخوں کا تعین ہوتا ہے۔تیسرے مرحلے میں مقررہ منصوبے کے مطابق تمام کام انجام دیے جاتے ہیں۔ چوتھا مرحلہ شوٹنگ (عکس بندی یا فلم بندی) کی ترتیب وادارت پر صرف کیا جاتا ہے، کہ جو فلم بنی ہے یا جو شوٹنگ ہوئی ہے، اس میں کتنے مناظر، کتنے مکالمے یا کتنے کرداروں کے غیر اہم حصوں کو حذف کرنا ہے یا اس شوٹنگ میں کسی قسم کی کمی رہ گئی ہو تو اس کی تکمیل پر توجہ دی جاتی ہے۔یعنی فلم کی نوک پلک درست کرنے کا اہم کام اس مرحلے میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد فلم نمائش کے لیے بازار میں پیش کی جاتی ہے۔تقسیم کار فلم کو مختلف سنیما گھروں میں پہنچا دیتے ہیں۔ فلم میکنگ کا شعبہ مکمل طور پر منحصر ہوتا ہے فلم میکر پر۔فلم تین طرح کی بنائی جاتی ہیں۔فیچر فلم، دستاویزی فلم اور اشتہاری فلم۔ان اقسام میں وقفہ ایک واضح امتیاز پیدا کرتا ہے۔فیچر فلموں کا دورانیہ دو سے تین گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے، دستاویزی فلموں کے دورانیہ کی پیمائش ذرا مشکل ہے مگر رائج تصور کے لحاظ سے اس کا وقفہ ایک سے دو گھنٹوں پر محیط ہوتا ہے، اشتہاری فلموں کا دورانیہ سیکنڈوں کا ہوتا ہے۔ تینوں اقسام میں جو بات مشترک ہے وہ فلم میکنگ ہے اور فلم میکر ہے۔

فلم میکر: فلم میکنگ کے شعبے میں یہ سب سے اہم کردار ہے۔کسی واقعہ، کسی خبر، کسی پالیسی کے متعلق کوئی پروجیکٹ عوام کے سامنے لانے کی ساری ذمہ داری فلم میکر کی ہوتی ہے۔اسے سوتر دھار کہتے ہیں۔فلم میکر عوامی تقاضے، حکومتی اعلانات، روزمرہ کے واقعات سے واقفیت رکھتا ہے۔فلم میکر اپنے موضوعات زندگی کے کسی بھی شعبے سے منتخب کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے۔فلم میکنگ کا شعبہ آزاد خیالی کا متقاضی ہے۔کوئی فلم میکر اپنی ذاتی پسند یا اپنی جذباتی وابستگی کی بنا پر کسی پروجیکٹ کی تکمیل کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس پروجیکٹ (کہانی) کو لے کر عوامی سطح پر مقبولیت یا پسندیدگی کی ضمانت یا امید کیا ہوگی۔فلم میکر نہ صرف اپنی خالص سوچ کو منظر عام پر لانے کے لیے جتن کرتا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں عوام کی پسند ناپسند کا گراف بھی ہوتا ہے، وہ اپنے پروجیکٹ کو اس انداز میں مشتہر کرتا ہے کہ لوگوں میں تجسس کی لہر پیدا ہو جائے، انتظار نمائش کے لیے لوگوں میں بے قراری نظر آئے اور نمائش پر اس کی

فلم کی شوٹنگ مکمل ہوجانے کے بعد فلم میکر اپنے ایڈیٹر کے ساتھ فلم کی ترتیب میں جٹ جاتا ہے۔ فلم کے وقفہ کا تعین بھی اسی مرحلے میں ہوتا ہے۔ فلم تین گھنٹے کی ہوگی یا دو گھنٹے کی۔ شوٹنگ کے دوران کئی غیر ضروری مناظر کی عکس بندی ہوگئی تھی تو اسے اصل ریل یا فلم سے الگ کرنا، کرداروں اور مکالموں کی غیر اہم کارگزاریوں کو ریل سے نکال دینا، اگر کسی وجہ سے کوئی اہم منظر غیر اطمینان بخش طریقے سے شوٹ ہوا ہو تو اس کی دوبارہ شوٹنگ کر کے مکمل فلم سے اپنااطمینا ن کرلینافلم میکر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

باتیں یا اس کا مطمح نظر کھل کر سامنے آجائے۔

کہانی کے انتخاب کے بعد فلم میکر کرداروں کی تلاش شروع کر دیتا ہے۔اس تعلق سے کئی طرح کے قطع و برید کے بعد، کئی امتحانی مراحل سے گزر کر، کئی باریکیوں کی چھان پھٹک کے بعد فلم میکر یہ مرحلہ طے کرتا ہے۔ کرداروں کے تعین کے وقت فلم میکر پروڈیوسر یعنی جو فلم میں سرمایہ لگائے گا اس کی مرضی کو بھی شامل کرتا ہے۔اور دونوں کی رضامندی سے یہ معرکہ سر کرلیا جاتا ہے۔ پروڈیوسر پورے پروجیکٹ کے لیے ایک متعین رقم مختص کرلیتا ہے۔ اور فلم میکر اس میں سے کرداروں، مناظروں، کرداروں کے لوازمات، شوٹنگ کے لوازمات، قانونی پیچیدگیوں کے لیے لگنے والی ساری مالی ضابطگیوں کو خوش اسلوبی سے پوری کرتا ہے۔فلم میکر کرداروں کی فہرست سازی کے بعد مناظر کے تعلق سے بھی اسی پسند ناپسند اور اسی تحقیق و تجسس کو مد نظر رکھتا ہے اور کہانی نویس یا منظر نگار کی منشا اور کہانی کی ضرورت کے مطابق جگہوں کا انتخاب کرتا ہے۔جس طرح کرداروں سے ملاقات کے بعد اپنا اطمینان کرلینا فلم میکر اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے اسی طرح مناظر کے متعلق بھی اسے اپنا اطمینان کرلینا از حد ضروری ہوتا ہے۔وہ کہانی نویس یا مکالمہ نگار یا منظر نویس کے ساتھ بذاتِ خود کہانی کے متقاضی مناظر کی سیر کرتا ہے۔شوٹنگ کے مخصوص مقامات کے لیے اپنا ذہن بناتا ہے۔ کہانی، سرمایہ، کردار، مناظر، شوٹنگ کے لوازمات اور مقامات کے تعین کے بعد فلم کی شوٹنگ شروع کی جاتی

ہے۔ یہ سارا عمل فلم میکنگ سے پہلے منصوبہ بندی کے مراحل میں طے ہوتا ہے۔دوسرا مرحلہ شوٹنگ کا ہوتا ہے۔ شروع سے آخر تک فلم میکر اس پورے عمل کا حصہ ہوتا ہے۔کردار بدلتے رہتے ہیں، مناظر بدلتے رہتے ہیں، پروڈیوسر بھی نہ سابقہ بنا رہتا ہے اور نہ ہی لاحقہ کی صورت وہ شوٹنگ کے عمل میں موجود ہوتا ہے۔وہ صرف اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ کب فلم کی شوٹنگ ختم ہو؟ کب فلم سنیما گھروں کی زینت بنے اور کب اس کا سرمایہ سود سمیت واپس مل جائے۔فلم میکر اس کی دولت فلم کے بنانے میں مناسب طریقے سے استعمال کرتا ہے۔فلم میکر کے ساتھ شوٹنگ کے مراحل میں مکالمہ نویس، شوٹنگ کے لوازمات کے ذمہ داران، کاسٹیوم ڈیزائنر، اگر گانے کا وقت ہو تو کوریوگرافر، لوکیشن مینجر، ساؤنڈ ڈیزائنر کی موجودگی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔فلم میکر شوٹنگ کی شیڈول کا بہت سارا کام اپنے اسسٹنٹ کے سپرد بھی کرتا ہے۔ اسے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کہا جاتا ہے۔ یہ کردار بھی شوٹنگ کے خاتمے تک فلم میکر کے ساتھ موجود رہتا ہے۔

فلم کی شوٹنگ مکمل ہوجانے کے بعد فلم میکر اپنے ایڈیٹر کے ساتھ فلم کی ترتیب میں جٹ جاتا ہے۔فلم کے وقفہ کا تعین بھی اسی مرحلے میں ہوتا ہے۔فلم تین گھنٹے کی ہوگی یا دو گھنٹے کی۔ شوٹنگ کے دوران کئی غیر ضروری مناظر کی عکس بندی ہوگئی تھی تو اسے اصل ریل یا فلم سے الگ کرنا، کرداروں اور مکالموں کی غیر اہم کارگزاریوں کو ریل سے نکال دینا، اگر کسی وجہ سے کوئی اہم منظر غیر اطمینان بخش طریقے سے شوٹ ہوا ہو تو اس کی دوبارہ شوٹنگ کر کے مکمل فلم سے اپنا اطمینان کرلینا فلم میکر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ایڈیٹنگ کا مرحلہ سب سے زیادہ ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ عمل خام بنے ہوئے مال کو پختہ اور دلکش بنا کے بازار میں پیش کرنے کا چیلنج ہوتا ہے۔ایڈیٹنگ کے بعد فلم نمائش کے لیے سینما گھروں میں پیش کی جاتی ہے۔

فلم میکنگ ذرائع ابلاغ و ترسیل میں ایک اہم اور نا قابلِ نظر انداز عنصر کی اہمیت رکھتا ہے۔

ڈراما: فلم میکنگ کی طرح ڈراما بھی ماس میڈیا کا اہم جز تصور کیا جاتا ہے۔ڈراما اور فلم میکنگ میں کئی اجزا مشترک ہیں۔کہانی، کردار، مکالمے، مناظر وغیرہ۔ڈرامے کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ شوٹ بھی ہو۔کردار صرف اسے ادا کرتے ہیں اور ناظرین یا تماش بین اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ڈرامے تین قسم کے ہوتے ہیں، اسٹیج ڈرامے، ریڈیو ڈرامے اور نکڑ ڈرامے جنھیں نکڑ ناٹک کہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ڈرامے کی ابتدائی قبولیت یا عدم قبولیت کی وہی کہانی ہے جو فلم میکنگ کے ضمن میں بیان ہوچکی ہے۔ شروعات میں ڈرامے کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس میں کام کرنا معیوب گردانا جاتا تھا۔ اسے دیکھنا آوارگی کا متبادل تھا۔ اردو میں ڈرامے کی شروعات واجد علی شاہ بلکہ ایک تحقیق کے مطابق ان سے پہلے ممبئی میں مراٹھی کے ناٹک کار وشنو پنت بھاوے کے ہندوستانی ڈرامے 'راجا گوپی چند جالندھر' سے ہوئی۔ واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کے 'اندر سبھا' نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ تاہم ایک خیال یہ بھی ہے کہ امانت کا 'اندر سبھا' اردو کا سب سے پہلا باضابطہ ڈراما کہلاتا ہے۔ جو بھی ہو، یہ ساری باتیں 1850-55 کے درمیان کی ہیں۔ اسی دوران اردو ڈرامے کا ورود ہوتا ہے۔ ممبئی کے پارسی اردو تھیٹر نے اردو ڈرامے کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہاں کئی ڈراما نگار اردو کے دامن میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ مہروان جی آرام، افسوں مراد آبادی، رونق بنارسی، حسینی میاں ظریف، طالب بنارسی، بیتاب بنارسی، آرزو لکھنوی، سید مہدی حسن احسن لکھنوی، نازاں دہلوی، آغا حشر کاشمیری، محشر انبالوی وغیرہ کئی ڈراما نگار پارسی تھیٹر سے جڑے ہوئے تھے۔ ان ڈراما نگاروں میں جو شہرت آغا حشر کاشمیری کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔ اس دور میں ڈراما صرف تفریح کے لیے کھیلا جاتا تھا، اسٹیج کیا جاتا تھا۔ آغا حشر نے اسے خواب و خیال کی دنیا سے نکال کر اصلیت کی جانب ملتفت کیا۔ انھوں نے نہ صرف خود حقیقی موضوعات پر ڈرامے لکھے بلکہ پارسی مالکان کو بھی اسی روش پر چلنے پر مجبور کیا۔ اسیرِ حرص، سفید خون، خوبصورت بلا، رستم و سہراب جیسے کئی ڈرامے ان کی یادگار ہیں۔

آغا حشر اور ان کے معاصرین نے اسٹیج ڈرامے کو عروج عطا کیا۔ سید امتیاز علی تاج اپنا مایہ ناز ڈراما 'انارکلی' لکھتے ہیں۔ پارسی مالکان امتیاز علی تاج کے ڈرامے کو اسٹیج کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس میں کئی طرح کی تبدیلیوں کے خواہاں بھی تھے۔ 'انارکلی' کے لیے دراصل ڈرامے کا اسٹیج غیر موزوں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈراما نگار کے تخلیق کردہ جنگوں کے مناظر، اس کے ساز و سامان، دربارِ اکبری اور اس کے لوازمات کو اسٹیج پر خاطر خواہ انداز میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کے لیے اسٹیج کا کینوس محدود تھا۔ تاہم اس ڈرامے نے تحریری شکل میں اپنی موجودگی اور مقبولیت کے کئی ریکارڈ بنائے۔ یہ ڈراما اردو کی ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس پر بالی ووڈ میں فلم بھی بنائی گئی اور آج بھی یہ ڈراما تحریر میں موجود ہے اور قارئین کی دلچسپی کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ یہ ڈراما کبھی اسٹیج کی زینت نہیں بن سکا۔ اردو میں ڈراما نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ حکیم احمد شجاع، منشی جوالا پرشاد برق، نور الٰہی و محمد عمر، سید عابد علی عابد، عشرت رحمانی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر اشتیاق حسین قریشی، بادشاہ حسین حیدر آبادی، ساغر سرحدی، حبیب تنویر، آغا شمس الدین، رفعت شمیم، اقبال نیازی، اسلم پرویز وغیرہ کئی ڈراما نگاروں کے نام اس زنجیر سے جڑے ہوئے ہیں۔

اردو میں ترقی پسند تحریک کے دور میں اسٹیج کی طرف بھی ترقی پسند قلم کاروں نے توجہ کی۔ انڈین پیپلس تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) کا قیام اسی دور کی یادگار ہے۔ اپٹا کے زیرِ اہتمام کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ ممبئی میں آئیڈیا، ایک جٹ، رنگ شیلا، کردار ڈراما گروپ وغیرہ کئی ادارے اردو اور دوسری زبانوں کے ڈراموں کو اسٹیج کرتے رہے ہیں۔

پارسی تھیٹر کے آخری دور میں فلم اور ریڈیو کی آمد نے تھیٹر اور اسٹیج کی جگمگاہٹ کو کسی قدر دھندلا دیا اور ذرائع ابلاغ و ترسیل کی دنیا میں بھی انقلاب آیا۔ اسٹیج کے ڈراموں سے وہی لوگ لطف اندوز ہوسکتے تھے جو اس وقت وہاں موجود ہوں، مگر ریڈیو نے ڈرامے کی ترسیل کی وسعت میں اضافہ کیا۔ اس نے کئی ڈرامے نشر کیے۔ جن کو دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگوں نے بھی سنا اور ان سے محظوظ ہوئے۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہوا، ان کے ذوق کو جلا ملی اور انھوں نے بھی اپنے آپ کو دنیا سے روبرو پایا۔ ریڈیو ڈراما دیکھنے کی نہیں سننے کی چیز ہے۔ یہاں اسٹیج ڈرامے کی سی آزادی نہیں ہے۔ صوتی اثرات پر خصوصی توجہ درکار ہوتی ہے، مکالموں کی چستی اور ان کے اندازِ بیان میں ضروری لچک و روانی ہوتی ہے۔ یہاں مناظر کی بولتی تصاویر، کرداروں کی بولتی تصاویر ہوتی ہیں۔ اختصار ریڈیو ڈرامے کی خوبی ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات اور واقعات بیان کرنا ڈراما نگار کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا۔ رفیع پیرزادہ، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، یوسف ظفر، ابوسعید قریشی، ممتاز مفتی، انور جلال وغیرہ کئی ڈراما نگاروں نے ریڈیائی ڈرامے تحریر بھی کیے اور انھیں نشر بھی کیا۔

نکڑ ناٹک ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ ڈرامے کی ایک قسم ہے۔ اس کی جڑیں ہمیں گشتی تبلیغی منڈلیوں میں ملتی ہیں۔ ان میں ہوتا یہ تھا کہ کوئی منڈلی مذہبی اساطیری کہانیوں اور داستانوں کو گاؤں گاؤں جا کر گلیوں میں اور نکڑوں پر منظوم طرز میں پیش کیا کرتی تھی۔ مراٹھی ڈرامے کی شروعات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ترقی پسندوں نے اس قدیمی اندازِ اظہار یعنی نکڑ سبھا یا نکڑ ناٹک کو خاطر خواہ استعمال کیا۔ آزادی کے بعد سے تاحال اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں نکڑ ناٹک ہزاروں کی تعداد میں کھیلے گئے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ نکڑ ناٹک موضوعات کے تنوع اور جدت کی وجہ سے زیادہ اثر دار اور پسندیدہ ہیں۔ کالج گروپس یا پیشہ ورانہ ڈراما گروپس بھی نکڑ ناٹک نئے نئے اور حساس موضوعات پر کھیلتے رہے ہیں، عوام کو موضوعات کی اہمیت اور ان کے اثرات سے روشناس کراتے رہے ہیں۔

■

Dr. Muzammil Sirkhot
Dept of Urdu
Mumbai University, Ranaday Bhawan
Kalina Campus, Santa Cruz (W)
Mumbai - 400098 (MS)

شاعری ہر دور میں حالات کی ترجمان رہی ہے: وقار مانوی

عبدالحی

متعدد شعری مجموعوں کے خالق 'اردو غزل کی آبرو'، 'وقار المتغزلین' اور 'استاد الاساتذہ' جیسے القاب سے نوازے جاچکے اور ادبی منظرنامے میں اپنی خاص شناخت رکھنے والے شاعر وقار مانوی سے خصوصی گفتگو کے اقتباسات:

عبدالحی: اپنی پیدائش اور خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالیں؟

وقار مانوی: میری پیدائش دہلی کے ایک متوسط گھرانے میں 11 نومبر 1939 کو ہوئی۔ والد صاحب محمد نظیر مرحوم پیشے کے اعتبار سے ٹیلر ماسٹر تھے۔ اپنا ذاتی ٹیلرنگ ہاؤس تھا۔ دادا مرحوم محکمہ پی ڈبلیو ڈی (میونسپل کمیٹی میں) ملازم تھے، نانا جان عبدالرحمٰن مرحوم جو بہت ذی علم باذوق مہذب اور باعمل انسان تھے وہ اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری کے بھانجے تھے۔ گھر کا ماحول اچھا خاصا ادبی تھا۔

عبدالحی: مانی جائسی جیسے عظیم شاعر آپ کے استاد رہے ہیں۔ ہمیں یہ بتائیں کیا شاعری کے لیے زانوئے تلمذ تہہ کرنا ضروری ہے؟

وقار مانوی: شاعری میں شرف تلمذ لازمی تو نہیں البتہ اعتبار بخش اور سودمند ضرور ہوتا ہے۔ اساتذہ کے ذریعے شاعری کے رموز و نکات سمجھنا آسان ہوتا ہے اور استاد کی سرپرستی میں شاگرد کو شعور فن کے ساتھ ساتھ طمانیت اور حوصلہ ملتا ہے۔ اس کے برعکس عام طور سے یہ منصب پانا مشکل ضرور ہوتا ہے۔ یوں تو دنیائے ادب میں کچھ ایسے نامور شعرا بھی گزرے ہیں جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر ادب میں ممتاز حیثیت حاصل کی مثلاً فانی بدایونی جو یاسیہ شاعری کے امام مانے جاتے ہیں اور عالمی شہرت کے مالک ہیں۔ حضرت مانی جائسی سے شرفِ تلمذ میرے لیے وجہ افتخار ہے۔ وہ بھی کچھ ناچیز پر ناز کرتے تھے۔ ان سے استفادہ حاصل کرنے والے بہت تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں ان کے شاگردوں میں سب سے کم عمر تھا لیکن ان کے فیضانِ تربیت سے مجھے افضلیت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی آخری تصنیف 'ارژنگ مانی' میں مجھے ان الفاظ سے یاد کیا ہے جو میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ عزیزی محمد ظہیر دہلوی اپنی استعدادِ شاعری، قوتِ سخن گوئی، سعادت مندی، کمالِ خلوص اور انتہائی محبت کی جہت سے یاد آتے ہیں۔

عبدالحی: آپ رسالہ 'شمع' سے وابستہ رہے ہیں۔ اردو ادب و زبان کے فروغ میں ادارہ شمع کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا آپ اپنے تجربات سے آگاہ کریں؟

وقار مانوی: جی ہاں میں نے ادارہ شمع میگزین میں طویل مدت (37 سال) ملازمت کی اور مختلف شعبوں میں خدمات انجام دیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں شمع رسالہ اہمیت کا حامل تھا لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے جب لوگوں کو مطالعہ کا شوق تھا۔ شمع رسالہ کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ محض ادبی نہیں تھا بلکہ اس کی فلمی حیثیت بھی مسلم تھی کیونکہ فلمی خبریں بھی اس میں نمایاں شائع ہوتی تھیں۔ پھر یہ کہ شمع ادبی معمہ زور شور سے چل رہا تھا۔ اردو داں طبقہ ہی نہیں اردو نہ جاننے والے بھی انعامات کے لالچ میں اس میں دلچسپی لیتے تھے نیز شمع کا سوال و جواب کا گوشہ بہت مقبول تھا جس کا لوگوں کو انتظار رہتا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ٹی وی کا چلن اس قدر نہیں تھا جس قدر آج ہے۔ اب تو لوگوں کے پاس مطالعہ کے لیے وقت ہی نہیں بچتا۔ شمع کی خوش بختی یہ بھی تھی کہ اسے ظ انصاری، سلامت علی مہدی، اظہار اثر اور جلیس عابدی جیسے قلم کاروں کی خدمات حاصل رہیں۔

عبدالحی: آپ کو بہار اردو اکادمی، صدر جمہوریہ ایوارڈ دہلی اردو اکادمی ایوارڈ، وقار المتغزلین ایوارڈ اور حفیظ میرٹھی جیسے ایوارڈ مل چکے ہیں ان ایوارڈز کی کتنی اہمیت ہے۔ کیا یہ درست ہے کہ ایوارڈ لیاقت اور صلاحیت پر نہیں دیے جاتے؟

وقار مانوی: یہ کہنا تو درست نہیں ہے کہ ایوارڈ لیاقت اور صلاحیت پر نہیں دیے جاتے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ دیگر وسائل اور اثر و رسوخ بھی اپنا کام کرتے ہیں۔ مجھے پہلا ایوارڈ میرے اولین مجموعہ کلام 'وقارِ سخن' کی اشاعت پر بہار اردو اکادمی پٹنہ سے ملا تھا۔ اس وقت تک میری ادبی کارگزاری اندرونِ شہر تک ہی محدود تھی۔ اکابرین ادب تک میری کوئی رسائی نہیں تھی۔ اس لیے اس ایوارڈ کے اعلان پر مجھے اور میرے ناشر تاج پبلشرز دہلی کو بچی خوشی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے بہت سے ایوارڈ ملے اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ جبکہ میں نہ کسی ادبی تنظیم سے جڑا ہوا ہوں نہ میرے ذاتی وسائل ہیں۔ گوشہ نشینی میں خوش ہوں اور خود کو ادب کا ایک ادنیٰ خادم سمجھتا ہوں۔ خوب سے خوب تر کی جستجو ضرور رہتی ہے۔

عبدالحی: آپ نے اصل نام محمد ظہیر سے کیوں شاعری نہیں کی۔ 'وقار' میں ایسی کیا خاص بات تھی۔ ظہیر مانوی بھی تو رکھ سکتے تھے؟

وقار مانوی: میں اپنے اصل نام محمد ظہیر دہلوی کے نام سے بھی شاعری کرسکتا تھا۔ لیکن اول تو یہ میرے علم میں تھا مجھ سے پہلے ایک اور ظہیر دہلوی مشہور ہو چکے ہیں نیز یہ بھی طریقہ رائج ہے، کہ شاعر نام تک محدود نہ رہ کر کوئی تخلص اختیار کرلیتا ہے۔ اس لیے میں نے وقار تخلص اختیار کیا اور

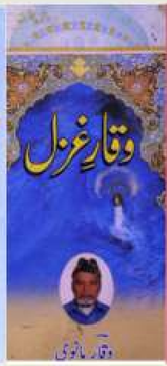

حضرت مانی کی نسبت سے مانوی لکھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ شروع ہی سے اس تخلص کو اپنایا اور اس میں کسی کا مشورہ بھی شامل نہیں تھا۔ الحمدللہ میرے تخلص نے مجھے دنیائے ادب میں باوقار کیا ہے۔

عبدالحی: آپ کی کتابوں کے نام میں بھی 'وقار' جڑا ہوا ہے۔ کیا یہ بھی ضروری تھا۔ اگر نہ جوڑتے تو بھی کتابیں تو آپ کی ہی رہتیں؟

وقار مانوی: میں نے اپنی ادبی کارکردگی میں اور ساتھ ہی دیگر شعبہ ہائے زندگی میں کافی حد تک اپنے استاد مانی جائسی کی تقلید کی ہے۔ میرے استادِ محترم کی شعری تصانیف کے نام نقوشِ مانی، نگارستانِ مانی اور ارژنگ مانی ہیں جو تخلص کے باعث خود میں معنویت لیے ہوئے ہیں۔ میں نے اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ترتیب کو بدل کر اپنی کتابوں کے نام وقارِ سخن، وقارِ آگہی، وقارِ ہنر، وقارِ ادب، وقارِ غزل اور وقارِ افکار (زیرِ ترتیب) رکھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میری کتابوں کے نام خود میں معنویت لیے ہوئے ہیں اور پروپرائٹی کے بھی عکاس ہیں۔ مثلاً کسی فنکار کے شعری مجموعے کا نام 'آگہی' ہے۔ یہ میرے علم میں ہے لیکن میں یہ بھی دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ 'وقارِ آگہی' میرے علاوہ کسی اور شاعر کی کتاب کا نام نہیں ہوسکتا۔ کیا یہ تخلص کا صحیح استعمال نہیں ہے۔

عبدالحی: موجودہ شاعری سے آپ کس قدر مطمئن ہیں؟

وقار مانوی: موجودہ شاعری اپنی تمام تر رعنائیِ فکر کے ساتھ پھل پھول رہی ہے۔ شاعری ہر دور میں حالات کی ترجمان رہی ہے سو آج بھی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ گذشتہ دور میں شاعری زیادہ تر علمی صلاحیتوں کا مظہر ہوتی تھی آج وہ معیار برقرار نہیں ہے اس میں سامعین کے ذوقِ پسندیدگی کا بھی کچھ دخل ضرور ہے۔ اس کے باوجود اچھی شاعری آج بھی تخلیق ہو رہی ہے اور مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ایسی امید ہے۔ اچھا شعر کہنے والوں کی تعداد کم رہے یہ بات الگ ہے۔

عبدالحی: مشاعروں سے کیا اردو ادب و زبان کو فروغ ہو رہا ہے؟

وقار مانوی: مشاعروں سے اردو زبان کی ترویج ضرور ہو رہی ہے۔ اردو زبان کی چاشنی کی وجہ سے غیر اردو داں طبقہ بھی اردو کی طرف آرہا ہے۔ ہاں معیاری ادب تخلیق کم ہو رہا ہے۔ سامعین کے معیارِ فہم کو بھی اس کا ذمے دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

عبدالحی: آپ کے بعد آپ کے گھر میں اردو شاعری کو کوئی آگے بڑھا رہا ہے؟

وقار مانوی: جہاں تک ادبی ذوق کا سوال ہے میں اپنے فرزند سے اچھی توقع رکھتا ہوں۔ وہ نہ فقط یہ کہ شعر فہم ہیں، موزوں طبع بھی ہیں۔ ان میں شاعرانہ صلاحیت بھی ہے لیکن شغلِ شاعری کے لیے جس قدر وقت چاہیے وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ میں خود بھی اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں ان کے شوقِ شاعری کو محدود رکھنا اچھا سمجھتا ہوں۔ میرا ایک شعر اس کا ترجمان ہے۔

خود کسی سطح پہ آنے میں بڑا وقت لگا
اپنی پہچان بنانے میں بڑا وقت لگا

اتنا ضروری ہے کہ انھیں وقت ملا تو وہ اپنی شعری صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں گے ویسے میرے پوتا پوتی بھی شاعری سے لگاؤ رکھتے ہیں۔

عبدالحی: نئی نسل کی اردو سے بڑھتی بے رغبتی پر آپ کیا کہیں گے؟

وقار مانوی: نئی نسل کی اردو سے بڑھتی ہوئی بے رغبتی مایوس کن ہے، تشویشناک ہے اس کا تدارک ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے بچوں کو اوائل عمر ہی میں یعنی پرائمری تک اردو ضرور پڑھانی چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں سرکاری محتاجی سے بچ کر خود پر اس کو فرض کی طرح لازم کرنا چاہیے۔

عبدالحی: اردو زبان کے فروغ کے لیے آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں؟

وقار مانوی: ہمارا یعنی خاص طور سے اردو داں طبقہ کا فرض ہے کہ نئی نسل کو اردو پڑھنے کی ترغیب دیں۔ اس میں غفلت نہ برتیں۔ اگر نئی نسل اپنی مادری زبان سے ناشناس رہی تو ہمارا ملی تہذیبی اثاثہ ضائع ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو اس نقصان کی تلافی ممکن نہ ہوگی۔ اپنے ماحول میں اردو کا چلن عام کریں اخبار و رسائل، کتب وغیرہ خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ شادی کارڈ وغیرہ اردو میں چھپوائیں۔ نیم پلیٹ اردو ہو تو بہتر ہے۔

عبدالحی: آپ نے کتاب دوست وہاب صاحب پر کتاب بھی ترتیب دی ہے اور پھر اس کتاب پر لکھے مضامین کی بھی کتاب چھپ گئی ہے۔ کیا کتاب در کتاب سے اردو زبان کو فائدہ ہو رہا ہے؟

وقار مانوی: عبدالوہاب خاں سلیم پر ترتیب کردہ 'وہاب نامہ' اصل میں ان کی کتاب دوستی کو اردو داں طبقہ تک پہنچانا اور وہاب صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا جو محض حقائق پر مبنی تھا۔ 'وہاب نامہ' کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے وہاب صاحب کے رفقا اور اہل خانہ کی خواہش تھی اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ ابھی یہ تجویز زیرِ غور ہی تھی کہ 'وہاب نامہ' پر کچھ نامور مشاہیر اہلِ قلم کے معیاری تبصرے (اچھی خاصی تعداد میں) مختلف رسائل میں شائع ہوگئے۔ ان تبصروں کے معیار کو دیکھ کر خیال آیا کہ انھیں محفوظ کرلیا جائے۔ لہٰذا ان تبصروں کو کتابی شکل دے دی گئی۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے جہاں عبدالوہاب خاں سلیم کے حلقۂ احباب (جو بہت وسیع اور کئی ممالک تک ہے) تک یہ کتابیں بھیجی گئیں اس کے چرچے ہوئے۔ اسے اردو زبان کے فروغ کا حصہ ضرور کہا جاسکتا ہے۔ اس عمل میں ایک منشا اور جذبہ یہ بھی شامل تھا کہ اردو والوں کو یہ معلوم ہو کہ اردو زبان کے رسیا ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ترغیب پا کر عبدالوہاب صاحب جیسے کچھ اردو کے متوالے پیدا ہوسکیں۔

عبدالحی: ہمارے قارئین کے لیے کوئی پیغام یا مشورہ

وقار مانوی: اردو دنیا کے قارئین کے لیے پیغام یہی ہے کہ اپنی زبان سے اخلاص کا رشتہ قائم رکھیں۔

عبدالحی: شاعری کے علاوہ کیا آپ کا کوئی اور مشغلہ رہا ہے مثلاً کسی کھیل وغیرہ میں دلچسپی!

وقار مانوی: شاعری سے پہلے مجھے کیرم کھیلنے کا شوق تھا۔ محض 12 سال کی عمر میں دہلی اسٹیٹ کیرم چمپئن شپ میرے نام ہو چکی تھی۔ کم عمری میں چمپئن بننے کا ریکارڈ آج تک قائم ہے۔

■

Dr. Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

Waqar Manvi
1681, Gali Takht Wali, Suiwalan,
Darya Ganj, New Delhi - 110002
Mob.:-9582059820, 9868241412
Email:- meemanjum@yahoo.co.in

دستاویز اور ٹیکسٹ کو فارمیٹ کرنا

Formatting Documents and Text

پیراگراف حصہ کا استعمال(Using Paragrah Section)

آپ جانتے ہیں کہ عموماً کوئی پیراگراف کئی جملوں(Sentences) کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن ایم ایس- ورڈ میں پیراگراف ایک جملہ، ایک لفظ، ایک نشان یا خالی لائن کا بھی ہوسکتا ہے، اگر اس کے آخر میں پیراگراف نشان آتا ہو۔ ٹیکسٹ ٹائپ کرتے وقت انٹر (Enter) کنجی دبانے سے یہ نشان آجاتا ہے اور ایک پیراگراف ختم ہوکر نیا پیراگراف شروع ہوجاتا ہے۔ عموماً پیراگراف نشان دکھائی نہیں دیتا، لیکن اگر آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں، تو Home ٹیب کے پیراگراف حصہ میں 'شو ہائڈ' (Show/Hide بٹن کو کلک کردیجیے۔

کوئی نیا پیرگراف بنانا بہت آسان ہے۔ اس کے لیے آپ کو صرف انٹر کنجی دبانی ہوگی۔ اسی طریقے سے، یعنی دو جملوں کے بیچ میں انٹر کنجی دباکر آپ کسی پیراگراف کو توڑ کر دو پیراگراف بھی بنا سکتے ہیں اور لگاتار دو بار انٹر دباکر خالی لائن کا پیراگراف بھی بنا سکتے ہیں۔

اگر آپ دو پیراگرافوں کو ملاکر ایک کرنا چاہتے ہیں، تو پہلے پیرگراف کے آخر میں آئے پیرگراف نشان کو ہٹا، یعنی Delete کردیجیے۔ اس سے دونوں پیرگراف مل کر ایک پیرگراف بن جائے گا۔ اسی طرح آپ خالی لائنوں کو بھی ہٹا سکتے ہیں۔

کسی پیراگراف کو ہٹانے کے لیے تھوڑی احتیاط برتنا ضروری ہے۔ اگر آپ پیراگراف کے مواد کو چن کر 'Delete' بٹن دبائیں گے یا 'Cut' یا 'Delete' ہدایت دیں گے تو وہ مواد تو غائب ہوجائے گا، لیکن پیراگراف نشان بنا رہے گا اور اس لیے خالی لائن بھی بنی رہے گی۔ لہٰذا، یا تو اس نشان کو بھی ہٹا دیجیے یا پیرگراف پورا چنیے۔ پورا پیرگراف چننے کے لیے ماؤس پوائنٹر اس پیراگراف میں کہیں بھی لاکر لگاتار تین بار کلک کیجیے یا پیراگراف کے بائیں حاشیے میں ماؤس پوائنٹر لاکر ڈبل کلک کیجیے۔ ایسا کرکے 'Delete' یا 'Cut' ہدایت دینے پر پورے پیرگراف کے ساتھ ہی پیراگراف نشان بھی غائب ہوجائے گا۔

ورڈ میں پیرگراف فارمیٹ کرنے کے لیے پیرگراف حصہ میں دیے گئے بٹنوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان بٹنوں اور آپشنز کے استعمال درج ذیل ہیں:

(i) پیرگراف کو قطار بند کرنا(Aligning Paragraphs): آپ کی دستاویز کی خوبصورتی اور کارکردگی کو بڑھانے کے لیے کئی بار یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی پیراگراف کی سبھی لائنیں بائیں حاشیہ سے ہٹاکر یا لائن کے بیچوں بیچ یا دائیں حاشیہ سے ہٹاکر یا دونوں سے ہٹاکر سیٹ کی جائیں۔ یہ کام پیراگراف حصہ کے الائنمنٹ (Alignment) بٹنوں کا استعمال کرکے بہت آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ پیراگراف حصہ میں اس کام کے لیے 4 بٹن موجود ہیں۔ بائیں جانب لگانا (Align Text left)، بیچ میں لگانا (Center)، دائیں جانب لگانا (Align Text Right) اور دونوں جانب لگانا (Justify)۔

ان بٹنوں کا استعمال دوسرے بٹنوں کی طرح ہی آسانی سے کیا جاتا ہے۔ جس پیراگراف کو آپ قطار بند یا سیٹ کرنا چاہتے ہیں، اس میں کرسر لے جائیے۔ اب اپنی ضرورت کے مطابق اوپر بتائے گئے چار بٹنوں میں سے کسی کو کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس پیرگراف کی سبھی لائنیں آپ کے ذریعے کلک کیے گئے بٹن کے مطابق سیٹ ہوگئی ہیں۔ باری باری سے سبھی بٹنوں کو کلک کرکے آپ ان کا اثر دیکھ سکتے ہیں۔

ایک ساتھ کئی پیراگرافوں یا ان کے حصوں کو چن کر آپ یہ کام ان سب پر ایک ساتھ بھی کرسکتے ہیں۔

(ii) **انڈینٹ سیٹ کرنا** (Setting Indents): کبھی کبھی کسی پیراگراف کی سبھی لائنوں کو دوسرے پیراگرافوں کے مقابلے تھوڑا اور دائیں جانب ہٹاکر سیٹ کرنے (Indenting) کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام بھی پیرگراف حصہ کے بٹنوں کے ذریعے آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس حصہ میں اس کے لیے دو بٹن ہوتے ہیں۔

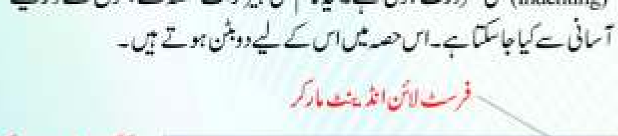

تصویر WD-3.12: رولر لائن میں لگے مارکر

'Increased Indent' اور 'Decrease Indent'، جن کا استعمال حاشیے کو بالترتیب ایک ٹیب اسٹاپ کے برابر زیادہ اور کم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ کوئی پیراگراف چن کر ان بٹنوں کو باری باری سے ایک یا دو بار کلک کرکے ان کا اثر دیکھیے۔

پیرگراف کو تھوڑا ہٹاکر سیٹ کرنے کا کام رولر لائن کی مدد سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کی ورڈ ونڈو میں رولر نظر نہیں آرہے ہیں، تو ربن کے View بٹن کے Show/Hide حصہ میں Ruler چیک باکس میں کلک کیجیے۔ ایم ایس- ورڈ میں افقی رولر

لائن کو غور سے دیکھیے۔ اس کے بائیں کنارے پر دو چھوٹے مثلث (Triangle) اوپر نیچے بنے ہوئے ہیں، ان کے نیچے ایک چھوٹا سا مستطیل (Rectangle) بنا ہوا ہے اور دائیں کنارے پر بھی ایک مثلث بنا ہوا ہے۔ انھیں مارکر کہا جاتا ہے۔ تصویر WD-3.12 میں یہ سبھی مارکر دکھائے گئے ہیں اور ان کی جانب نام سے اشارہ کیا گیا ہے۔

ان میں سے فرسٹ لائن انڈینٹ مارکر کا استعمال کسی پیراگراف کی پہلی لائن کو دائیں یا بائیں جانب ہٹا کر سیٹ کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہینگنگ انڈینٹ مارکر استعمال پیراگراف کی بقیہ لائنوں کو دائیں یا بائیں جانب ہٹا کر سیٹ کرنے میں کیا جاتا ہے۔ کوئی پیراگراف چن کر آپ ان مارکروں کو ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر ادھر اُدھر کھینچ لے جائیے اور اس کا اثر دیکھیے۔

لیفٹ انڈینٹ اور رائٹ انڈینٹ مارکروں کا استعمال پورے پیراگراف کو الگ حاشیہ دینے میں، یعنی کسی پیراگراف کو دوسرے پیراگرافوں سے کم یا زیادہ حاشیہ دینے میں کیا جاتا ہے۔ آپ انھیں ماؤس پوائنٹر سے پکڑ کر دائیں یا بائیں سرکا سکتے ہیں اور پیرگراف کو مناسب جگہ پر لے جا کر سیٹ کر سکتے ہیں۔ جب آپ لیفٹ انڈینٹ مارکر کو سرکاتے ہیں، تو فرسٹ لائن انڈینٹ اور ہینگنگ انڈینٹ مارکر بھی اس کے ساتھ ہی سرکتے ہیں۔ ان مارکروں کے استعمال کی مشق کیجیے۔

(iii) لائن اسپیسنگ (Line Spacing): ایم ایس-ورڈ میں آپ کسی پیرگراف کی لائنوں کی دوری، یعنی ان کے بیچ کی جگہ (Line Spacing) بھی کم یا زیادہ کر سکتے ہیں۔ لائن سپیسنگ تین طرح سے کی جا سکتی ہے۔ واحد (Single)، ڈیڑھ (One and Half) اور ڈبل (Double)۔ عام طور پر پیراگرافوں میں واحد اسپیسنگ کی جاتی ہے، جو متعینہ پیمانہ ہوتا ہے۔

لائن اسپیسنگ بدلنے کے لیے یا تو نقطۂ شمول (کرسر) کو اس پیرگراف میں لے جائیے یا اوپر بتائے گئے طریقوں سے ایک یا زیادہ پیرگراف کو چن لیجیے۔ اب پیرگراف حصہ میں Line Spacing کے ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں ضرورت کے مطابق 1.0 ,1.15، 2.0,1.5، 2.5 یا 3.0 کلک کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ چنے ہوئے پیراگرافوں میں لائن اسپیسنگ آپ کے ذریعے دی گئی ہدایت کے مطابق بدل گئی ہے۔

Add Space Before Paragraph اور Add Space After Paragraph آپشنز کی مدد سے آپ چنے ہوئے پیراگراف سے پہلے یا بعد میں خالی جگہ چھوڑ سکتے ہیں۔ 'Line Spacing Options...' کلک کرنے پر پیراگراف ڈائیلاگ باکس کھلتا ہے، جس کے بارے میں ہم آگے پڑھیں گے۔

(iv) **پیراگراف اسپیسنگ** (Paragraph Spacing): ایم ایس-ورڈ میں آپ دو پیراگرافوں کے بیچ کی جگہ (Paragraph Spacing) بھی کم یا زیادہ کر سکتے ہیں۔ پیراگراف اسپیسنگ کرنے کے لیے ہمیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ کسی پیراگراف سے پہلے اور س کے بعد کتنی جگہ خالی چھوڑی جائے گی۔ اس کام کے لیے کسی ٹول بار میں کوئی بٹن موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ کام پیراگراف ڈائیلاگ باکس کے ذریعے کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں آگے بتایا گیا ہے۔

پیراگراف کا ڈائیلاگ باکس (Paragraph Dialogue Box): پیرگرافوں کے بارے میں اوپر بتائی گئی سبھی سیٹنگ آپ پیراگراف ڈائیلاگ باکس کے ذریعے ایک ساتھ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ڈائیلاگ باکس کھولنے کے لیے پیراگراف حصہ میں دیے گئے پیراگراف ڈائیلاگ باکس لانچر پر کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر تصویر WD-3.13 کی طرح پیراگراف ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔

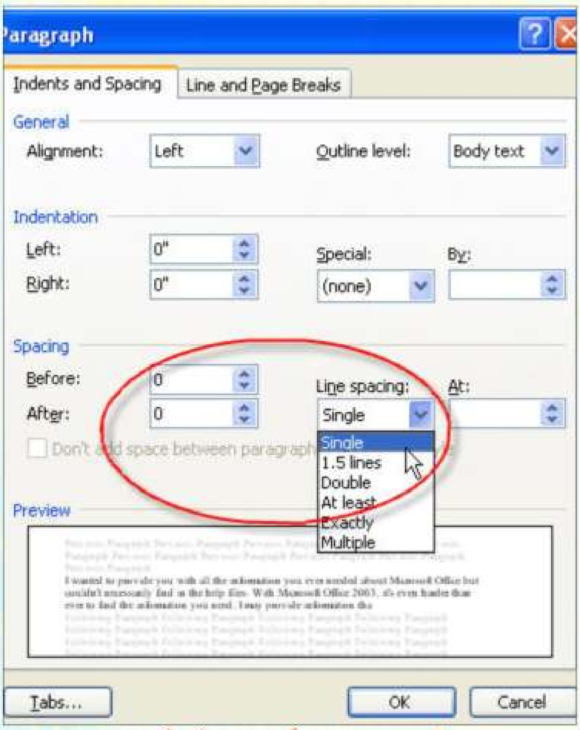

تصویر WD-3.13: پیراگراف کا ڈائیلاگ باکس

اس ڈائیلاگ باکس میں دو ٹیب شیٹ ہیں، جن میں سے پہلی، جو زیادہ اہم اور کارگر ہے، تصویر WD-3.13 میں دکھائی گئی ہے۔ اس ٹیب شیٹ میں الائنمنٹ لسٹ باکس میں پیراگراف کو ایلائن کرنے کا آپشن چنا جاتا ہے۔

'Indention' والے حصہ میں پیراگراف کے بائیں جانب اور دائیں جانب کچھ جگہ چھوڑنے کے لیے بالترتیب 'Left' اور 'Right' کے اسپن باکسوں میں سیٹنگ کی جاتی ہے۔ اسی حصے میں 'Special' لسٹ باکس میں سے 'First Line' کو چن کر اور اس کے ساتھ کے اسپن باکس میں حاشیہ سیٹ کر کے آپ پہلی لائن کے لیے خاص انڈینٹ سیٹ کر سکتے ہیں یا اسی لسٹ میں سے 'Hanging' آپشن کو چن کر اور اس کے ساتھ کے اسپن باکس میں حاشیہ سیٹ کر کے آپ بقیہ لائنوں کے لیے انڈینٹ سیٹ کر سکتے ہیں۔

'Spacing' والے حصے میں پیراگراف سے پہلے اور بعد میں کچھ خالی جگہ چھوڑنے کے لیے بالترتیب 'Before' اور 'After' کے اسپن باکسوں میں سیٹنگ کی جاتی ہے۔ اسی حصے میں 'Line Spacing' لسٹ باکس میں سے مناسب آپشن چن کر آپ لائن اسپیسنگ بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔

اس ڈائیلاگ باکس میں 'Preview' نام والی مستطیل جگہ میں آپ اپنی سیٹنگ کا اثر فوراً دیکھ سکتے ہیں۔ مطمئن ہونے پر 'OK' بٹن کو کلک کیجیے، جس سے آپ کے ذریعے کی گئی سیٹنگ چنے ہوئے پیراگراف یا پیرگرافوں پر لاگو ہو جائے گی اور یہ ڈائیلاگ باکس بند ہو جائے گا۔

یہاں ہم پیچھے بنائی ہوئی اپنی دستاویز 'My First Word Document' کے ساتھ اوپر بتائے گئے فارمیٹنگ کے مختلف طریقوں کی مشق کریں گے۔ سب سے پہلے اس ڈاکیومنٹ فائل کو کھول لیجیے اور اس دستاویز کے مختلف پیراگرافوں کا فارمیٹ درست کرنے کے لیے تیار ہو جائیے۔

(جاری)

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

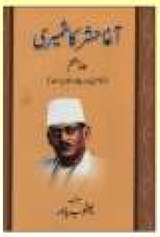

آغا حشر کاشمیری (جلد ہشتم)

مرتب: یعقوب یاور
صفحات: 460، قیمت: 215 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر عادل حیات
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

آغا حشر کاشمیری اردو کے ایک ایسے ادیب تھے، جن کی تخلیقات کی کئی جہتیں ہیں۔ ان کی ایک حیثیت تو ڈراما نویس کی ہے، جس کی بنیاد پر انھیں اردو ڈرامے کا شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے۔ آغا حشر کاشمیری کی دوسری حیثیت ایک شاعر کی بھی ہے اور میں اسے آغا صاحب کی تخلیقی جہات کی بنیادی حیثیت سمجھتا ہوں۔ جس میں ان کی ذاتی اور خارجی زندگی کے تمام پیچ و خم کا نچوڑ تخلیقی سطح پر منقسم ہوگیا ہے۔ غزل اور نظم کی مختلف جہات پر مشتمل ان کی شاعری میں زندگی کے مختلف تجربات، احساسات اور مشاہدات کی دنیا آباد ہوگئی ہے۔

یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ آغا حشر کاشمیری کی کتابیں ان کے چاہنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل تھیں، جسے یعقوب یاور صاحب نے مسلسل جانکاہی کے بعد کئی جلدوں میں اکٹھا کردیا ہے۔ یہ تمام جلدیں 'آغا حشر کاشمیری' کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی سے شائع ہوچکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی آٹھویں کڑی ہے۔ پہلی سات جلدوں میں ظاہر ہے کہ آغا صاحب کے ڈراموں کو شامل کیا گیا ہوگا۔ اس جلد میں ان کی شاعری کو جگہ دی گئی ہے۔

اس جلد میں سب سے پہلے آغا حشر کاشمیری کے قلمی چہرے کو جگہ دی گئی ہے۔ جسے خواجہ حسن نظامی نے 'ہندوستانی شیکسپیئر آغا حشر کی صورت و سیرت' کے عنوان سے 1922 میں تحریر کیا تھا۔ اسے پڑھ کر آغا صاحب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اس کے بعد عرضِ ناشر کے عنوان سے مرزا منے کی 1968 کی لکھی ہوئی تحریر شامل ہے۔ اس تحریر کو شاملِ کتاب کرنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمشیرزادہ آغا حشر کاشمیری مرحوم نیرنگ کا شکریہ نامہ 'دیر آید درست آید: آغا حشر کے انتقال کے بعد' پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس چھوٹی سی تحریر میں آغا حشر کاشمیری کے انتقال کے بعد ان پر چھپنے والی مختلف تحریروں کا حوالہ موجود ہے۔ یعقوب یاور صاحب نے 'دیباچے' میں آغا حشر کی زندگی کے کوائف بیان کرنے کے بعد ان کی تخلیقی جہات پر روشنی ڈالی ہے۔ آغا صاحب کے ڈراموں پر گفتگو کرتے ہوئے آٹھویں جلد میں ان کی شاعری کو شامل کرنے کا جواز بھی بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ آغا صاحب کی شاعری بالخصوص غزلیہ شاعری کی خوبی و خرابی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس جلد کے مشمولات کو یعقوب یاور نے پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے 'اخبارات و رسائل میں آغا حشر کاشمیری' کے تحت کل گیارہ ذیلی عنوانات لگائے گئے ہیں۔ یکم مئی 1935 میں چھپی آغا صاحب کے انتقال کی خبر کو 'آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کا انتقال: ہندوستان کا قومی نقصان' کے تحت جگہ دی گئی ہے۔ اسی طرح 30 جون کو شیکسپیئر ہند آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کی یاد میں قومی دن منائے جانے کی قرارداد پاس کی گئی۔ اس قرارداد پر علامہ محمد اقبال سے لے کر عبدالحمید خاں تک کل پینتالیس شعرا و ادبا نے دستخط کیے، جو 22 جون 1935 کے زمیندار، لاہور میں شائع ہوئی۔ اسے بھی ایک طویل عنوان کے تحت کئی صفحوں پر جگہ دی گئی ہے۔ 'یادِ رفتگاں' کے تحت آغا حشر کاشمیری پر جلال انور کا ایک مضمون سیارہ ڈائجسٹ، اپریل 1965 کے شمارے میں چھپا تھا، یہ مضمون بھی کتاب کی زینت بڑھا رہا ہے۔ ان کے علاوہ 'آغا حشر' عبدالقدوس نیرنگ کا مضمون ہے، جس میں مرتب نے دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے اس مضمون سے ایسے اقتباسات کو ہی شاملِ اشاعت کیا ہے، جو حشر صاحب سے متعلق چند صحیح واقعات اور کارآمد باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عبدالقدوس نیرنگ کا لکھا ہوا ایک اور مضمون 'کلامِ حشر پر ایک نظر' بھی توجہ مبذول کراتا ہے۔ پچپن صفحات پر پھیلا یہ مضمون آغا صاحب کی شاعری کا احاطہ اس کی فنی و فکری خصوصیات کے ساتھ کرتا ہے۔ اسی باب میں آغا صاحب کی غزلیں اور دیگر نگارشات شامل ہیں۔

دوسرا باب 'پیامِ حشر' میں سات ذیلی عنوانات ہیں۔ یہ باب تعارف سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد 'شکریہ یورپ' کے عنوان سے عبدالقدوس نیرنگ انصاری کا لکھا

ہوا ایک مضمون ہے۔ اسلام نامہ کے مصنف مسلم الحریری کی لکھی ہوئی تحریر 'ایک نظر' مولانا محمد علم الدین سالک کا مطبوعہ مضمون 'آغا حشر کاشمیری مرحوم' اور 'تمہید' کے عنوان سے خواجہ حسن نظامی کی چھوٹی سی تحریر شامل کی گئی ہے۔ 21 مارچ 1913 میں پڑھی گئی آغا صاحب کی نظم 'شکریہ یورپ اور موجِ زمزم' بھی دکھائی دیتی ہے۔ 'پیام حشر' دراصل آغا صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے، اس کے بعد دوسرا شعری مجموعہ 'تجلیاتِ حشر' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کم و بیش وہی تخلیقات شامل کی گئیں جو کہ ان کے پہلے مجموعے میں شائع ہوچکی تھیں۔ زیرتبصرہ کتاب کے تیسرے باب 'تجلیاتِ حشر' کا دیباچہ 'آغا حشر کی شاعری' کے نام سے مرتضیٰ احمد خان میکش نے لکھا تھا۔ چوتھے باب کا عنوان 'اردو ڈراموں سے' ہے۔ اس باب میں شعری ہیئت میں لکھے گئے آغا صاحب کے ڈرامے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں دوسرے ڈراموں کے شعری حصے کو بھی اسی باب میں جگہ دی گئی ہے۔

اس جلد کا آخری باب دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے مرتب نے اس باب کا نام "چند اہم دستاویزات" تجویز کیا ہے۔ اس حصے میں قطعہ تاریخ وفات غنی شاہ ولد آغا حشر کاشمیری، نکاح نامہ آغا حشر کاشمیری، سپاس نامہ، آغا حشر کے تحریر کردہ تعارف، خطوط اور حشر سے متعلق خطوط وغیرہ شامل ہیں۔ جن سے آغا صاحب کی شخصیت، ان کی نجی، سماجی اور ادبی زندگی کو سمجھنے کا مزید موقع ملتا ہے۔

'آغا حشر کاشمیری' کی پہلی سات جلدوں کی اہمیت اپنی جگہ، آٹھویں جلد تخلیقات کی گوناگونی کی وجہ سے زیادہ اہم ہوگئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ذہن پر آغا حشر کاشمیری کی ایک ایسی تصویر منعکس کرتا ہے، جس میں تمام رنگوں کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی چیز اس جلد کی اہمیت ومقبولیت کی ضامن ثابت ہوگی۔ میں اس موقع پر یعقوب یاور اور قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

فلکیاتی نظارے

مصنف: انیس الحسن صدیقی

آزادی کے بعد سے ہی ہندوستان نے تمام طرح کی ترقی کے لیے خلا میں کام کرنا شروع کردیا تھا۔ اور ملک کی اسپیس ایجنسی اسرو نے اپنی دیسی ساخت کے مصنوعی سیارچے خلا میں داغ کر ہندوستان کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا کردیا ہے۔ آج ان مصنوعی سیارچوں کی وجہ سے ٹیلی فون، موبائل، انٹرنیٹ، وائی فائی، جی پی ایس، ویڈیو کانفرنسنگ، ٹی وی کے توسط سے تعلیمی پروگرام اور طبی علاج، بحری جہازوں کی دیکھ بھال، ملک کے حفاظتی اقدامات، سونامی، طوفان اور موسم کی پیشین گوئیاں وغیرہ ہر میدان میں جدید آلات کا استعمال اور جدید طرز زندگی علم ہیئت یا علم مکاں کا ذریعہ ہی سے ملک کی روز بروز ترقی ہورہی ہے۔

زیرنظر کتاب 'فلکیاتی نظارے' اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں انیس الحسن صدیقی نے بچوں کے لیے فلکیات سے متعلق مضامین آسان زبان میں تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے اس موضوع کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اکیسویں صدی میں انسان چاند اور مریخ پر قدم جمانے کی سوچ رہا ہے۔ ایسی صورت میں بچوں کے اندر فلکیات سے متعلق علم ابتدائی درجات ہی سے دینی چاہیے تاکہ اس موضوع میں دلچسپی ہو اور آگے چل کر ملک کے لیے آسمانوں پر کمندیں ڈال سکیں۔ یہ کتاب فلکیاتی نظام اور اس کی اہمیت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

74 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 60 روپے ہے۔

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں

مصنف: انیس الحسن صدیقی

زیرتبصرہ کتاب 'خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں' انیس الحسن صدیقی کی ہے جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے خلائی پروگرام کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے مصنوعی سیارچے کا تعارف کرایا ہے اور ان سیارچوں سے کیا کام لیے جارہے ہیں اس کو مختصراً بتایا ہے۔ ساتھ ہی ان خلائی مشن اور مصنوعی سیارچوں کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا ہے جس سے بچوں میں مزید جستجو پیدا ہوگی۔ ہندوستان میں کہاں کہاں خلائی مراکز ہیں اور ان مراکز سے کون سے مصنوعی سیارچے خلا میں بھیجے گئے ہیں اور وہ کیا کام کرتے ہیں اس پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

کتاب میں مصنوعی سیارچے کی رنگین تصاویر نے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے کیوں کہ جس عمر کے بچوں کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کی رسائی مصنوعی سیارچے کی تصاویر تک بآسانی نہیں ہوتی ہے۔ ان تصاویر کی مدد سے سیارچوں کے نام اور ان کے کام کو یاد رکھنے میں آسانی ہوگی۔ مجموعی طور پر یہ کتاب بچوں کے لیے مفید ہے۔ کونسل نے خلائی مشن اور مصنوعی سیارچے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ایسی کتاب شائع کرکے بہتر کام کیا ہے۔

50 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 50 روپے ہے۔

گیلیلیو کی کہانی ان کی زبانی

مصنف: انیس الحسن صدیقی

زیرنظر کتاب 'گیلیلیو کی کہانی ان کی زبانی' انیس الحسن صدیقی کی تحریر کردہ ہے۔ اس میں انھوں نے بچوں کے اندر سائنسی بیداری کے لیے سائنس داں گیلیلیو کی زندگی کے ہر پہلو کو آسان زبان میں بیان کیا ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ کہانی گیلیلیو کی ہی زبان میں کہی گئی ہے، جو بچوں کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتی ہے۔ کتاب میں تصویروں کے مدد سے گیلیلیو کی ایجادات اور کارنامے کو سمجھایا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی میں گیلیلیو کی اچھی اور بری دونوں عادتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بری عادتوں کی وجہ سے انھیں اپنی زندگی میں بہت ساری مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ گیلیلیو کی دونوں عادتوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ بچے بری عادتوں سے پرہیز کریں اور اچھی عادتوں کو اپنائیں۔

کتاب کے مطالعے سے گیلیلیو کی سائنس سے متعلق جدوجہد سے بچوں کے اندر سائنسی بیداری پیدا ہوگی۔ کونسل نے اس طرح کی کتابوں کو شائع کرکے بچوں میں ایک طرف سائنسی بیداری لانے کی کوشش کی ہے تو وہیں اردو زبان کو فروغ مل رہا ہے۔

38 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 40 روپے ہے۔

مبصر: ڈاکٹر واثق الخیر
جوگابائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی

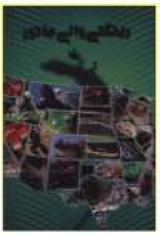

رینگنے والے جانور

مصنف: قیصر سرمست

صفحات: 84، قیمت: 22 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ثناء رحمٰن

پرنسپل علامہ اقبال اسکول میانسرائے سنبھل، یوپی

بچوں کے لیے لکھنا، پھر علمی، سائنسی اور معلوماتی موضاعات پر لکھنا۔ بڑا مشکل عمل ہے۔ کیونکہ ان موضوعات پر لکھنے کے لیے ٹیکنکل زبان استعمال کی جاتی ہے۔ جن کی مخصوص اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ اس لیے زبان کچھ مشکل و دقیق ہو جاتی ہے۔ جو مطالعے میں بچوں کی دلچسپی کم کر دینے کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ مگر قیصر صاحب کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان موضوعات پر بھی آسان زبان اور دلچسپ انداز میں مضامین لکھ سکتے ہیں۔ جس کا ثبوت ان موضوعات پر تحریر شدہ ان کی تصانیف ہیں۔ آپ کی ایسی ہی تصنیف 'رینگنے والے جانور' اس وقت راقم الحروف کے پیش نظر ہے۔

یہ کتاب ان کیڑے مکوڑوں پر لکھی گئی ہے جو رینگتے ہیں۔ ان میں پہلا مضمون مگر مچھ، گھڑیال اور الیگیٹر، دوسرا کچھوے، تیسرا زہریلے سانپ، چوتھا، ڈائنوسارس اور پانچواں چند اور رینگنے والے جانوروں پر مشتمل ہے۔ اس طرح اس کتاب میں کل پانچ مضامین ہیں۔ ان کے بعد 'ہرزہ سرائی' کے عنوان سے کتاب کا نچوڑ یا ماحصل پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں 'کتابیات' کے عنوان سے ماخذ کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کے پہلے مضمون کا آغاز 'مگر مچھ کی کمی کے اسباب' سے ہوتا ہے۔ جس میں مصنف نے ان کی کم ہوتی ہوئی وجہ کو جاننے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد اس کی افزائشِ نسل پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں اس کی پیدائش سے لے کر پرورش تک کے مراحل سے متعارف کرایا گیا ہے۔ مگر مچھ کی اہم قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں ان قسموں کی کل تعداد 52 بتائی گئی ہے۔ مگر مچھ کے شکار کرنے کا طریقہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں ان کی قدامت دس لاکھ سال تسلیم کی گئی ہے۔ مگر مچھ کے حقیقت عنوان کے تحت ان پر بہت اہم معلومات قلم بند کی گئی ہے

کتاب کا اگلا مضمون 'کچھوے' کے تعلق سے ہے۔ شروع میں ہی کچھوے کی 200 قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جن میں بحرِ ہند میں پائے جانے والے'' گلا پگوس'' Galapagos کو جس کا وزن 400 پونڈ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کو دنیا کا سب سے بڑا کچھوا تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ عمر سو سال ہوا کرتی ہے۔ کتاب میں زمینی کچھوے کوٹراپسن، یونانی کچھوا، ستارریڈ، گوفر، بوریشد، گلا پگوس کا دیو، یورپی جو ہڑا کا کچھوا، اسپائن کا ترا پن، کارولینا بکس، مسطح، خاردار، ہیرے کی پیٹھ والا، پٹینڈ کچھوا، بڑے سر کا کچھوا، کستوری اور کیچڑی کچھوا، جھپٹنے والا کچھوا، سمندری کچھوا، سبز کچھوا، عقاب کی چونچ والا کچھوا، سر پھٹول کرنے والا کچھوا، چرمی والا، سانپ کی گردن والے کچھوے، گرگٹ گر پوڈ، ریش والا کچھوا، ماتا ماتا لمبی گردن والا، چکنی ڈھال کے کچھوے، بنگو ماچکنی ڈھال والے کچھوے کے الگ الگ ناموں سے 30 اقسام کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں ان کا تعارف اس ڈھنگ سے کرایا گیا ہے کہ قاری کچھوؤں کے تعلق سے بہت کچھ جان جاتا ہے۔

ایک مضمون ہمارے دیرینہ دشمن مگر جانے مانے رینگنے والے جانور 'سانپ' کے تعلق سے ہے۔ اس مضمون میں قیصر صاحب نے سانپ کے حوالے سے بڑی اچھی معلومات جمع کر دی ہے۔ جس کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا میں سانپوں کی 2500 قسمیں پائی جاتی ہیں۔ مگر اس میں سے صرف 200 کو ہی خطرناک مانا گیا ہے۔ ان کے مطابق سانپ کے کاٹنے پر اکثر لوگ اس کے زہر سے نہیں بلکہ ہیبت سے مر جاتے ہیں۔ انہوں نے ہر سال سانپ کے ذریعے ڈسے جانے پر ہندوستان میں 20000 لوگوں کی تعداد جب کہ برطانیہ میں اس طرح مرنے والوں کی تعداد زیرو بتائی ہے۔ اس کتاب میں سانپ کی سب سے زیادہ خطرناک نسل میں ناگ راج King Cobra کو تسلیم کیا ہے۔ جن کی لمبائی 18 یا 19 فٹ تک بتائی گئی ہے۔ افریقہ کے سانپ پف اڈر Puff Adder کو بے حد زہریلا بتایا گیا ہے۔ یورپ کے ملک آئرلینڈ کو سانپ سے پاک صاف Snake Free ملک قرار کیا گیا ہے۔

ڈائنوسارس Dianosaurs کو زمین پر رہنے والے جانوروں کا باوا آدم کہا گیا ہے۔ ان کی قدامت آج سے 20 کروڑ سال پہلے تسلیم کی گئی ہے۔ اور انسان کے وجود میں آنے سے تین کروڑ سال پہلے ان کے وجود کا خاتمہ تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ بڑی حیرت انگیز معلومات ہے۔ جس سے دنیا کے سب سے لحیم و شحیم اور عظیم الجثہ جانور کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون میں اس کے حوالے سے اور بھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ جن میں کچھ گوشت خور اور کچھ سبزی خور تھے۔ مگر سب ہی انڈے دیا کرتے تھے۔ جن کے ذریعہ ان کی افزائش نسل ہوا کرتی تھی۔ اگر چہ ان میں سے کچھ کے دو پیر بھی ہوتے تھے۔ تاہم ان کا شمار بھی رینگنے والے جانوروں میں ہی کیا جاتا تھا۔

ایک مضمون 'چند رینگنے والے جانور' عنوان سے ہے۔ جس میں کچھ اور رینگنے والے جانوروں Reptile کا تعارف کرایا ہے۔ جن کا موڈو مانیٹر Komodomonitor، گیلا عفریت Gila Monstor، ڈیڈ لیزرڈ Dead Lizard، لینین اگوانا Linneani Guana، دودھاری مانیٹر Two Baneded Moniter، جھالر والا گرگٹ Frilled Lizard، بحری اگوانا Marine Iguana، اڑنے والا جیکو Flying Geckow اور ٹواٹارا Tuatara کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اس کے ماحصل کے طور پر کتاب کا نچوڑ دیا گیا ہے۔ کتاب اپنے مواد کی وجہ سے تو قابل تعریف ہے ہی۔ جگہ جگہ پر مناسب تصاویر نے اس کی افادیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ یہ کتاب اپنے مواد، معیاری کمپوزنگ، عمدہ طباعت اور بہترین کاغذ کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کو خریدا جائے اور بہ غور مطالعہ کیا جائے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

ابن صفی کا ادبی نصب العین: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

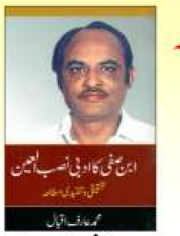

مصنف وناشر: محمد عارف اقبال
صفحات: 312 قیمت: 300 روپے
مبصر: ڈاکٹر سید احمد قادری
7 نیو کریم گنج، گیا۔ 823001 (بہار)

محمد عارف اقبال، ابن صفی کے ان شیدائیوں میں ہیں، جو ابن صفی کے ساتھ ہونے والی ادبی بددیانتی کے خلاف اپنی تحقیق وتنقید کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ ابن صفی کا ادب عالیہ میں اہم مقام ہے۔ زیر نظر کتاب کا انتساب بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔ کتاب کا انتساب اس طرح درج ہے........

''اردو کے ان ادیبوں، شاعروں، نقادوں کے نام جنھوں نے ابن صفی کی تحریروں سے بھرپور استفادہ کیا لیکن ادب میں ان کے مقام کے اب بھی شاکی ہیں اور اپنے قول و عمل سے ابن صفی کے ادبی نصب العین کو نہ صرف نظر انداز کر رہے ہیں بلکہ اردو زبان وادب کے ارتقائی عمل میں ناقابل تلافی نقصان کے مرتکب ہو رہے ہیں۔''

اس انتساب کے بعد کتاب کی فہرست پر نظر ڈالی جائے، تو یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ محمد عارف اقبال اپنی تحقیقی اور تنقیدی بصیرتوں سے اس بات کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں کہ ابن صفی کی ناول نگاری کو کسی ایک خانے میں محدود نہیں کیا جا سکتا ہے اور ان کا نصب العین ہی ادبی تھا۔ اس کے لیے مصنف نے اپنی کتاب کی فہرست میں جو عنوانات قائم کیے ہیں، وہ بھی دلچسپ اور توجہ طلب ہے۔ یہ چند عنوانات دیکھیے:

'' ابن صفی کا تخلیقی وِژن اور نقادوں کا رویہ، ابن صفی نے اردو کے خلاف منصوبہ بند سازش کو ناکام کر دیا، اقوام عالم سے تازہ حالات سے باخبر کرنے والا مصنف، عدم واقفیت یا تجاہل عارفانہ، ابن صفی کی کردار نگاری اور ادیبوں ونقادوں کی بے خبری، ادب میں 'نظریات'' کا جبر، ابن صفی کا اعلیٰ ادبی ذوق، مقصدی ادب کا حامل عظیم مصنف، جاسوسی ادب کا نصب العین، ابن صفی کے ناولوں کے آفاقی موضوعات، عصر حاضر کے سلگتے ہوئے مسائل اور ابن صفی کا تخلیقی نثری ادب، ابن صفی کے ناولوں میں موضوعات کا تنوع، ادب میں سماجی شعور سے جوڑنے والا ادیب، فکشن میں منظر نگاری: ابن صفی کا منفرد فن، ابن صفی: 'ادب برائے زندگی' کا نقیب، ادب کا سماجی وتہذیبی مطالعہ، اردو کی فرسودہ روایات سے انحراف کرنے والا ادیب، ابن صفی کا تخلیقی وادبی رجحان ......''

ان تمام عنوانات کے تحت لکھی گئی عبارتوں سے بلاشبہ ابن صفی کا اردو ادب عالیہ میں ایک منفرد اور اہم مقام ثابت کرنے میں کتاب کے مصنف پوری کامیاب ہیں اور انتظار حسین جیسے لوگوں کی باتوں کو رد کرتے ہیں جو ابن صفی کی عظمت کا اعتراف کرنے کی بجائے پوچھتے نظر آتے ہیں کہ 'کون ابن صفی؟' یا سید احتشام حسین جیسے جید ناقد ابن صفی کے ناولوں کی سحر انگیزی کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن ادب میں انھیں کوئی مقام دینے کو تیار نہیں ہیں۔

ابن صفی کے فن کی یہ سحر انگیزی ہے کہ 1980 کے بعد یعنی ان کے انتقال کے بعد جب ان کے ناولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، تب بھی ابن صفی لوگوں کے دل و دماغ میں اسی طرح بسے رہے اور ان کی عظمت کے اعتراف میں جگہ جگہ سیمینار وغیرہ کا انعقاد ہوتا رہا۔ اسی دوران ابن صفی کے کئی ناولوں کو شمس الرحمٰن فاروقی نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ 17 مارچ 2007 کو ساہتیہ اکادمی نے Ibn safi : A Neglected bestseling Author کے عنوان سے اور دلّی اردو اکادمی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے 14-16 دسمبر 2012 کو ابن صفی کی حیات وخدمات کے زیر عنوان ایک شاندار سیمینار منعقد کیا گیا۔ ابن صفی پر مسلسل کام ہو رہا ہے۔ پاکستان میں ایک طرف جہاں راشد اشرف، محمد حنیف، مشتاق احمد قریشی، خرم علی شفیق، عزیز جبران انصاری اور بدر منیر وغیرہ ابن صفی کے ناولوں کی مختلف جہتوں پر تحقیقی وتنقیدی کام کر رہے ہیں، وہیں بھارت میں محمد عارف اقبال نے ابن صفی کی شخصیت وفن پر کام کرتے ہوئے انھیں ادب عالیہ میں اعلیٰ مقام دینے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ اس کتاب سے قبل عارف اقبال نے 'ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ' جیسی اہم کتاب جسے ابن صفی کا انسائیکلو پیڈیا بتایا گیا ہے کی ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ابن صفی کے ناولوں کی اکسٹھ جلدوں میں کلیات ترتیب دے کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ابن صفی نے تقریباً ڈھائی سو جاسوسی ناول لکھے اور خاص بات یہ رہی کہ ہر ناول ایک دوسرے سے موضوع اور مواد کے لحاظ سے جدا اور منفرد ہوا کرتا تھا۔ کردار نگاری میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں، کرنل فریدی، کیپٹن حمید، عمران، قاسم وغیرہ کے کردار بالکل جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے ابن صفی کا موازنہ اگاتھا کرسٹی سے کرتے ہوئے اس بنیاد پر ابن صفی کو اس سے بڑا فنکار قرار دیا ہے کہ ان کے ناولوں میں جاسوسی کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کی جس طرح چاشنی پائی جاتی ہے، وہ اگاتھا کرسٹی کے یہاں نہیں ہے۔ عالمی سطح پر جاسوسی ناول نگاروں سے موازنہ کے لیے کتاب کے مصنف نے معروف صحافی حسن کمال کی ایک تحریر کو پیش کیا ہے، جس میں حسن کمال ابن صفی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ...... ''اگر یہ کہا جائے کہ جیمس ہیڈلی چیز اور ابن صفی، سر آرتھر کانن ڈائل (شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن جیسے کرداروں کے خالق) کے بعد دو مختلف زبانوں میں دنیا کے سب سے بڑے جاسوسی ادب کے تخلیق کار تھے تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا...''

محمد عارف اقبال نے اپنی اس کتاب میں ابن صفی کے ادبی نصب العین کے حوالے سے اتنے سارے مواد جمع کر دیے ہیں کہ اب کوئی بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں کرے گا کہ ابن صفی کا ادب میں کوئی مقام نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد عارف اقبال نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں سے ابن صفی کی ادبی حیثیت کو پوری طرح مستحکم کر دیا ہے، اپنی اس عرق ریزی کے لیے محمد عارف اقبال یقینی طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات

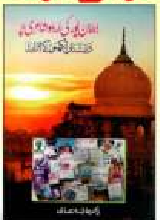

مصنف: ڈاکٹر عارف انصاری
صفحات: 525، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2018
ناشر: فاضلی اردو لٹریری اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہان پور
مبصر: عظمت النساء
C-162، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

زیر تبصرہ کتاب برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات' ڈاکٹر عارف انصاری کا تحقیقی مقالہ ہے جس میں انھوں نے نہایت منصفانہ اور ایمانداری سے شعرائے برہان پور پر لکھنوی اثرات کو تاریخی حوالوں کے ساتھ منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں تاریخی شہر برہان پور کے آباد ہونے کی وجہ اور وجہ تسمیہ سے لے کر برہان پور میں اردو زبان وادب کی جائے پیدائش اور زبان کے تشکیلی سفر کا منزل بہ منزل نقشہ کھینچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب کا موضوع یقیناً چونکا دینے والا ہے کہاں لکھنؤ اور کہاں برہان پور دونوں شہروں کے درمیان کافی فاصلہ ہے دونوں شہروں کی تہذیبیں الگ طور طریقے جدا جدا ہیں پھر شعر وادب میں یہ کیسی یکسانیت ہے اور کس طرح برہان پور کے شعراء کا ذہن لکھنوی طرز سخن سے متاثر ہوا اور برہان پور کی اردو شاعری میں لکھنوی عناصر کس طرح

آئے ان تمام پہلوؤں پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ پیش نظر کتاب میں مصنف نے نہ صرف شعرائے برہان پور کے کلام میں لکھنوی اثرات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کے ثبوت میں انھوں نے شعرائے برہان پور کے کلام کو بطور نمونہ بھی پیش کیا ہے، ان نمونوں کے ذریعے لکھنوی اثرات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مصنف نے کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، اس کتاب کا ہر باب اپنی خصوصیت کے اعتبار سے منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ باب اول میں برہان پور کے تاریخی وسیاسی پس منظر کے ساتھ ساتھ اس شہر کا سنہ وقوع اور وجہ تاسیس کا ذکر کرتے ہوئے جہاں ایک طرف اس تاریخی شہر کے سیاسی ادوار مثلاً فاروقی دور، مغلیہ دور، نظام آصف جاہی دور، مرہٹہ دور، انگریزی اور جدید جمہوری دور کا جائزہ لیا گیا ہے وہیں اس دور میں بادشاہوں، شہزادوں اور صوبے داروں کی سرپرستی میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی پر تاریخی حوالوں کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، باب دوم برہان پور کی اردو شاعری کا آغاز وارتقاء ہے، اس باب میں برہان پور میں اردو شاعری کے آغاز وارتقاء کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سرزمین برہان پور میں اردو کا عہد بہ عہد ارتقا، زبان کی نشوونما کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور کے شعرا کا ذکر اور ان کے نمونہ کلام کو پیش کیا گیا ہے، باب سوم اردو کے اہم ادبی دبستان اور ان کے امتیازات ہے، اس باب میں دبستان دکن، دبستان دہلی، دبستان لکھنؤ اور دبستان پنجاب جو ادبی مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں اس کے طرز سخن، انفرادیت، امتیازات اور ان کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ باب چہارم برہان پور کے اہم شعرا اور ان کے کلام کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ اور برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات ہے۔ کتاب کا پانچواں اور آخری باب 'برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات کی اہمیت' ہے۔ باب پنجم باب چہارم کی مکمل تفصیل ہے اور یہی باب مصنف کے مقالے کا عنوان بھی ہے۔ کتاب کی ابتداء میں تین مضامین شامل ہیں جن میں بنیاد کا پتھر 'ڈاکٹر مہتاب عالم' تحقیق ایک دقت طلب عمل 'جمیل اصغر' برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات ایک جائزہ 'نذیر فتح پوری' ہیں۔

مذکورہ بالا مضامین میں اس کتاب پر ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے مصنف کی کاوشوں کو سراہا گیا ہے اور عارف انصاری صاحب کو مبارکباد پیش کی گئی ہے، اس کے بعد مصنف نے عرض حال پیش کیا ہے۔ برہان پور میں اردو زبان کب اور کس طرح وجود میں آئی اس کی ابتدائی شکل کیا تھی؟ اس نئی زبان کو کن ادیبوں اور شاعروں نے برتا اور اس زبان میں سب سے پہلے کن شعرا نے شعر کہے اور یہ شعر وشاعری کا سلسلہ کس طرح آگے بڑھا ان تمام پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور تحقیق کرنے والے طلبا کے لیے کارآمد کتاب ہے۔ کتاب کا موضوع بہت اہم اور نایاب ہے اور اس کتاب میں برہان پور کی اردو شاعری سے متعلق اہم اور نادر معلومات قارئین کے علم میں گراں قدر اضافہ کرے گی۔ عارف انصاری کی زبان بھی سادہ اور اسلوب بھی عام فہم ہے اس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ برہان پور کے حوالے سے تحقیق کرنے والے طلبہ کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لیے بھی یہ کتاب گراں قدر تحفہ ہے امید ہے کہ قارئین استفادہ کریں گے۔

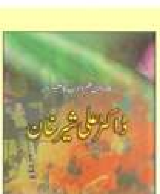

کاروان علم وادب کا علمبردار **ڈاکٹر علی شیر خان**

مرتب: حکیم محمد سالم ادیب

صفحات: 240، قیمت: 350، روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: مولانا آزاد ایجوکیشنل لائبریری، خضر پور، کولکاتہ

مبصر: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، محلّہ گھیر مناف، امروہہ (یوپی)

زیر نظر کتاب ایک انتہائی فعال ومتحرک ادبی وسماجی خدمت گار محترم ڈاکٹر علی شیر خان صاحب کی شخصیت اور احوال وآثار پر ہندوستان کے مختلف اہل قلم کے مضامین پر مشتمل ہے، جس کے مرتب حکیم محمد سالم ادیب صاحب ہیں، پہلے تو میں حکیم محمد سالم ادیب صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت پر اس طرح کے خوب صورت اور پر از معلومات مضامین یکجا کر کے کتابی صورت میں مرتب کر کے ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی۔

محترم ڈاکٹر علی شیر خاں ساکن موضع رانی پور تحصیل محمد آباد ضلع غازی پور، یوپی، کلکتہ یونیورسٹی سے ایم.اے.، بی.ایڈ. اور پی.ایچ.ڈی. ہیں۔ آپ کے تحقیقی مقالہ کا اہم موضوع 'اردو ادب کے ارتقا میں غازی پور کی ادبی خدمات' ہے، آپ کی دوسری زیر اشاعت کتب 'سخن وران کلکتہ'، 'عظمت والدین'، 'مغربی بنگال میں اردو ترجمہ نگاری' وغیرہ ہیں۔ آپ کئی انجمنوں کے سرگرم رکن، سکریٹری اور صدر بھی ہیں، آپ کی ادبی وعلمی خدمات کے صلے میں سرکاری وغیر سرکاری اعزازات (ایوارڈ) بھی مل چکے ہیں، دسمبر 2015 میں آپ کو یوم اساتذہ کے موقع پر قومی صدارتی ایوارڈ سے بھی صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی کے ہاتھوں نوازا گیا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر علی شیر خان کس قدر فعال اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، ساتھ ہی اُردو زبان وادب کے بے لوث خدمت گار بھی۔ آپ کو مولانا ابوالکلام آزاد سے والہانہ محبت ہے، ان کے نام سے آپ نے کئی تعلیمی ادارے قائم کیے جن میں مولانا آزاد اردو ہائی اسکول، مولانا آزاد ایجوکیشنل لائبریری، مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ وغیرہ۔

زیر تبصرہ کتاب میں حکیم محمد سالم ادیب کے پیش لفظ کے علاوہ بہتر منثور ومنظوم مقالات، تاثرات ہیں جو بڑی محنت اور محبت وعقیدت مندی کے ساتھ لکھے گئے ہیں، سبھی مقالات جناب ڈاکٹر علی شیر خاں کی شخصیت اور ادبی وسماجی کاوشوں پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں، مقالہ نگار حضرات نے ڈاکٹر علی شیر خان صاحب کا تعارف کراتے ہوئے غازی پور کی دیگر عظیم شخصیتوں (حکما، علما، ادبا اور شعرا) کا بھی ضمناً اچھا خاصا احوال لکھ دیا ہے جو بڑا مستحسن کام ہے، ڈاکٹر علی شیر خان صاحب کے ستائش گروں میں کئی قدر آور نام بھی شامل ہیں مثلاً پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، مولانا محمد خالد ندوی اور علامہ شبلی وغیرہ۔ ان حضرات کے علاوہ بھی بعض مقالات عمدہ طرز تحریر کے حامل اور معلومات سے پُر ہیں۔ منظومات بھی خوب ہیں جو نہ صرف ڈاکٹر علی شیر خاں صاحب کی شخصیت، سماجی وادبی خدمات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں بلکہ ادبی اور شاعرانہ مزاج کی غماز ہیں بالخصوص ڈاکٹر رضی ناطقی کی نظم 'ہنگامِ رنج ومسرت' اور غلام ربانی نازاں کی دونوں منظومات 'علی شیر خاں، ایک جائزہ' اور 'شیر نامہ' ادبی رچاؤ سے لبریز ہیں اور علی شیر خان کی شخصیت کو اچھی طرح اجاگر کرتی ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ تمام مقالہ نگاروں نے ڈاکٹر علی شیر خان صاحب کے تعارف میں ضلع غازی پور کی ادبی، سماجی، صحافتی، مذہبی اور سیاسی تاریخ بھی ضمناً تحریر کر دی ہے جس سے کتاب کی نہ صرف اہمیت وافادیت دوبالا ہو جاتی ہے بلکہ اس کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوا، صرف ایک ہی شخصیت یعنی ہر مقالہ نگار سے صرف ڈاکٹر علی شیر خان صاحب کے ہی اوصاف سنتے تو یقیناً اتنا لطف نہ آتا۔ کتاب ہذا کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ بلاشبہ ڈاکٹر علی شیر خان صاحب ملک کی برسہا برس کی گردش کے بعد خاک کے پردے سے نکلے ہوئے ایک انسان ہیں جو اس دور قحط الرجال میں بڑی اہمیت اور قدر دانی کے مستحق ہیں۔ میں اپنے اس تبصرہ کے توسط سے تمام ہی اردو کے اہل قلم حضرات سے درخواست گزار ہوں کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کے شیر علی خان جیسی علمی وادبی، سماجی وسیاسی سرگرم شخصیات کو نکال کر لائیں اور حکیم محمد سالم صاحب ادیب کی طرح ان کا تعارف کرائیں، اس سے اردو کے فعال سپاہیوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ آخیر میں ایک ضروری بات یہ عرض ہے کہ تمام ہی اہل قلم اپنی تصانیف وتالیفات کا نام مختصر اور بامعنی رکھیں۔

کتاب ہٰذا کا نام کچھ زیادہ ہی طویل ہے جو لکھنے اور بتانے میں قباحت کا باعث ہے۔

کتاب کے آخیر میں کچھ رنگین تصاویر بھی دی گئی ہیں جو کتاب کی تزئین وافادیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ حکیم محمد ادیب صاحب کی یہ کاوش بہر صورت لائق ستائش اور لائق تقلید ہے۔

بارہ بنکی کے موجودہ شعرا (جلد اوّل)

مرتب: صغیر نوری بارہ بنکوی

صفحات: 304، قیمت: 250، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: مرتب

مبصر: ڈاکٹر محضر رضا، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

فن تذکرہ نگاری نے ادبی اور تہذیبی مرقعوں کو محفوظ تو کیا ہی ہے ان سے کسی عہد کے ثقافتی اور شعری رویوں کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ ادبی تاریخ کی تدوین میں تذکرے بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک عرصے سے اس اہم صنف ادب کی طرف توجہ بہت کم ہوگئی ہے، خصوصاً چھوٹے شہروں اور قصبات کے ادبا و شعرا کی طرف ہماری توجہ قابل افسوس حد تک کم ہوئی ہے اس کمی پر اکثر رسالوں اور اسٹیج سے اظہار افسوس بھی ہوا لیکن بات وہیں ختم ہوگئی جناب صغیر نوری بارہ بنکوی نے ملازمت کی مصروفیات کے باوجود اس کمی کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا بلکہ اس کے تدارک کا سامان بھی کیا۔ خوش قسمتی سے ان کو ایسے احباب میسر آگئے جو خود ایسے تذکروں کی ضرورت محسوس کرنے کے ساتھ علمی معاونت پر بھی قادر تھے۔ ان میں ڈاکٹر انور حسین خاں، ڈاکٹر سید محمد حیدر، ڈاکٹر رضا مورانوی، ہاشم علی ہاشم، شارب مورانوی، محمد جابر ایڈوکیٹ، شعیب انور خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ شعرا کے کلام پر تبصراتی نوٹ صغیر نوری اور مذکورہ رفقا کی جنبش قلم کا نتیجہ ہیں۔ مرتب کی دیانت داری بھی قابل ستائش ہے کہ انھوں نے مقدمے میں رسمی شکریے کو ناکافی سمجھتے ہوئے ہر تعارفی تحریر کے آخر میں اس کے مصنف کا نام بھی درج کر دیا ہے یہ ان کی منصف مزاجی کے ساتھ اصول تدوین سے واقفیت کا بھی نتیجہ ہے۔

ضلع بارہ بنکی ایک مردم خیز خطہ ہے جو مذہبی ہم آہنگی، مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور مختلف میدانوں میں اسلاف کے کارہائے نمایاں کے سبب محتاج تعارف نہیں۔ اگرچہ گذشتہ ادبا کے آثار کی بازیافت اور ان کی اشاعت کے ساتھ ایک ایسے تذکرہ کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے جس سے وہاں کی ادبی تاریخ مرتب ہو سکے لیکن موجودہ دور کے شعرا کا حق بھی ہم پر کم نہیں ہے۔ صغیر نوری نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی پہلی جلد بارہ بنکی کے پچاس موجودہ شعرا کے تذکرے سے مزین ہے۔ مرتب اس سلسلے کو مزید وسعت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کتاب کو اس سلیقے سے تیار کیا گیا ہے کہ ایک صفحے میں شاعر کا تعارف دوسرے میں کلام پر تاثراتی تبصرہ آخر میں بطور نمونہ ایک حمد، ایک نعت، ایک سلام اور ایک غزل کو پیش کیا گیا ہے۔ جن شعرا نے مذکورہ اصناف میں سے کسی ایک صنف پر طبع آزمائی نہیں کی ان کے لیے آزمودہ صنف سے ہی نمونہ حاصل کیا گیا ہے۔ غزل اردو شاعری کی سب سے محبوب صنف ہے لہٰذا یہ ہر شاعر کے یہاں پابندی کے ساتھ موجود ہے۔ ایک حمد، نعت، سلام اور غزل مجموعی طور پر بھی یہ سرمایہ مختصر ہی کہا جائے گا اس مختصر سرمایے کی روشنی میں کسی شاعر کے حقیقی مرتبے کو نشان زد کرنا ممکن نہیں لیکن ترتیب وطباعت کی اپنی حدود ہیں جن سے تجاوز ممکن نہیں۔ مرتب کا مقصد بھی تنقیدی بحث چھیڑ کر ادبی مراتب کی تقسیم نہیں ان کا مقصد تو موجودہ بارہ بنکی کے ادبی رجحانات اور طرز سخنوری کے نقوش کو صفحات پر اس طرح ابھارنا ہے کہ امتداد زمانہ کی گرد انھیں میلا نہ کر سکے۔ موجودہ دور میں جب شعر و ادب کا ذوق روبہ زوال ہے اور بزرگوں کے علمی آثار کا خاصا حصہ دیمکوں کی ضیافت اور ردّی فروشوں کی دستگیری میں صرف ہو چکا ہے یہ کتاب حوصلہ مندی کے جذبات پیدا کرتی ہے کہ ہمارے چھوٹے چھوٹے شہروں میں ایسے افراد موجود ہیں جو اپنی ادبی روایت کو سینے سے لگانے کے ساتھ اس میں امکان بھر اضافہ بھی کر رہے ہیں۔ صغیر نوری بارہ بنکوی مبارک باد کے مستحق ہیں جنھوں نے ایسے زاویہ نشین شاعروں کو ادبی دنیا میں متعارف کرایا اور ان کے نمونۂ کلام کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ دیدہ زیب ٹائٹل اور معیاری طباعت نے اس کتاب کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ امید ہے کہ علمی حلقے میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

شاعری

آوازیں

مصنف: نوشاد کریمی

صفحات: 208، قیمت: 137 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، سینئر ریسرچ فیلو، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

نوشاد احمد کریمی کا تعلق صوبہ بہار کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے ہے جہاں انھیں علمی، ادبی اور شعری ذوق وراثت میں ملا۔ ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز مابعد جدید عہد میں 1984 کے بعد صنف افسانہ اور شاعری سے ہوا۔ ان کی نثری و شعری تخلیقات ملک اور بیرون ملک کے موقر ادبی رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں۔ انھوں نے کچھ تنقیدی مضامین بھی تحریر کیے لیکن شاعری کی طرف زیادہ رغبت اور جھکاؤ نثر کی تخلیق میں آڑے آنے لگے چنانچہ انھوں نے نثری تخلیقات سے اپنے آپ کو دور رکھا اور اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی اور جذبات واحساسات اور تجربات ومشاہدات کو پیش کرنے کے لیے صنف شاعری میں غزل کو وسیلہ اظہار بنایا۔ حالانکہ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن غزلوں کی طرف ان کا جھکاؤ زیادہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نظمیں کم اور غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ 'انفراد' کے نام سے 1999 میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعہ 'آوازیں' ان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو 2017 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے زیر اہتمام منظر عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً 90 غزلیں شامل ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ یہ ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات پر مبنی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں روداد زندگی کے انھیں پہلوؤں کو موثر انداز میں پیش کیا ہے جسے اپنے آس پاس دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ان کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے اکثر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان میں بے چینی، بے رخی، بے وفائی اور ہجر کی کیفیت غالب ہیں۔ جس کے نتیجے میں مایوسی اور قنوطیت کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عجب طرز رہائش ہوگئی ہے ان دنوں سب کی — یہاں تو دو دلوں کے درمیاں دیوار چلتی ہے

کسی کی سربلندی دیر تک قائم نہیں رہتی — ہمارے شہر میں تو قیمت دستار چلتی ہے

اک نظر ڈالی نہ اس نے مری بدحالی پر — خیریت تک نہ پوچھی خبر ہوتے ہوئے

وفا، خلوص، مروت پرانی باتیں ہیں — خزاں کی زد میں ہر اک شاخ آرزو ہے ابھی

اس طرح اور بھی بہت سارے اشعار ہیں جن میں ملک کی عصری صورتحال کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

نوشاد کریمی کی غزلوں کا بیشتر حصہ ہجر کی کیفیت پر مشتمل ہے جس میں کہیں کہیں یک رنگی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ انھوں نے ہجر کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے شعری قالب میں ڈھالا ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری مختلف تجربات سے خود کو ہم آہنگ

کرتا ہے۔نوشاد کریمی کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں ثقیل، بھاری بھرکم اور نامانوس ڈکشن سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور مشکل تراکیب اور بہت زیادہ صنائع بدائع سے بوجھل نہیں بنایا ہے بلکہ سہل اور رواں اسلوب میں اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے کی کوشش کی ہے۔نوشاد کریمی کی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے ان مسائل و موضوعات کو خوبصورت شعری پیرہن عطا کر کے اپنی خلاقانہ صلاحیت اور شعری و ادبی ذوق کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔بطور نمونہ تین شعر دیکھیے:

کبھی کھڑے تھے وہاں اپنی داستان لیے   جہاں جہاں گئے قصہ کوئی سنانے ہم

حیات وموت میں دوری تو کچھ نہیں لیکن   حصار جسم میں کتنے زمانے رہتے ہیں

تمہاری یاد کی خوشبو ہے خانۂ دل میں   تمہارا عکس بھی دیوار و در میں دیکھا ہے

آخر میں اس مجموعے کے مطالعے کے بعد یہ کہہ سکتے ہیں کہ نوشاد کریمی کا یہ مجموعہ ہر اعتبار سے اچھا ہے اور پڑھے جانے کے لائق ہے۔اس میں متعدد دلوں کی آوازیں ہیں جو پڑھتے ہوئے قارئین کو سنائی دیں گی اور ہجر کے درد و کرب کو محسوس بھی کریں گے اور اس سے نکلنے والی سوز و ساز کی کیفیت سے خود کو ہم آہنگ کریں گے۔

خوشبو کی آواز

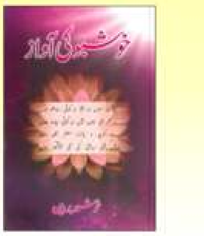

مصنف: خوشبو پروین

صفحات: 112، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، نسیم منزل

مدح گنج پولیس چوکی، سیتاپور، لکھنؤ۔ 226020

اہل فن اس امر پر متفق ہیں کہ بحر ہزج کے 24 اوزان میں سے ایک یا زائد اوزان میں کہی گئی چار باہم مربوط مصرعوں کی مختصر نظم یعنی رباعی قدرے مشکل سے قابو میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اصناف سخن سے کل شعرا کے مقابلہ رباعی گو شعرا کی تعداد دو فیصد بھی نہیں ہے۔ ہمارے ناقص علم کے مطابق کلیاتِ فیض میں ایک بھی رباعی نہیں ہے اور کلیاتِ جگر مرادآبادی میں اتفاقاً قطعات کے ساتھ ایک رباعی بھی راہ پا گئی ہے۔اس لحاظ سے وہ چند جواں سال شعرا انتہائی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے فن رباعی گوئی کی دشوار گزار گھاٹی کو عبور کر کے اپنے ہم عصروں اور آئندہ آنے والوں کو ایک راہ دکھائی ہے۔خوشبو پروین ان میں سب سے کم عمر ہیں۔'خوشبو کی آواز' میں کل ایک سو رباعیات ہیں۔ ابتدا میں چند رباعیات حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ انداز کی ہیں بعد میں متنوع موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔شاعرہ نے اخلاقی درسیات، سماج کے موجودہ مسائل، عشق مجازی اور عشق حقیقی جیسے موضوعات کو سیدھے سادے الفاظ میں مشاقی کے ساتھ رباعی کا جامہ پہنایا ہے۔مثلاً یہ رباعیات ملاحظہ فرمائیں۔

تہذیب و تمدن کو بچا کر رکھیے   گہوارۂ گلشن کو سجا کر رکھیے

رہزن نہ چرالے پھولوں کو یہاں   ہر آنکھ کو آئینہ بنا کر رکھیے

آپس میں رہیں بن کے یہاں ہم سب پھول   بے وقت لڑائی کو نہ دیں ہرگز طول

ہر حال میں رشتوں کا بھرم رکھ خوشبو   غیروں کی محبت میں تو اپنوں کو نہ بھول

ہر شخص پریشاں ہے خدا خیر کرے   مشکل میں گلستاں ہے خدا خیر کرے

یہ آگ یہاں کس نے لگائی خوشبو   آباد تھا، ویراں ہے خدا خیر کرے

خوشبو کی رباعیات کو پڑھ کر واضح ہوا کہ انھوں نے فن رباعی گوئی کو سیکھنے میں واقعی خاصی محنت کی ہے اور رباعی کے معروف وزن لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے علاوہ دیگر اوزان کو بھی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔مبہم اور گنجلک الفاظ سے گریز کرتے ہوئے نغمگی کو برقرار رکھنا ہر صنف سخن کے لیے لازم ہے۔خوشبو نے اس نکتہ کا بھی خاص خیال رکھتا ہے۔ مصرعوں کے باہم ارتباط کے ذریعے موضوع کی وضاحت بھی ہنرمندی کے ساتھ کی گئی ہے۔تبصرہ نگار کو ان کی رباعیات کو باریک بینی سے دیکھنے پر ہی ایک دو جگہ قدرے اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مثلاً ذیل کی رباعی کے دوسرے مصرعہ میں 'دعا دے یارب' معنوی اعتبار سے درست نہیں ہے۔لفظ 'دعا' کو 'قضا' سے بدلنے پر معنی درست ہو جائیں۔

بیمار ہوں میں مجھ کو شفا دے یارب   خوش باش رہوں ایسی دعا دے یارب

آنکھوں کو میری ایک تمنا ہے فقط   اک بار مدینہ ہی دکھا دے یارب

دیگر شعرا کی طرح خوشبو نے اپنے کلام کے ذریعے خودنمائی کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ مجموعہ کی آخری رباعی کے ذریعے اپنے فن میں نکھار پیدا کرنے کے لیے تنقید کی فرمائش کی ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

تنقید سے کچھ اور سنور جاؤں گی   اس صنف کی تہہ تک میں اتر جاؤں گی

تنقیص ہوئی میری تو ان شاء اللہ   خوشبو ہوں گلستاں میں بکھر جاؤں

امید ہے کہ 'خوشبو کی آواز' تمام اہل سخن سے داد پائے گی اور نئی نسل خصوصاً شاعرات کو رباعی گوئی کی جانب سے ملتفت بھی کرے گی۔

ہم ماحول کے رکھوالے

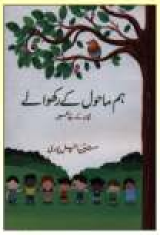

شاعر: متین اچل پوری

صفحات: 144، قیمت 98 روپے

ناشر: نورانی آفسیٹ پریس، مالیگاؤں

مبصر: ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو مہاراشٹر اودے گیری کالج، اودے گیر، مہاراشٹر

ماحول کی آلودگی آج کی دنیا کا ایک اہم ترین اور بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ادارہ اقوام متحدہ سمیت دنیا کے تقریباً تمام ممالک اپنی اپنی سطح پر ماحول کی آلودگی کو دور کرنے کے لیے کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں۔ آبی آلودگی، فضائی آلودگی اور صوتی آلودگی سے آج کا انسان گھرا ہوا ہے خاص طور سے شہری زندگی تو ان آلودگیوں سے اجیرن ہو گئی ہے۔ایسے حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق نہ صرف اپنے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرے بلکہ اس سلسلے میں عوامی سطح پر شعور بیدار کرنے کے عملی اقدامات بھی کرے۔اہلِ قلم حضرات کو بھی اپنی قلمی کاوشوں سے اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہیے۔بعض اہلِ قلم ستائش کی تمنا و صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر اس کارِ خیر میں حصہ لے رہے ہیں۔

ایسے ہی ایک قلم کار متین اچل پوری بھی ہیں۔ان کا شمار مہاراشٹر کے ان ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جو صالح فکر کے حامل اور تعمیری ادب کے نقیب ہیں۔ادبِ اطفال کی تخلیق اور ترویج و اشاعت کے حوالے سے بھی موصوف کا نام اہمیت کا حامل ہے۔اب تک موصوف کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔'ہم ماحول کے رکھوالے' متین اچل پوری کی نظموں کا تازہ مجموعہ ہے جو 2017 میں منظرِ عام پر آیا ہے۔یہ ماحولیات کا شعور پیدا کرنے والی نظموں کا اہم مجموعہ ہے۔ بچوں کے لیے تخلیق کردہ ان کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے بچوں کی عمر اور ذہنی صلاحیت اور ان کی دلچسپیوں کو بطورِ خاص ملحوظ رکھا ہے۔اسی طرز کا ایک اور مجموعہ 'ماحول نامہ' کے عنوان سے منظرِ عام پر آ چکا ہے۔متین اچل پوری کو اس بات کا امتیاز حاصل ہے کہ وہ ماحولیات پر نظمیں لکھ کر ایک طرح سے بنیادی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ پرائمری اور ہائی اسکول کی سطح ہی سے اگر ماحول کے تحفظ کا شعور بیدار کیا جائے تو اس کے دوررس

نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت اور ان کو اعلیٰ اقدار کا حامل بنانے میں سبق آموز نظمیں اور کہانیاں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ متین اچل پوری بھی اس راز سے واقف ہیں اسی لیے وہ ہمیشہ بچوں کے لیے کارآمد نظمیں کہتے رہتے ہیں۔

بچوں کے لیے لکھنے والے شعرا میں شاید متین اچل پوری ہی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ماحول کے تحفظ کا شعور بیدار کرنے کے سلسلے میں بچوں کے لیے اتنی کثیر تعداد میں نظمیں کہی ہیں۔ بلاشبہ ان کی یہ خدمت لائقِ ستائش ہی نہیں بلکہ لائقِ تقلید بھی ہے۔ متین اچل پوری کا اسلوب دلنشین اور زبان عام فہم ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ انھوں نے حمد اور نعت کے ذریعے بھی صحت مند ماحول کی اہمیت اور تحفظ کی تعلیم دی ہے۔ شجر کاری سے متعلق مسند احمد میں موجود ایک حدیث کے مفہوم کو متین صاحب نے منظوم لباس پہنایا ہے۔

'زمین کا دن' کے زیرِ عنوان جو نظم ہے اس میں بھی شجر کاری کی تعلیم دیتے ہوے ماحول کو سرسبز وشاداب رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جنگلات کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرنے والی ایک نظم 'جنگل ہمارا' ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ پانی کی قلت بھی آج کی دنیا کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے تحفظ کی کوششیں ہر طرف ہو رہی ہیں۔ اس موضوع پر بھی متین صاحب نے نظمیں کہی ہیں۔ 'پانی کی فریاد' ایسی نظم ہے جس میں پانی کے تحفظ اور صاف وشفاف پانی کی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرز کی ایک اور نظم 'پانی بچاؤ' میں بھی پانی کی قدر و قیمت، ضرورت اور اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ پانی کے قطروں کو موتیاں قرار دے کر انھیں پلکوں سے اٹھانے کی تلقین کی گئی ہے۔

نظم 'گلوبل وارمنگ' میں زمین کے درجۂ حرارت میں تیزی سے اضافے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ زمین کے درجۂ حرارت میں اضافے کی وجہ سے گلیشیئر بھی تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ گلیشیئر کے پگھلنے سے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں اس کا اظہار نظم 'انمول آبی گھر' میں کیا گیا ہے:

'دھواں بولتا ہے' فضائی آلودگی کے تناظر میں لکھی گئی نظم ہے۔ 'شور' ایسی نظم ہے جس میں صوتی آلودگی کے نقصانات گنائے گئے ہیں۔ نظم 'فطرت کے قریب آؤ' میں بچوں کو فطرت سے مانوس ہونے اور اس سے محبت کرنے کا پیغام دیا گیا ہے۔ ایک نہایت ہی پیاری نظم 'ہوا' کے عنوان سے ہے۔ اس میں تازہ اور صاف ہوا کے فائدے بتائے گئے ہیں۔ نظم 'کچرا پیٹی' میں یہ بتایا گیا ہے کہ کچرا صرف کچرا پیٹی میں پھینکنا چاہیے۔

اس کتاب میں شامل نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کا اسلوب دلنشین اور زبان عام فہم ہے۔ تقریباً تمام نظمیں چھوٹی اور خوش آہنگ بحروں میں کہی گئی ہیں۔ بچوں کی عمر، نفسیات اور ان کی ذہنی صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا بھی بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔

مقبول عام اشعار

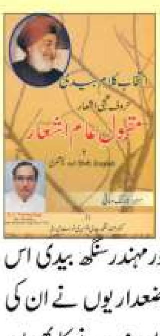

مرتب: نارنگ ساقی

صفحات: 438

ناشر: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر جسیم الدین، سی، 633، چوتھی منزل، گلی نمبر 9 ذاکر نگر، نئی دہلی 110025

اردو صرف ایک زبان نہیں، بلکہ ایک تہذیب ہے اور کنور مہندر سنگھ بیدی اس تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ پنجاب کے بانکپن اور دہلی کی وضعداریوں نے ان کی شخصیت کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں بھی ہوتے اپنے ہونے کا بھرپور ثبوت دیتے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت ان کے آگے آگے چلتی رہی۔ نہ صرف برصغیر بلکہ اس سے باہر بھی ہر یادگار مشاعرہ میں آپ کی شرکت یقینی ہوا کرتی تھی۔ محفلوں میں شرکت بکثرت ہوتی تھی، دوست داری اور وعدہ وفائی میں آپ عدیم المثال تھے۔ آپ سرکاری آفیسر تھے، لیکن اردو شاعری سے آپ کو دلچسپی بے انتہا تھی۔ ادب نوازی آپ کی شان تھی، دہلی کی ادبی نشستوں کی جان تھے، تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والے ناگفتہ بہ حالات میں آپ نے دہلی میں اردو کی آبیاری کی۔ کنور مہندر سنگھ بیدی ایک کثیر الجہات شخصیت کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ 60 برس تک شاعری کی۔ ان تمام مشغلوں میں شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت کی شان میں بھی بہت عمدہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیں:

ہم کسی دین سے ہوں، قائلِ کردار تو ہیں　　ہم ثناء خوانِ شہِ حیدرِ کرار تو ہیں
نام لیوا ہیں محمد کے پرستار تو ہیں　　یعنی مجبور پئے احمد مختار تو ہیں
عشق ہو جائے کسی سے، کوئی چارہ تو نہیں　　صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

مذکورہ اشعار کو پڑھ کر ان کی اسلام دوستی اور اسلام کی حقانیت کا اعتراف کھل کر سامنے آتا ہے، سادگی وتواضع ان کی شاعری کی خاص پہچان ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

قصۂ عاشق ومعشوق بس اتنا ہی تو ہے　　کوئی دیوانہ بنائے کوئی دیوانہ بنے
غم و آہ نالوں سے فرصت نہیں ہے　　محبت ہے یہ خوابِ غفلت نہیں ہے
ہر لحظہ مکیں دل میں تری یاد رہے گی　　بستی یہ اُجڑنے پہ بھی آباد رہے گی
مجھے بھول جانے والے مرے دل کی کچھ خبر بھی　　مری آنکھ پر نہ جانا یہ تو خشک بھی ہے تر بھی
انھیں کیا علم جو ہم کو یہاں سمجھانے آئے ہیں　　کہ ہم دیر وحرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں

کنور مہندر سنگھ بیدی کو مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔ کالج کے زمانے سے ہی شاعری کا شوق ہو گیا 1923 میں جب وہ فرسٹ ایئر میں تھے، پہلی غزل کہی۔ مشاعرہ میں وہ کسی کے شاگرد نہیں بنے البتہ 1934 میں سرکاری ملازمت میں بطور مجسٹریٹ آنے کے بعد وہ دہلی کے قریب سونی پت میں تعینات ہوئے تو شاعری سے رشتہ استوار ہوا سائل دہلوی، بیخود دہلوی، امرناتھ ساحر دہلوی، جوش ملیح آبادی، پنڈت ہری چند اختر اور جگر مرادآبادی جیسے عظیم المرتبت شاعروں سے نزدیکیاں بڑھیں تو ان کی شاعری اور فکر کو بھرپور روشنی ملی۔

زیر تبصرہ کتاب میں جہاں آپ کے کلام کا انتخاب کیا گیا ہے، وہیں مقبول عام شعرا کے اشعار کو بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو اردو کے بے لوث خادم اور سچا عاشق نارنگ ساقی نے مرتب کیا ہے۔ کتاب کے مرتب نارنگ ساقی صاحب کی اردو دوستی بھی لاجواب ہے، وہ اپنی تنظیم کے بینر تلے اردو ادبا وشعرا کی جہاں مالی مدد کرتے ہیں، وہیں اردو زبان وادب کی آبیاری بھی کر رہے ہیں۔ کتاب کی ترتیب میں انھوں نے جو فنکاری دکھائی ہے وہ بھی لاجواب ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے کلام کو عام وتام بنانے کے لیے انھوں نے اشعار کو اردو رسم الخط کے ساتھ دیوناگری میں قلمبند کر دیا ہے۔ ساتھ ہی اردو ہندی اور انگریزی میں فرہنگ بھی شامل کر دی ہے، تاکہ اشعار کو سمجھنے میں قاری کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے منتخب کلام کے علاوہ مقبول عام اشعار کو بھی انھوں نے دونوں زبان میں شامل کیا ہے، اس سے کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ علمی وادبی حلقوں بھی اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوگی۔ شعر وشاعری سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے اپنی لائبریری کی زینت بنائیں گے اور کنور مہندر سنگھ بیدی پر ریسرچ کرنے والے طلبہ وطالبات اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

تاریخ

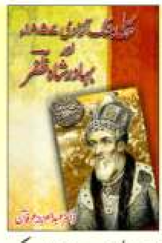

پہلی جنگ آزادی 1857 اور بہادر شاہ ظفر

مصنف: ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان

صفحات: 200، قیمت: 200 روپے، سنہ شاعت: 2018

مبصر: عبداللہ عثمانی، 4/16، گڈی وارا، پوسٹ: دیوبند، یوپی

ہمارے عہد کے نامور ادیب، مصنف اور تاریخ نگار ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کی کتاب انقلاب 1857 پر 'پہلی جنگِ آزادی 1857 اور بہادر شاہ ظفر' منظر عام پر آئی ہے، ڈاکٹر موصوف نہ صرف ہمارے دور کے اردو زبان کے ممتاز قلم کار ہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ پر بہت گہری نظر بھی رکھتے ہیں ان کی اب تک قریب تین درجن کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہو کر مقبولیت پا چکی ہیں، ان میں عہد عالمگیری کے درباری اخبار، اردو کا حبسیاتی ادب، اورنگ زیب عالمگیر تاریخ کی روشنی میں، تحریکِ آزادیِ ہند کے چند مجاہدین، سلطان علاء الدین خلجی کی دولت باد، (دیوگری) آمد، مولانا ابوالکلام آزاد عدالتی بیانات کی روشنی میں وغیرہ کتابیں قابل ذکر ہیں جو اپنی محبوبیت کا لوہا منوا چکی ہیں زیر نظر کتاب 'پہلی جنگ آزادی 1857 اور بہادر شاہ ظفر' بھی ڈاکٹر موصوف کے حسن ذوق اور وسعت مطالعہ کا آئینہ ہے، ڈاکٹر عبدالعزیز نے مذکورہ کتاب لکھ کر نہ صرف ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کی یاد تازہ کردی ہے بلکہ اردو زبان میں ایک نئی کاوش کا بھی اضافہ کیا ہے، مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے قریب 27 عنوانات قائم کیے ہیں ان میں چند مخصوص یہ ہیں، معرکہ 1857,1858 سے قبل کی حالت، انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں میں بے چینی اور بغاوت، جنگِ آزادی کی ابتداء، بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کرنا، بادشاہ کی گرفتاری، شہزادوں کی گرفتاری اور قتل، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، بادشاہ کی رنگون آمد اور بادشاہ کی وفات، غداران وطن کی بے وفائی، جنگ آزادی 1857 کی ناکامی کے اسباب، عوامی بغاوت، بادشاہ ظفر، بیگمات اور اولادیں، بادشاہ ظفر اور اہل خاندان تصاویر کے آئینے میں۔

مذکورہ کتاب کا طرزِ بیان بھی نہایت سادہ اور سہل ہے، ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب کی تیاری میں نہ صرف اردو کتابوں سے استفادہ کیا ہے بلکہ متعدد انگریزی کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے، ڈاکٹر عبدالعزیز فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی زبان پر مکمل قدرت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فارسی اور انگریزی ماخذوں پر ان کی مضبوط گرفت رہی ہے، کتاب کی ابتدا میں نامور تاریخ نگار محترم ڈاکٹر مرزا محمد خضر، پروفیسر ڈاکٹر رفیق زکریا کالج فار ویمن اورنگ آباد کا پیش لفظ شامل ہے۔

دو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب پہلی جنگِ آزادی کے بعض گمشدہ پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے مثلاً، 1857 سے قبل ملک کی حالت، اس عنوان کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

''لارڈ ولزلی کی پالیسی سبسڈی ایری سسٹم (امدادی طریقہ) کی وجہ سے کمپنی کی طاقت بڑھ گئی اور دیسی راجا کمزور اور لاپرواہ ہو گئے آخر میں دیسی ریاستیں انگریزی حکومت میں شامل کرلی گئیں، لارڈ ڈلہوزی کا عہد 1848 سے 1856 تک رہا ہے اس کے عہد کے واقعات میں مسئلہ الحاق، چارٹر ایکٹ الحاقات اور خطابات و پنشنوں کی ضبطی اہم شمار کیا جاتا ہے، یہ ڈلہوزی نے پنجاب، برما، ستارہ، جھانسی، ناگپور وغیرہ ریاستیں مسئلہ الحاق کی زد سے انگریزی عمل داری میں شامل کرلی گئیں اس طرح اودھ کا علاقہ بھی بدنظمی کی بناء پر انگریزی حکومت میں شامل کیا گیا، ان تینوں پالیسیوں کی وجہ سے دیسی ریاستیں انگریزی حکومت میں شامل کرلی گئیں''۔

عبدالعزیز نے انگریزی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جگہ جگہ بعض انگریزی ماخذوں کے حوالے بھی کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں اس کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے ایک عنوان' 1857 کی شعری دستاویز' قائم کیا ہے جس کے ذیل میں 1857 کے وقت جو شعری سرمایہ شائع ہوا اس میں چند معروف شعراء کے فکری تاثرات شامل کیے ہیں مثلاً، بہادر شاہ ظفر، عظیم اللہ خان، مرزا غالب، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا صدرالدین آزردہ، مرزا قربان علی بیگ سالک، ظہیر دہلوی، محمد علی تشنہ، کی منظومات کی شمولیت سے بھی مذکورہ کتاب کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز قابل داد ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی سے متعلق اردو زبان میں حسین گلدستہ سجایا ہے اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ زبان نہایت سہل اور عام فہم ہے، آخری ابواب میں اب تک بہادر شاہ ظفر کی اولاد و اسلاف پر جتنی تحقیقات سامنے آئیں ہیں ڈاکٹر صاحب نے ان کو نہایت خوب صورت ترتیب کے ساتھ درج کیا ہے پہلی جنگِ آزادی 1857 جہاں ایک طرف اپنی بدنظمی کا شکار ہوئی تو دوسری جانب وطن عزیز کے غداروں نے بھی ایمان فروشی سے انگریزوں کو فتح دلائی اس موضوع پر بھی ڈاکٹر عبدالعزیز نے عمدہ بحث کی ہے۔

بہر کیف 'پہلی جنگ آزادی 1857 اور بہادر شاہ ظفر' ایک دستاویزی کاوش ہے آج کے سائنسی دور میں ہم بالخصوص نئی نسل تکنک اور عصری علوم سے اتنا قریب ہو گئی ہے کہ اپنے اسلاف کے کارناموں سے بالکل انجان ہے، یہ کتاب نہ صرف اہل وطن کی جدو جہد کی مختصر داستان ہے بلکہ مغل سلطنت کے آخری تاجدار کی یاد بھی زندہ کرتی ہے۔

فکشن

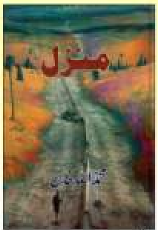

منزل

مصنف: محمد اللہ خاں

صفحات: 128، قیمت: 145 روپے

ناشر: آل انڈیا اردو تعلیم گھر، لکھنؤ

مبصر: ریحانہ فاطمہ، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

اردو زبان میں فکشن اپنے موضوعاتی تنوع کی وجہ سے ہمیشہ دلچسپی اور مطالعہ کا محور و مرکز رہا ہے۔ اردو فکشن میں افسانے ہوں یا ناول سبھوں میں زندگی، سماج اور اس سے متعلق دوسرے مسائل کو موضوع بنایا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان کی دیہی زندگی کی عکاسی پریم چند نے خوب کی ہے اور اس طرح وہاں کے مسائل بیان کیے ہیں جیسے لگتا ہے کہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ پریم چند نے اپنے ناولوں سے ایک ایسی رہ گزر کو نشان زد کیا جس پر بہتوں نے نقش پا چھوڑنے کی کوشش کی۔ ان میں محمد اللہ خاں کا بھی شمار ہوتا ہے۔ مغربی یوپی میں ایٹہ کے رہنے والے محمد اللہ خاں نے زمینداری کے عروج و زوال کو دیکھا تھا اس کے مثبت اور منفی اثرات کو بھی قبول کیا۔ مذکورہ ناول میں انھوں نے سماج کے مختلف طبقوں کی کشاکش اور ردعمل کو بخوبی پیش کیا ہے۔ یہ ناول ایک مسلسل سوانحی ناول ہے جس میں انھوں نے 29 مختصر ابواب قائم کیے ہیں۔ یہ ابواب نہیں بلکہ یہ 29 واقعات ہیں جنھیں کہانی کے روپ میں ڈھال کر ناول کی کڑیوں میں پرویا گیا ہے۔ کسانوں اور غریبوں کی زبوں حالی، ساہوکاروں، زمینداروں کے استحصالی نظام کا پورا منظر بیان کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد زمینداری کا خاتمہ حکومت نے کردیا لیکن زمینداروں کے اذہان سے اس کی بوباس اب تک نہیں گئی۔ گاؤں میں نام نہاد زمینداروں کے رعب اور دبدبہ ابھی تک قائم ہے اور اس پس منظر میں پولیس کی ظلم و زیادتی کو بھی دکھایا گیا ہے۔ آزاد ہندوستان میں زمینداروں سے لے کر پولیس والے تک نے اپنی ایک منزل طے کرلی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ پورا ناول ایک ایسا بیانیہ ہے جس میں ناول نگار ہر جگہ نظر آتا ہے اور اس میں جگہ جگہ اصلاح کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ پروفیسر مسعود الحسن نے اس کتاب پر تقریظ لکھی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ ناول فن برائے فن کا نمونہ یا صرف آسودگیِ شوق کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک

انسان دوست اور انصاف پسندوں کی آواز سے بلند بانگ مگر کھوکھلے سیاسی نعروں اور احتجاجی شورشوں سے بے داغ ہے۔ مصنف کا جذبہ انسان دوستی وانصاف پسندی اور خفی مقصد ہے۔

اس ناول میں غریبوں اور ناداروں کے استعمال اور ان پر ہونے والے ناروا سلوک کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ چونکہ مصنف کا تعلق دیسی معاشرت سے رہا ہے اس وجہ سے انھیں عملی طور پر کسانوں کی معاشی بدحالی اور سودی نظام کا احساس ہے۔ ناول میں جگہ جگہ ان فرسودہ نظام کو دکھایا گیا ہے۔ اس ناول کا ایک اہم کردار پنڈت دین دیال ہے جو کبھی بڑا زمیندار تھا لیکن اب زمینداری ختم ہوچکی ہے لیکن اس کا مزاج آج بھی پورا زمیندارانہ ہے وہ اپنی چارپائی پر کسی نچلے طبقے کے فرد کو بیٹھانا پسند نہیں کرتا۔ دوسری طرف برہمن ہونے کی وجہ سے اور زیادہ نچلے طبقے کے لوگوں سے نفرت کرتا تھا لیکن اسے اس کا احساس بھی تھا اس کے برعکس جمن کہار کا کردار ہمارے دیسی سماج کے نچلے طبقے کا ترجمان ہے جو ہمیشہ ساہوکاروں کا مقروض رہتا ہے۔ کبھی اناج پیٹ کی بجھانے کے لیے تو کبھی بیٹی کی شادی کے لیے قرض لیتا ہے اور اسے واپس نہ کرنے کی صورت میں زمین سے اپنا مالکانہ حق کھو دیتا ہے۔ پورے ناول میں اس دیسی کشمکش کو خوب اچھے اور پر اثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ آج بھی ساہوکار گاؤں میں قرض دیتے وقت ایک سفید کاغذ پر انگوٹھے کا نشان لگواتا ہے اور پھر اس میں اپنی جانب سے من چاہی باتیں مندرج کرتا ہے۔ ناول کا بیشتر حصہ اس فرسودہ نظام کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ ناول نگار اس نظام کی اصلاح کی کوشش بھی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک سودی نظام اور استحصال تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ آزادی کے بعد جب مساوات کی بات کہی گئی تو اس کا دیہی علاقوں پر کیا اثر پڑا۔ الیکشن کے دوران کس طرح کی دھاندلی ہوتی ہے اور پولیس اس میں کیا کردار نبھاتی ہے وہ تمام علاقائی سیاست اور انتظامی بدعنوانی کو ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح پریم نے دیہی مسائل کو اپنے ناول میں موضوع بنایا ٹھیک اسی طرح محمد اللہ خاں کا یہ ناول بھی مغربی یوپی کے ایک گاؤں کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ حقیقی معنوں میں یہ سہاور کے آس پاس کی کہانی نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے دیہی علاقوں کی صورت حال ہے۔ پلاٹ، کہانی اور کردار کے حوالے سے ناول کے تانے بانے اچھی طرح بنے گئے ہیں۔ فکشن اور دیہی مسائل سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والوں کو یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیے۔

رسائل و جرائد

ششماہی 'دستک' ریسرچ جرنل

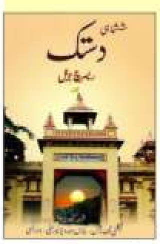

مدیر: ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

جلد: 1، شمارہ: 1 (جنوری تا جون 2018)

صفحات: 236، قیمت: 200 روپے

ناشر: شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی وارانسی

مبصرہ: شاہدہ شاہد، پی آر ٹی (اردو)، ایس ڈی ایم سی پرائمری اسکول نئی دہلی

ہندوستان میں اردو کے ادبی رسالوں کی تعداد دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس زبان میں لکھنے پڑھنے کی روایت نہ صرف زندہ ہے بلکہ اطمینان بخش بھی ہے۔ سرکاری اداروں سے شائع ہونے والے رسالوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان رسالوں میں علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے ساتھ منظوم ومنثور تخلیقات بھی شائع ہوتی ہیں۔ خالص تحقیقی یا تنقیدی نوعیت کے رسالوں کی تعداد کم ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں تحقیقی رسائل کے تئیں کچھ سنجیدگی نظر آئی ہے۔ ممبئی یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی وغیرہ کے شعبۂ اردو سے تحقیقی رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو کے جتنے شعبے ہیں ان کے تناسب میں یہ تعداد بہت ہی کم ہے۔ اسی درمیان شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی نے اپنی تاسیس کی صد سالہ تقریب کے موقع سے ایک ششماہی رسالہ 'دستک ریسرچ جرنل' شائع کرنے کا فیصلہ لیا اور اس کا پہلا شمارہ جنوری تا جون 2018 مارچ میں منظر عام پر آیا۔

رسالہ کو دیکھ کر حیرت آمیز مسرت کا احساس ہوا۔ ایک خاص وژن کے تحت شروع کیا گیا یہ رسالہ اپنی کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے مدیر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے لکھا ہے:

"شعبے کے لیے یہ تاریخی لمحہ ہے کہ ایک صدی بعد شعبۂ اردو سے پہلی بار ایک علمی، ادبی اور تحقیقی مجلہ 'دستک' منظر عام پر آرہا ہے۔ یہ اس خیال کی عملی کوشش ہے کہ شعبے محض درسگاہ نہیں ہوتے اور نا ہی ان کی غایت وجود محض چند مجوزہ نصابات کی اوقاتِ مقررہ میں تدریس کے مکمل کرنے اور اسناد کے لائق بنانا ہے، بلکہ طالب علموں کی ذہنی وفکری نشو ونما کا سرو سامان مہیا کرانا اور ان کی نشر و اشاعت کا بندو بست بھی شعبہ کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح علمی اور تحقیقاتی سمینار، سمپوزیم، ورکشاپ وغیرہ کا اہتمام وانصرام بھی شعبے کے بنیادی مقاصد میں داخل ہے۔ 'دستک' ایک جامعاتی اور اکادمیائی ادبی رسالہ کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ اس کا واضح مقصد نئی نسلوں میں اردو شعر وادب سے دلچسپی اور اعلیٰ مذاق پیدا کرنا، کلاسیکی شعر وادب کے پہلو بہ پہلو معاصر ادبی رویّوں، ادب کے بدلتے تقاضوں، بالخصوص یونیورسٹی اور اعلیٰ درجات کے طلبا میں تحقیق وتنقید اور تخلیق سے شغف، تحقیق کے مبادیات، مسائل اور طریقۂ کار سے واقف کرانا ہماری ترجیحات میں شامل ہیں۔"

اس مقصد کے حصول کے لیے دستک کے پہلے شمارے 'دستک' میں تحقیق اور تنقید کے عنوان سے دو ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ تحقیق کے ذیل میں تحقیق کے مبادیات، مسائل اور طریقۂ کار پر مشتمل 5 مضامین شامل ہیں جبکہ عملی تحقیق کے نمونے کے طور پر 4 مضامین شامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان میں بعض مضامین پرانے ہیں لیکن یہ کمیاب اور نایاب ہیں اور ان کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس قسم کے مضامین نہ صرف مبتدی اور ریسرچ اسکالرز کی رہنمائی کرتے ہیں بلکہ ان تمام اساتذہ اور نگراں کے لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں جو تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی طرح تنقید کے حصے میں 4 مضامین ہیں جن کا تعلق نظری اور عملی تنقید سے ہے۔

اس شمارے کا اہم حصہ 'گوشہ شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی تاریخ، تہذیب اور ادبی روایت' کے عنوان سے ہے۔ اس میں چھ مضامین ایسے ہیں جن کا تعلق بنارس ہندو یونیورسٹی سے وابستہ شخصیات کی تحقیقی کارگزاریوں سے ہے۔ فائز بنارسی، مولوی مہیش پرشاد، حکم چند نیر، امرت لعل عشرت اور حنیف نقوی پر بالترتیب امرت لعل عشرت، عبدالسمیع، راجیش مشرا، عبدالسلام اور ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے مضامین تحریر کیے ہیں۔ ڈاکٹر مشرف علی نے شعبۂ اردو کی ادبی تنظیم 'دستک ادبی فورم' کا تعارف پیش کیا ہے اور رشی کمار شرما نے شعبۂ اردو کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے غالب صدی کے موقع پر شعبۂ اردو سے شائع ہونے والی کتاب 'نوائے غالب' (مرتبہ حکم چند نیر) کا جائزہ پیش کیا ہے۔ دستک کے مشمولات اور یہ گوشہ خاص طور پر قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اس گوشے میں شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی سے وابستہ شخصیات اور اس کی علمی و ادبی روایت کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ رسالے کے مدیر اور شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی کے اداریہ کی بھی خاص اہمیت ہے۔ انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کی تہذیبی تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے بنارس ہندو یونیورسٹی کے اختصاص کی جانب اشارے کیے ہیں۔ ساتھ ہی اردو زبان وادب کے سلسلے میں بعض اہم مسائل کی جانب اشارے بھی کیے گئے ہیں۔

'دستک ریسرچ جرنل' اردو کے تحقیقی اور تنقیدی رسائل کے باب میں اضافے کا حکم رکھتا ہے اور ابھی یہ ابتدا ہے، اسے دور تک سفر کرنا ہے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

اردو کے فروغ کے لیے فنڈ کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی: پرکاش جاوڈیکر

ملاقات کے دوران قومی کونسل کے وائس چیرمین ڈاکٹر شاہد اختر سے وزیر موصوف کی یقین دہانی

نئی دھلی: وزارت فروغ انسانی وسائل کے وزیر عزت مآب جناب پرکاش جاوڈیکر سے قومی کونسل کے حوالے سے ان کی رہائش گاہ پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئر مین ڈاکٹر شاہد اختر نے ملاقات کی اور فروغ اردو کے متعلق تبادلہ خیال کیا۔ ڈاکٹر شاہد اختر نے میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے بتایا کہ جناب پرکاش جاوڈیکر نے این ڈی اے سرکار کے دورِ اقتدار میں کونسل کے بجٹ میں اٹھاسی فیصد اضافے پر مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ حکومت اردو کے فروغ کے لیے بہت سنجیدہ ہے اور فنڈ کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی۔ ایک سوال کے جواب میں کونسل کے وائس چیرمین نے کہا کہ کونسل اردو کے فروغ کے لیے تین ریاستوں میں انٹریکٹو پروگرام کرنے جارہی ہے۔ آئندہ ماہ جھارکھنڈ میں 10 تا 12 فروری، آسام میں 15 تا 17 فروری اور منی پور میں 25 تا 28 فروری یہ پروگرام کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ان ریاستوں کی سرکاروں، اکیڈمیوں اور تنظیموں سے مل کر کونسل ایسا مربوط لائحۂ عمل تیار کرے گی جس سے اردو کا فروغ ممکن ہو سکے اور گھر گھر اردو کا چراغ جل سکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وزیر موصوف نے اس بات پر زور دیا کہ فی الوقت حکومت ہند کی جانب سے اقلیتوں کے لیے جو اسکیمیں چلائی جارہی ہیں، کونسل ان اسکیموں سے عوام کو واقف کرانے کے لیے بیداری مہم چلائے اور یہ بھی کہا کہ کونسل کے کمپیوٹر کورس CABA MDTP کے تحت جو بچے فارغ ہو رہے ہیں، سرکاران کے بہتر مستقبل کے لیے کارپوریٹ اور سرکاری سیکٹر میں صوبائی اور ضلعی سطح پر میلے لگا کر ان کو روزگار فراہم کرے گی۔ ڈاکٹر شاہد اختر نے بتایا کہ وزیر موصوف نے خاص طور پر کہا کہ جامعات سے فارغ طلبا وطالبات کے علاوہ مدارس کے فارغین کے لیے بھی کریئر کونسلنگ کا اہتمام کیا جائے تاکہ ان بچوں کا بھی داخلہ میڈیکل، انجینئرنگ، مینجمنٹ اور دیگر شعبوں میں ہو سکے۔ ڈی پی ایس، ڈی اے وی، سینٹرل اسکول اور نوودے ودیالوں جیسے اسکولوں میں بھی اردو کے فروغ کے لیے مسابقاتی اور کوئز پروگراموں کے انعقاد پر بھی پرکاش جاوڈیکر نے زور دیا تاکہ اردو تک ان بچوں کی بھی رسائی ہو سکے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 28 جنوری 2019

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں تقریب یوم جمہوریہ کا انعقاد

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کے صدر دفتر میں یوم

جمہوریہ کے موقعے پر پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا۔ اس تقریب میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد پرچم کشائی کی۔ کونسل کے عملے نے قومی ترانہ 'جن گن من' باواز بلند پیش کیا اور ترنگے کو سلامی دی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ آج کا دن یعنی یوم جمہوریہ ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آج ہی کے دن ہندوستان کا دستور عمل میں آیا تھا جس میں ملک کے ہر شخص کو مساوی اختیارات دیے گئے۔ اِس دن ملک کے تمام باشندوں کو یہ حلف لینا چاہیے کہ وہ ہندوستان کو ایک مثالی جمہوری ملک بنانے میں اپنا تعاون پیش کریں گے۔ ہمارا ملک ساری دنیا میں ایک عظیم جمہوری ملک کے طور پر جانا جاتا ہے اور یہاں کی مشترکہ تہذیب ثقافت کی حفاظت کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان سے بھی جمہوریت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ جمہوری قدروں کے فروغ اور اشاعت میں اردو نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اردو کے اسی جمہوری مزاج نے ملک کی سالمیت اور یکجہتی کو فروغ دیا ہے۔ اردو سے وابستہ ہر شخص کو جمہوریت کی ترقی کے لیے اپنے اختیارات اور فرائض کا استعمال کرنا چاہیے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2019

قومی اردو کونسل نابینا بچوں کے لیے رہنما لٹریچر تیار کرے گی: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی کونسل کے صدر دفتر میں بریل اِن اردو میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: آج کی میٹنگ کونسل کی تاریخ میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ بریل یعنی نابینا بچوں کے حوالے سے جو کتاب تیار کرنی تھی برسوں سے معرض التوا میں تھی لیکن کونسل نے اس سمت میں پیش قدمی کی ہے۔ کونسل کی یہ پیش قدمی اپنے اہداف کو پانے میں کامیاب رہے گی۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے صدر دفتر میں منعقدہ کمیٹی برائے بریل ان اردو کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس میٹنگ کا مقصد نابینا طلبہ و طالبات کے لیے اردو زبان میں بریل کی تیاری ہے۔ اب تک ہندوستان میں نابینا بچوں کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس حوالے سے جو رہنما لٹریچر پایا جائے گا اسی کی بنیاد پر کتاب تیار کی جائے گی۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے صدر پروفیسر اختر الواسع کی صدارت میں یہ کمیٹی تشکیل دی ہے۔ اس موقع پر پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ احمدی اسکول میں اردو بریل کے سلسلے میں جو بنیادی کام ہوا ہے اور اس سلسلے میں جو رہنما لٹریچر پایا جاتا ہے اس کو سامنے رکھ کر کونسل جلد از جلد ایک ورکشاپ منعقد کرے

گی، جس میں ملک کے ماہرین برائے بریل کو مدعو کیا جائے گا۔ ورکشاپ کے انعقاد پر مجوزہ سفارشات بریل کونسل آف انڈیا کو منظوری کے لیے بھیجی جائیں گی۔ انھوں نے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد کے اس قدم کی ستائش کی اور کہا کہ کونسل ان کی قیادت میں اور ترقی کے منازل طے کرے گی۔

اس موقع پر ماہر بریل جناب جواہر لال کول جنرل سکریٹری آل انڈیا کنفیڈریشن آف بلائنڈ، محترمہ فردوس رحمن پرنسپل احمدی اسکول برائے نابینا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جناب پرشانت ٹنڈن نمائندہ انتر درشٹی، جناب نیاز احمد استاد احمدی اسکول، محترمہ ممتاز بانو نابینا طلبہ و طالبات کے ماہر تعلیم اس کے علاوہ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم، محمد شہاب الدین اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 جنوری 2019

داستانوں میں ہماری تہذیب اور کلاسیکی زبان کا بڑا سرمایہ موجود ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ میٹنگ میں اردو کی قدیم داستانوں کی ازسرنو اشاعت کا فیصلہ

نئی دہلی: بہت سی پرانی داستانیں اب دستیاب نہیں ہیں۔ کسی کسی لائبریری میں خستہ حال صورت میں بعض داستانوں کے کچھ نسخے موجود ہیں۔ خدشہ یہ ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ نسخے بھی معدوم ہو جائیں گے اور اگر باقی بھی رہ گئے تو پڑھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے داستان سیریز کے ازسرنو شائع کرنے کے حوالے سے صدر دفتر میں منعقدہ میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل داستان کی اشاعت پر اس لیے زور دے رہی ہے کہ داستانوں میں ہماری تہذیب اور کلاسیکی زبان کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے۔ ہماری موجودہ نسل اپنی تہذیب و ثقافت سے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ اس لیے آج کی نسل کو اس سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے۔ انھوں

نے مزید کہا کہ قدیم داستانوں کی اشاعت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہماری نئی نسل اپنے لسانی سرمایہ سے واقف ہو سکے گی۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ماضی سے ہماری دلچسپی کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے سیریلوں میں ماضی کی جھلکیاں پیش کی جارہی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی داستانوں کی اپنی معنویت ہے۔ ان کی اشاعت سے ہماری نئی نسل یہ جان سکے گی کہ کس طرح داستانوں نے ماضی میں اپنی پہچان چھوڑی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کی میٹنگ میں چار داستانوں کی اشاعت کو منظوری دی گئی ہے جو دو صورتوں میں شائع کی جائیں گی۔ بچوں کے لیے سبق آموز داستانیں پیپر بیک میں اور دوسری لائبریری ایڈیشن کی شکل میں شائع ہوں گی۔ اس میٹنگ کی صدارت ڈائرکٹر موصوف نے کی۔

اس موقع پر علی گڑھ سے تشریف لائے پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے کہا کہ آج ہم داستانی زبان نہیں بولتے اور نہ لکھتے ہیں لیکن داستان کی زبان لسانی ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔ اپنی زبان کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سرمایہ محفوظ ہو تاکہ ہم اپنی زبان کے لسانی سفر کو سمجھ سکیں۔ پروفیسر شہناز انجم نے کہا کہ داستانوں کی اشاعت ماضی کے اثاثوں اور سرمایوں کو محفوظ رکھنے کی ایک قابل قدر کوشش ہوگی۔ ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے کہا کہ کونسل کا یہ کام کونسل کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ اس میٹنگ میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ڈاکٹر فیروز عالم، محمد انصر اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 31 جنوری 2019

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو، فارسی اور عربی میں رزمیہ شاعری: صلح و جنگ کی داستان

نئی دہلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سنٹر فار کمپیوٹر سائنس کے کانفرنس ہال میں 'اردو، فارسی اور عربی میں رزمیہ شاعری: صلح و جنگ کی داستان' کے عنوان سے دو روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا گیا ہے۔ سمینار ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور انجمن ترقی اردو ہند کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ سمینار میں بیرونی ممالک کے اہم ادبا، دانشور اور پروفیسر حضرات نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس میں ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے کنوینر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ملکی و غیر ملکی مہمانوں کا استقبال کیا۔ ساتھ ہی ساتھ جامعہ ازہر، عین شمس یونیورٹی اور ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے اشتراک سے چند ماہ بعد قاہرہ میں منعقد ہونے والے سمینار کا بھی کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے انیس و دبیر کے علاوہ ترقی پسند شعرا کے یہاں رزمیہ شاعری کی نشاندہی کی۔ اس موقعے پر جامعہ ازہر یونیورسٹی مصر کے وائس چانسلر پروفیسر یوسف عامر نے اپنی تقریر میں فروغ اردو کے تعلق سے روشن امکانات کی بات کی اور بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ مصر کے کلچرل کونسلر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ریحان خان نے اردو کی ترقی

’کیفی کی حیات اور کارنامے‘ کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

کے لیے اپنی کوششوں کے نتائج پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو ہند کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ سمینار کی مختلف نشستوں میں پروفیسر یوسف عامر، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر رانیا فوزی، ڈاکٹر ولا جمال، ڈاکٹر رشید احمد، ڈاکٹر ایم جے وارثی، ڈاکٹر مرلطفی، ڈاکٹر ارشد القادری اور ڈاکٹر سعدیہ سلیم وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔ جب کہ پروفیسر ابن کنول، پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی، پروفیسر یوسف عامر اور پروفیسر عباس رضا نیر وغیرہ نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اس پروگرام میں پروفیسر انور پاشا، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر توحید خان، ڈاکٹر رضا حیدر، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر شیو پرکاش، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر محمد محسن اور رکن الدین کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ ’میرا وطن‘ دہلی، 31 جنوری 2019

کیفی کی حیات اور کارنامے

لکھنؤ: کیفی اعظمی ایک زندہ دل انسان تھے۔ ان کی ساری کوششیں انسانیت کے لیے وقف تھیں۔ ان کی شاعری رومانیت کی بجائے پتھریلی راہوں پر جاتی دکھائی دیتی ہے۔ غریبوں، مظلوموں اور کمزوروں کے لیے بلند آواز ان کی شاعری کا مخصوص حصہ رہا ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر علی احمد فاطمی نے کیفی اعظمی صدی تقریبات کے تحت منعقدہ نشست بعنوان ’کیفی کی حیات اور کارنامے‘ میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ کیفی اعظمی بے حد حساس طبیعت کے تھے۔ ان کے سلسلے میں ہی سجاد ظہیر نے کہا تھا کہ وہ اردو شاعری کے سرخ پھول کی شکل میں کھلتے ہیں۔ آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام کیفی اعظمی کی صد سالہ سالگرہ کے موقعے پر منعقد پروگرام کی پہلی نشست میں ’کیفی کی حیات اور کارنامے‘ کے عنوان سے سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اپنے صدارتی خطاب میں شارب ردولوی نے کیفی کی شاعری میں عوامی بے چینی کو پیش کرنے کی خوبیوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ کیفی نے ’آندھی‘ جیسی نظموں کے ذریعے آندھی کی کیفیت کے بہانے عوام کو بیدار کرنے اور انھیں مخالف ہواؤں سے لڑنے کے لیے تیار کیا۔ مہمان خصوصی وی این رائے نے اپنے خطاب میں کہا کہ کیفی اعظمی نے اپنے گاؤں کی مٹی سے جو بھی کچھ لیا اس سے کہیں زیادہ لوٹا دیا۔ پروفیسر ظفر الدین نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کیفی اعظمی انسانیت کی فکر رکھنے والی شخصیت تھے اور بلاشبہ انھوں نے اپنی زندگی میں ہی وہ عزت و شہرت حاصل کرلی جس کے وہ حقدار تھے۔ صبیحہ انور نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا۔ سمینار کی نظامت لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر عباس رضا نیر نے کی۔ ولایت جعفری نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 15 جنوری 2019

علی سردار جعفری میموریل لکچر

ممبئی: ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے ساتویں علی سردار جعفری میموریل لیکچر کا انعقاد یونیورسٹی کے کالینا کیمپس میں واقع مراٹھی بھاشا بھون کے وسیع و عریض ہال میں کیا گیا۔ اس پروگرام میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے ’قرآن، سائنس اور اردو‘ کے موضوع پر انتہائی معلوماتی لیکچر دیا۔ انھوں نے اس لیکچر میں قرآن اور سائنس کے باہمی ربط کے اس پہلو پر خصوصی زور دیا کہ قرآن تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور یہی سائنس کے خصائص میں ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر ایک معاملے اور مسئلے پر غور و فکر کیا جائے اور اس منزل سے گزرنے کے بعد ایسے اقدام کیے جائیں جو انفرادی سطح پر مفید اور کارآمد ہونے کے ساتھ ساتھ پوری قوم اور معاشرے کے لیے بھی مفید ثابت ہو۔ انھوں نے کہا کہ دین اور دنیا میں کامیاب زندگی کے لیے قرآنی تعلیمات کو اپنی شخصیت کا جزو بنانا اور ان تعلیمات کو عام کرنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اجتماعی فلاح و بہبود کی جانب پیش قدمی کو قوم کی فوری اور لازمی ضرورت قرار دیتے ہوئے کہا کہ قوم کی ترقی اور خوشحالی اسی وقت ممکن ہے جب وسائل کی فراہمی کا ایسا منصفانہ نظام بنایا جائے جو ہر ضرورت مند کی ضرورت کی تکمیل کرنے میں معاون ہو۔ انھوں نے کہا کہ اصلاح ذات اور اصلاح معاشرے کی جانب سنجیدگی سے قدم بڑھانے اور گھر، خاندان اور معاشرہ کو ان اوصاف سے مزین کرنے کی ضرورت ہے جو اقدار حیات کا تحفظ کرنے کے ساتھ پرسکون اور خوش حال زندگی کی راہ ہموار کرسکیں۔

روزنامہ ’ہندوستان ایکسپریس‘ دہلی، 24 جنوری 2019

جلسۂ تقسیم اسناد

جمال محمد کالج، ترچنا پلی تمل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا علاقائی مرکز قائم ہے جہاں اردو ڈپلوما کورس، عربی سرٹیفکیٹ، کمپیوٹر ڈپلوما کورس اور عربی ڈپلوما کورس کی تعلیم دی جارہی ہے جس میں امسال 72 طلبا و طالبات نے ڈپلوما اردو لینگویج، 66 طلبہ و طالبات نے سرٹیفکیٹ ان عربک، 88 طلبہ و طالبات نے ڈپلوما ان فنکشنل عربک 72 طلبہ و طالبات نے کمپیوٹر ڈپلوما اور ان کے علاوہ کورسوں میں دو ہزار سے زائد طلبہ و طالبات نے بھی اسناد حاصل کیں۔ اس سلسلے میں دو روزہ شاندار اجلاس کالج آڈیٹوریم میں 5 اور 6 جنوری 2019 کو منعقد کیا گیا تھا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر اے کے خواجہ نظیم الدین صاحب، سکریٹری و کرسپانڈنٹ، جمال محمد کالج (خودمختار)، ترچناپلی نے کی۔ جلسے کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ پرنسپل جناب ڈاکٹر ایس اسماعیل محی الدین صاحب نے مہمانوں کا استقبال اور تعارف پیش کیا۔ مہمان خصوصی محترمہ ڈاکٹر بھونیشوری، رجسٹرار سنٹرل یونیورسٹی آف تمل ناڈو، تروارور نے خصوصی خطاب فرمایا اور مہمانِ اعزازی عزت مآب تنکاسی ایس۔ جواہر۔ آئی اے ایس پرنسپل سکریٹری نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر اے کے نظیم الدین صاحب، سکریٹری و کرسپانڈنٹ، جمال محمد کالج (خودمختار)، ترچنا پلی نے کی۔ کامیاب طلبہ و طالبات کو محترمہ ڈاکٹر ایس بھونیشوری، رجسٹرار سنٹرل یونیورسٹی آف تمل ناڈو، تروارور اور تنکاسی ایس جواہر آئی اے ایس پرنسپل سکریٹری نے اسناد تقسیم کیں۔

رپورٹ: ڈاکٹر ایس محمد مدثر، شعبۂ اردو، جمال محمد کالج، ترچنا پلی، 30 جنوری 2019

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

ریسرچ پر سرکاری سرمایہ کاری بڑھانے کی ضرورت ہے: جاوڈ یکر

جالندھر: انسانی وسائل کی ترقی کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ ریسرچ پر سرکاری سرمایہ کاری بڑھانے کی ضرورت ہے اور موجودہ حکومت اسی سمت میں کوشش

کررہی ہے۔ مسٹر جاوڈیکر نے لولی پروفیشنل یونیورسٹی میں 3 جنوری سے چلنے والے 106 ویں انڈین سائنس کانگریس کے چوتھے دن ویمن سائنس کانگریس کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ اسمارٹ فون ہو یا ریموٹ یا کوئی اور الیکٹرانک گجیٹ۔ سب ہندوستان سے باہر بنتے ہیں۔ غیرملکوں میں بڑی تعداد میں ہندوستانی انھیں بنانے کے لیے کام کرتے ہیں، لیکن وہ غیرملکوں میں ہی بنتے ہیں۔ فیس بک ہو، ٹویٹر ہو یا دیگر کوئی میڈیا پلیٹ فارم انھیں بنانے والے ہندوستانی ہیں، لیکن ان کی ملکیت ہندوستان کے پاس نہیں ہے۔ انھوں نے کہا ہمیں جدت سے بھی کام لینا ہوگا تبھی ملک ترقی کرسکتا ہے۔ ہم جدت طرازی بھی کریں گے اور جدت کے مالک بھی بنیں گے۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ بغیر تحقیق کے جدت ممکن نہیں۔ تحقیق میں سرکاری سرمایہ کاری میں مزید اضافہ ہونا چاہیے۔ ہماری حکومت اسی سمت میں کام کررہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں اب تک ریسرچ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیمی ادارے، صنعت اور تجربہ گاہیں اور تحقیقی ادارے الگ الگ کام کررہے تھے۔ دنیا بھر میں یہ دیکھا گیا ہے کہ اچھی تحقیق تبھی ممکن ہے جب تینوں مل کر کام کریں۔ ہم تینوں کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 جنوری 2019

نوودیہ ودیالوں میں 5 ہزار نشستوں کا اضافہ کیا جائے گا: پرکاش جاوڈیکر

نئی دهلی: انسانی وسائل کی ترقیات کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے نوودیہ ودیالیوں میں 5 ہزار نشستوں کا اضافہ کرنے کا اعلان کیا ہے۔ جاوڈیکر نے کہا کہ حکومت نے دیہی علاقوں کے اسکولی نظام کو مضبوط بنانے اور قابلیت والے غریب بچوں کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے۔

یہاں جاری ایک ریلیز کے مطابق مودی حکومت میں گذشتہ چار برسوں میں 9 ہزار نشستوں کا اضافہ کیا جاچکا ہے۔ اس اضافے کے ساتھ اب سیٹوں کی مجموعی تعداد 14 ہزار ہوجائے گی۔ اگلے چار سال میں مزید 32 ہزار نشستیں بڑھنے کا امکان ہے۔ اس وقت نوودیہ ودیالوں میں 46 ہزار طلبہ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اب 2019-20 کے سیشن میں 5 ہزار طالب علموں کی سیٹیں بڑھنے سے مجموعی طور پر طالب علموں کی تعداد 51 ہزار ہوجائے گی۔ نوودیہ اسکول میں چھٹی جماعت میں داخلے مقابلوں کے ذریعے ہوتے ہیں اور یہ مکمل طور پر رہائشی اسکول ہوتے ہیں۔ نوودیہ ودیالیہ ملک کا ایسا واحد اسکولی نظام ہے جس میں داخلے کے لیے امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ 2001 میں ساڑھے پانچ لاکھ طلبا نے امتحان دیے تھے۔ اب 2019 میں یہ تعداد بڑھ کر 31 لاکھ ہونے کا امکان ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جنوری 2019

جامعہ اردو کے طلبا کو جلد ملے گا آئی او ایس امتحان دینے کا حق: جاوڈیکر

علی گڑھ: مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر سے ان کی وزارت کے دفتر میں جامعہ اردو علی گڑھ کے ایک نمائندہ وفد نے ملاقات کی جس کی سربراہی مانو کے چانسلر فیروز بخت احمد کررہے تھے۔ مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے جامعہ اردو علی گڑھ کی تاریخ اور اس کی خدمات کو سنا جس کے بعد مرکزی حکومت کے ماتحت کام کرنے والے ثانوی تعلیمی ادارہ آئی او ایس کے بورڈ کو جامعہ اردو کے ادیب اور ادیب ماہر کو مساوی درجہ دینے کا حکم جاری کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر اور جامعہ اردو علی گڑھ کی اکیڈمک کونسل کے چیئرمین فیروز بخت احمد نے کہا کہ جامعہ اردو علی گڑھ ایک ایسا ادارہ ہے جو گذشتہ برس سے اردو کو روزگار سے جوڑنے کا کام کررہا ہے۔ رجسٹرار شمعون رضا نقوی نے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کو جامعہ اردو علی گڑھ کے سو سے زیادہ دیگر بورڈ اور یونیورسٹی کے ذریعے دیے گئے مساوی درجے کے حکم نامے کو دکھایا۔ او ایس ڈی فرحت علی خان نے کہا کہ اردو کو اصل دھارے سے جوڑنا ہی جامعہ اردو کا کام ہے اور یہی اس کا عزم بھی ہے۔ مرکزی وزیر کے ذریعے مساوی درجہ دیے جانے کے حکم نامے سے اردو طبقے میں خوشی کی لہر ہے۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے اے ایم یو کے سینٹروں کو خصوصی پیکیج دینے اور سالانہ بجٹ میں شامل کیے جانے کا مطالبہ کیا، انھوں نے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کو جامعہ اردو کے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت کی دعوت بھی دی۔

مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کو نمائندہ وفد نے گلدستہ، یادگاری نشان اور شال پیش کرکے اعزاز بخشا۔ نمائندہ وفد میں اے ایم یو کورٹ ممبر پروفیسر ہمایوں مراد، مجید خان اور شاہد پرویز موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 فروری 2019

27واں عالمی کتاب میلہ

نئی دھلی: اس سال 27ویں عالمی کتاب میلے کا خصوصی موضوع(Theme) معذورین (جسمانی طور پر) تھا۔اس سلسلے میں نیشنل بک ٹرسٹ نے مختلف ذریعوں اور طریقوں سے یہ پیغام دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ جسمانی معذوری انسان کی ترقی کی راہ کا روڑہ نہیں بن سکتی اور بے شمار جسمانی طور پر معذور لوگوں نے تقریباً ہر میدان میں غیر معمولی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر نے نئی دہلی کے پرگتی میدان میں نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا اور آئی ٹی پی او کے زیر اہتمام لگائے جانے والے 27ویں عالمی کتاب میلہ 2019 کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کتابیں پڑھنے سے زندگی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور ایک الگ قسم کی خوشبو ذہن کو تر و تازہ کرتی ہے جس کا الفاظ میں بیان کر پانا ممکن نہیں۔ اس موقعے پر ان کے ہمراہ کتاب میلہ کے اہم شریک ملک شارجہ حکومت کے متعلقہ محکمہ کے صدر شیخ فہیم بن سلطان القاسمی بطور مہمان خصوصی اور بطور مہمان اعزازی شارجہ بک اتھارٹی کے چیئرمین احمد بن رقاد العمیری، پدم شری جے ایل کول اور شارجہ سے آئے قلم کاروں کے نمائندہ وفد کے صدر حبیب ال یوسف عبداللہ بھی موجود تھے۔ کتابوں کی بات کرتے ہوئے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے جہاں ایک جانب این بی ٹی اور آئی ٹی پی او کی حوصلہ افزائی کی کہ جس نے اتنی کم جگہ ہونے اور تعمیراتی کام مسلسل جاری ہونے کے باوجود بھی اس اہم ترین میلے کو لگانے کا کام کیا، وہیں دوسری جانب شارجہ اور ہندوستانی روابط پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔ پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ گذشتہ سال اس میلے میں 12 لاکھ سے زیادہ کتابوں کے چاہنے والے آئے۔ یہ تعداد انٹرنیٹ کے دور میں بھی کم نہیں ہورہی ہے۔ اس کی وجہ دراصل ہندوستان کا اپنا کلچر ہے جہاں آج بھی کتابوں کی اہمیت اور افادیت کو سمجھنے والے ہیں۔ اس موقعے پر مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے وزیراعظم نریندر مودی کی تحریر کردہ کتاب 'امتحان میں کامیابی کیسے پائیں' شارجہ سے آئے شیخ فہیم بن سلطان القاسمی کو پیش کی۔ شیخ فہیم بن سلطان القاسمی نے اپنے خطاب میں دونوں ممالک کے بہتر تعلقات اور فن و ثقافت کے تعلق سے بات کی اور کہا کہ انھیں اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی شارجہ میں ہر شعبہ ہائے زندگی میں شرکت ہے بلاشبہ وہ ان کا وطن ثانی ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین بلدیو بھائی شرما نے کلیدی خطبہ پیش کیا اور میلے کی اہمیت اور حصولیابیوں کو پیش کیا اور مہمانوں کا استقبال بھی کیا۔ آخر میں این بی ٹی کی ڈائرکٹر ریتو چودھری نے اظہار تشکر کیا۔

نیشنل بک ٹرسٹ کے زیر اہتمام نئی دہلی کے پرگتی میدان میں 5 تا 13 تک چلنے والا 27واں عالمی کتاب میلہ اتوار کے روز تزک و احتشام کے ساتھ اختتام پذیر ہوگیا۔ اس کتاب میلے کی ایک اہم خصوصیت یہاں آنے والے بچوں کے لیے موجود مختلف اشیا بھی رہیں۔ گذشتہ تمام دنوں میں آنے والوں کی تعداد کا حساب لگایا جائے تو تقریباً 9 لاکھ لوگوں نے میلے میں شرکت کی ہے۔

اس بار گذشتہ دنوں عالمی کتاب میلے میں اردو کے مجموعی طور پر 15 اسٹال نظر آئے جبکہ اردو کتابیں خریدنے والوں کی تعداد اس بار زیادہ تھی۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ لوگوں کی اردو سے دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ ریختہ نے اردو شعرا کی 26 کتابیں ہندی میں شائع کیں۔ ان میں سب سے زیادہ شارق کیفی کی کتاب 'کھڑکی تو میں نے کھول ہی لی' اور پاکستانی شاعر انور شعور کی کتاب 'اب میں اکثر میں نہیں رہتا' پسند کی گئی۔ سالم سلیم کی کتاب 'واہمہ وجود کا' کے خریدار بھی کافی نظر آئے۔ مجموعی رسپانس کو دیکھتے ہوئے اگلے برس 'ریختہ' کے اسٹال پر 26 شعرا کی جگہ 260 شعرا کی کتابیں لانے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ 'ریختہ' نے انٹرنیٹ کے استعمال کے بعد ترجمے کے ذریعے بھی اردو شعرا کو مقبولیت دینے کی ذمے داری سنبھال لی ہے۔ اردو اکادمی دہلی کے اسٹال پر روزانہ کافی بھیڑ نظر آئی۔ اکادمی نے کتابوں پر اچھی خاصی چھوٹ دی تھی۔ سب سے زیادہ جو کتاب لوگوں نے خریدی، وہ سرسید احمد خاں کی 'آثار الصنادید' ہے۔ اس کے بعد ادبا و شعرا کے مونوگراف زیادہ فروخت ہوئے۔ خاص کر غیر مسلموں نے غالب کے دیوان سے خاصی دلچسپی دکھائی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اسٹال پر لوگوں کا تانتا لگا رہا۔ اس کے اسٹال پر کئی موضوعات کی کتابیں نظر آئیں اور لوگوں کو اپنی پسند کی کتابیں چننے میں آسانی ہوئی لیکن کونسل اس بار اپنے پروگراموں کی وجہ سے زیادہ سرخیوں میں رہی۔ اس کا پروگرام 'شمولیت: بااختیار بنانے کی جانب پہلا قدم' بے حد پسند کیا گیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یہ احساس دلایا کہ وہ کچھ الگ ہٹ کر بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مجموعی طور پر عالمی کتاب میلے میں اردو کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اردو والوں کو وقت کی تبدیلی اور قارئین کے مزاج کو سمجھنا چاہیے، سائنسی موضوعات، بالخصوص اسپیس سائنس اور نینو ٹیکنالوجی وغیرہ پر بھی کتابیں دستیاب کرانی چاہئیں، ترجموں کے ذریعے عالمی ادب کی بہترین کتابیں دستیاب کرانے کی کوشش کرنی چاہیے، دنیا کی مقبول زبانیں سکھانے کے لیے گائڈ اور ڈکشنریاں ہونی چاہئیں اور یہ کام اردو اداروں کو کرنا چاہیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5، 6، 14 و 25 جنوری 2019

اردو زبان کو گھر گھر پہنچانے کا عزم

حیدرآباد: فرخندہ بنیاد شہر حیدرآباد میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی بار حیدرآباد تشریف لائے۔ ڈاکٹر مختار احمد فردین صدر اردو ماس سوسائٹی نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد کا شایان شان انداز میں استقبال کیا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے سمینار میں شرکت کرتے ہوئے توسیعی لکچر دیا۔ انھوں نے 'شاذ تمکنت اور حیدرآباد کے اردو اخبارات' کے عنوان پر مدلل روشنی ڈالی۔ اس سمینار میں تین اہم شخصیات کو سوسائٹی کے باوقار 'اردو رتن ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا جن میں قابل ذکر صدر شعبہ اردو نذیر احمد پرنسپل کالج ہذا، ڈاکٹر اے روجا رانی اور سمینار کے خصوصی مہمان ڈائرکٹر قومی کونسل ڈاکٹر شیخ عقیل احمد شامل تھے۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ اردو قومی کونسل ایسے چہروں کو متعارف کرائے گی جو اردو کے سچے خادم ہیں۔ بغیر کسی لابی کے براہِ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں مجھے اپنے مفید مشوروں اور تجاویز سے نوازیں۔ ہم ساتھ مل کر اردو کو فروغ دیں گے۔

روزنامہ 'تاثیر' حیدرآباد، 15 جنوری 2019

دھلی: ——————————

اردو پڑھاؤ اردو بچاؤ

نئی دھلی: سرسید مشن فار انڈیا کی تحریک 'اردو پڑھاؤ اردو بچاؤ' کا ایک سال مکمل ہونے پر جنتا کالونی ویلکم میں اردو تعلیمی سینٹر قائم کیا گیا جس میں بچوں کو کاپی کتاب وغیرہ مفت دی جائیں گی اور فیس کے نام پر بھی والدین سے کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ سینٹر کی افتتاحی تقریب میں ذاکر حسین نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہمارا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہے۔ اس کی حفاظت اور بقا ہمارا فریضہ ہے جسے آئندہ نسل میں منتقل کیے بغیر پورا نہیں کیا جاسکتا۔ کنوینر اردو تحریک محمد فرقان خاں نے کہا کہ ہم اردو کے ختم ہونے کا رونا برابر روتے ہیں اور الزام گورنمنٹ کے سر رکھتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسروں کو مورد الزام نہ ٹھہرا کر اپنے فعل کو درست کریں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 جنوری 2019

عالمی بریل ڈے

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عالمی بریل ڈے ایک دستخطی مہم کے ساتھ منایا گیا، جس میں معذور افراد کے لیے ابلاغ کے ذرائع کو بہتر بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔

پروگرام کا انعقاد جامعہ میں واقع شاعر مرزا غالب کے مجسمہ کے نزدیک عمل میں آیا۔ پروگرام کا آغاز فیکلٹی آف ایجوکیشن کے ڈین پروفیسر الیاس حسین کے خطاب سے ہوا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالملک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جوائنٹ رجسٹرار فیکلٹی آف ایجوکیشن کی پروفیسر سارہ بیگم، محمد فیض اللہ خان اور دیگر اعلیٰ عہدے داران بھی موجود تھے۔ یہ پروگرام لوئس بریل کی سالگرہ کی یاد میں منعقد کیا گیا، جنھوں نے اس میدان میں بے پناہ خدمات انجام دی ہیں، جس کی وجہ سے نابینا افراد کو پڑھنے لکھنے اور ذرائع ابلاغ کی ترسیل میں سہولت میسر آئی۔ پروفیسر سارہ بیگم ٹیچر ٹریننگ نان فارمل ایجوکیشن کی سربراہ نے کہا کہ لوئس بریل نے نابینا افراد کو آسانی فراہم کرنے اور ان کے تعلیم وتعلم کے علاوہ ترسیل کے لیے جو طریقۂ تحریر ایجاد کی ہے، اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے لوئس بریل کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے انسانیت کے لیے خدمات انجام دی تھیں۔ ملک میں اس جانب کافی کام ہوا ہے اور خصوصی طور پر اردو زبان کے حوالے سے کافی مثبت کام ہوا ہے، جسے اردو لوئس بریل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی موقعے پر دوسرے شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ پروگرام کا اختتام سور بھ رائے اسسٹنٹ پروفیسر کے کلمات تشکر سے ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جنوری 2019

اردو تہذیب وثقافت

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ انگریزی کی جانب سے 'کلونیل ساؤتھ ایشیا میں اردو تہذیب وثقافت' کے موضوع پر ایک توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ واشنگٹن یونیورسٹی کے شعبۂ ایشین لینگویجز اینڈ لٹریچر کی ایسوسی ایٹ پروفیسر جینیفر دبرو نے اپنے خطاب میں انیسویں صدی میں اردو زبان وادب کا ارتقا اور ساؤتھ ایشیا میں اس کی ترقی کے حوالے سے بتایا کہ اردو زبان وادب نے دنیا میں تقریباً ہر جگہ اپنے اثرات مرتب کیے اور خصوصی طور پر ساؤتھ ایشیا میں اس کی تعمیر وترقی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نول کشور مطبع لکھنؤ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، پنجاب وغیرہ میں اردو اور اس کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان شہروں میں اردو زبان نے بے انتہا ترقی کی جہاں اس کے ناز نخرے برداشت کیے گئے۔ ڈاکٹر جینیفر دبرو نے چھوٹے شہروں کانپور، مرادآباد، بدایوں اور دیگر چھوٹے چھوٹے قصبات میں اردو نے کس طرح اپنے پاؤں پسارے اور کس انداز سے ان جگہوں پر اس کی پرورش و پرداخت ہوئی اور کیسی کیسی ہستیوں نے اس زبان کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اس پر بھی روشنی ڈالی۔ اودھ اخبار اور اودھ پنچ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انیسویں صدی میں ان اخبارات نے اردو کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس ناول میں زبان کی نزاکتوں کو بڑی خوبی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فی زمانہ بھی اردو مختلف تہذیبوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو جوڑنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ پروگرام کی صدارت شعبہ عمرانیات ولسانیات کے ڈین پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ پروفیسر نشاط زیدی سربراہ شعبہ انگریزی نے کلمات تشکر ادا کیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 جنوری 2019

جشن بھارت

نئی دھلی: مشہور ومعروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی

نے کہا کہ کسی بھی بات کا فیصلہ تعداد سے نہیں ہوتا بلکہ معیار سے ہوتا ہے۔ وہ جشن جمہوریہ کی مناسبت سے ثقافتی تقریب بعنوان 'جشن بھارت' سے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں خطاب کر رہے تھے۔ تقریب کی صدارت سابق گورنر سید سبط رضی نے کی جب کہ مہمان خصوصی میں جسٹس آفتاب عالم اور جسٹس شیوا کیرتی سنگھ وغیرہ موجود رہے۔ فلم ہدایت کار سید مظفر علی، پروفیسر وسیم بریلوی، پروفیسر مینو بخشی و کامنا پرساد نے شمع روشن کرکے اس جشن کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد علی عابدی امروہوی کے ذریعے مرتب کی گئی سینئر آئی اے ایس کرن سونی گپتا کی پینٹنگ پر مبنی کتاب 'رنگ جہاں' کی رونمائی عمل میں آئی۔ پدم شری ڈاکٹر محسن ولی، سابق کمشنر نجیب اشرف چودھری، انصار صدیقی وایڈووکیٹ سید نقوی نے مہمانان کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا۔ اپنے مخصوص انداز میں بات کرتے ہوئے وسیم بریلوی نے جشن بہار کی بانی کامنا پرساد کو اردو کی خاتون اوّل کا خطاب دیتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف اردو کی محافظ ہیں بلکہ ہندوستانیت کی بھی محافظ ہیں۔ انھوں نے مظفر علی کے تعلق سے کہا کہ وہ رومانی نہیں بلکہ روحانی تحریک کے علمبردار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان اگر چاہتی بھی تو بھی ہندوستان کے علاوہ کہیں اور پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس موقعے پر فلم ہدایت کار مظفر علی نے عصر حاضر میں سماج کو محبت کی ضرورت، کامنا پرساد نے جنگ آزادی میں شاعری کے کردار پر تبادلہ خیال کیا جس کے بعد شاعر پون کمار، ڈی ایم پیلی بھیت ڈاکٹر اکھلیش مشرا، پروفیسر مینو بخشی، شرف نانپاروی اور سلیم امروہوی نے اپنے کلام پیش کیے۔ مہمانان وشرکا کے اصرار پر پروفیسر وسیم بریلوی نے اپنی کئی غزلیں سنائیں۔ اس دوران اس سال کا 'فخر ہند اعزاز' کمشنر ابرار احمد، مظفر علی، ڈاکٹر عزادار حسین، ڈاکٹر اکھلیش کمار، پون کمار، ڈاکٹر یوسف جمال، ڈاکٹر اروند کمار کو مہمانان کے دست مبارک سے دیا گیا جس کے بعد عالمی شہرت یافتہ غزل گلوکارہ انیتا سنگھوی نے صوفیانہ کلام سے سامعین پر وجد طاری کر دیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر ناشر نقوی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جنوری 2019

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خصوصی خطبہ

نئی دھلی: فیض کی شاعری میں کچھ ایسی نرمی و دل آویزی، کچھ ایسی کشش و جاذبیت، کچھ ایسا لطف و اثر، کچھ ایسی دردمندی و دل آسائی اور کچھ ایسی قوتِ شفا ہے، جو ان کے معاصرین میں کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ ان خیالات

کا اظہار اردو کے مایۂ ناز ادیب، نقاد، ماہر لسانیات پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام خصوصی 'سموتسر لیکچر' میں کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ فیض احمد فیض نے اردو شاعری میں نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کیا، تاہم انھوں نے نئے اظہاری پیرائے وضع کیے اور سیکڑوں ہزاروں لفظوں، ترکیبوں اور اظہاری سانچوں کو ان کے صدیوں پرانے مفاہیم سے ہٹا کر بالکل نئے معنیاتی نظام کے لیے برتا، اور یہ اظہاری پیرائے اور ان سے پیدا ہونے والا معنیاتی نظام بڑی حد تک فیض کا اپنا ہے۔ فیض نے کلاسیکی شعری روایت کے سرچشمۂ فیضان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ ان کی لفظیات کلاسیکی روایت کی لفظیات ہے، لیکن اپنی تخلیقیت کے جادوئی لمس سے وہ کس طرح نئے معنی کی تخلیق کرتے ہیں، یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی جامع اور پر مغز تقریر میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ فیض کی فکر انقلابی ہے، لیکن ان کا شعری آہنگ انقلابی نہیں۔ وہ اس معنی میں باغی شاعر نہیں کہ وہ رجز خوانی نہیں کرتے، ان کے فن میں سخن سنجی اور نرم آہنگ نغمہ خوانی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لگ بھگ دو گھنٹوں پر محیط اپنی تقریر میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ فیض کی اہمیت اس میں ہے کہ انھوں نے جمالیاتی احساس کو انقلابی فکر پر قربان نہیں کیا۔ فیض نے اپنے تخلیقی احساس سے ایسی شعری وحدت کی تخلیق کی جس کی حسن کاری، لطافت اور دل آویزی تو احساسِ جاں کی دین ہے، لیکن جس کی دردمندی اور دل آسائی جمالیاتی و ترقی پسند احساس سے آئی ہے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جنوری 2019

اتر پردیش:

ظفر پیکر انسانیت ومحبت

لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی اور اودھ آرٹ گیلکسی کا منظوم اردو ڈرامہ 'ظفر پیکر انسانیت و محبت' میں مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا حب الوطنی کا جذبہ، ان کی شاعری اور فن اور ان کی لاچارگی کے مختلف رنگ اور زندگی کے کئی پہلوؤں کی کامیابی سے ترجمانی کرنے والی پیشکش کا انعقاد پریس کلب میں ہوا۔ قابل ذکر ہے کہ پیشکش میں مہمانِ خصوصی کے طور پر گورنر رام نائک نے اردو اکادمی سے بہادر شاہ ظفر کے میموریل قائم کرنے کے لیے مناسب تجویز طلب کرنے کے ساتھ ہی ڈرامہ کو اٹل بہاری واجپئی کنونشن سنٹر کے بڑے سمینار ہال میں کرانے کی اپیل کی تھی تاکہ وہ خود بھی اس میوزیکل پیشکش کو دیکھ سکیں اور بہادر شاہ ظفر کا میموریل تیار کرنے کے لیے مناسب تجویز مرکزی حکومت کو بھیج سکیں۔ پروگرام میں اردو اکادمی کی چیئر پرسن پروفیسر آصفہ زمانی نے اس پہل کی تعریف کی۔ پیشکش کی سب سے بڑی کامیابی یہ رہی کہ شہنشاہ کے پڑپوتے پرنس مرزا فیض الدین بہادر شاہ ظفر سوئم نے اسے دیکھا اور وہ اتنا خوش ہوگئے کہ اسی کے ساتھ روتے ہنستے رہے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کا کردار نبھانے والے اداکاروں کو گلے سے لگا لیا۔ پروگرام میں ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ ظفر اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہا۔ اس فنکارانہ ملن پروگرام میں فنکاروں اور معاونین کی افزائی بھی کی گئی۔ آصف رضوی کی ڈرامہ نگاری میں اسٹیج پر پیش ہونے والے اس ملن پروگرام میں مصنف وہدایت کار پردیپ شریواستو اور اداکار اطہر نبی کے علاوہ پوری ٹیم نے حصہ لیا۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 4 جنوری 2019

موجودہ سماجی تغیرات کے فکشن پر اثرات

میرٹھ: زبانوں کے مابین دوریاں ختم کرنا وقت کا تقاضا بھی ہے اور ہماری ذمہ داری بھی۔ قصور وار زبانیں نہیں بلکہ انسان ہوتا ہے کیونکہ زبانوں کا کوئی مفاد نہیں ہوتا، مفاد انسان کا ہوتا ہے اور وہ اسی مفاد کے حصول کے لیے مختلف حیلوں بہانوں سے جھگڑا کرتا ہے۔ "ہمیں اپنے ملک وقوم کی ترقی کے لیے اس جھگڑے کو فوراً ختم کرنا چاہیے۔" یہ باتیں پروفیسر شمیم حنفی نے شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے 'موجودہ سماجی تغیرات کے فکشن پر اثرات' کے عنوان پر منعقدہ چہار روزہ کثیر لسانی عالمی سیمینار (اردو، ہندی، انگریزی) کے افتتاحی اجلاس کا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہیں۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجا نے شرکت کی اور مہمانان ذی وقار عارف نقوی، جرمنی، ڈاکٹر سید فاروق، ڈائریکٹر ہمالین ڈرگس، پروفیسر یوگیندر سنگھ، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ تھے۔ نظامت کے فرائض معروف شاعر و ناظم معین شاداب نے انجام دیے۔

بعد ازاں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور پروگرام کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو کے لیے آج تاریخی دن ہے۔ آج اردو، ہندی اور انگریزی کے دانشور جمع ہیں۔ اس چہار روزہ کثیر لسانی عالمی سیمینار میں "موجودہ سماجی تغیرات کے فکشن پر اثرات" پر گفتگو ہو رہی ہے۔

مہمان خصوصی شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجا نے اپنے خطاب میں محبت کے پیغام کو عام کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ تمام زبانوں کا مقصد ایک دوسرے کو جوڑنا اور محبت کا پیغام دینا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ ادب مختلف میدانوں میں اپنے اثرات چھوڑتا ہے۔ جرمنی سے تشریف لائے عارف نقوی نے جرمنی میں اردو ادب کی ترویج واشاعت کا ذکر کیا۔ اسی درمیان ڈاکٹر صالحہ رشید کی کتاب 'اسلم جمشید پوری : اردو افسانے کی ایک منفرد آواز' اور پروفیسر اسلم جمشید پوری کی کتاب 'آسمان ادب کا ستارہ : عارف نقوی' کا اجرا بھی مہمانان

کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ شعبۂ اردو میں منعقدہ چہار روزہ کثیر لسانی عالمی سیمینار (اردو، ہندی، انگریزی) کے دوسرے دن اردو کے دو اجلاس ہندی کا ایک اجلاس اور شام افسانہ کی محفل منعقد کی گئی۔ چہار روزہ سمینار کے مختلف سیشن میں پریم چند، قرۃ العین حیدر، گوپال داس نیرج، قاضی عبدالستار، انتظار حسین، پروفیسر عظیم الشان صدیقی، عابد سہیل اور پروفیسر ارون کمار کی خدمات پر گفتگو کی گئی۔ سمینار میں کئی کتابوں کا اجرا بھی ہوا۔

'موجودہ سماجی تغیرات کے فکشن پر اثرات' عنوان سے منعقدہ چہار روزہ کثیر لسانی عالمی سیمینار (اردو، ہندی، انگریزی) کے چوتھے اور آخری دن ریسرچ اسکالرز سیمینار، کتاب کی رسم اجرا اور تقسیم انعامات کا پروگرام منعقد ہوا۔ آخر میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے مہمانوں اور مقالہ نگاروں کو پھول، سرٹیفکٹ اور نشان یادگار دے کران کی حوصلہ افزائی کی۔

پریس ریلیز: پروفیسر اسلم جمشید پوری، شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ 22 جنوری 2019

مولانا عبدالماجد دریابادی بحیثیت ادیب وناقد

لکھنؤ: مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اتنی ہشت پہلو ہے کہ ان پر کوئی ایک لیبل چسپاں کرنا ممکن نہیں ہے

یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ محض ایک صحافی تھے یا محض ایک انشا پرداز، یا صرف ایک ادیب یا محض ایک مفسر قرآن تھے۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اردو زبان وادب کی اتنی گراں بہا خدمات انجام دیں جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پدم شری پروفیسر آصفہ زمانی چیئرپرسن اترپردیش اردو اکادمی نے سن شائن ویلفیئر سوسائٹی لکھنؤ کے زیر اہتمام بہ اشتراک اترپردیش اردو اکادمی منعقد سمینار بعنوان 'مولانا عبدالماجد دریابادی بحیثیت ادیب و ناقد' میں صدارت کرتے ہوئے کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر صابرہ حبیب، ڈاکٹر صبیحہ انور اور مہمان اعزازی کے طور پر عائشہ صدیقی اور سلمیٰ حجاب نے شرکت کی۔ نظامت عقیل احمد فاروقی نے کی۔

پروفیسر صابرہ حبیب نے کہا کہ اپنے ابتدائی دور میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے شاعری بھی کی اور ڈرامہ بھی لکھا۔ اس طرح ان کا رشتہ تخلیقی ادب یا ادب لطیف سے بھی جڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے کہا کہ انھوں نے مضامین کے علاوہ فلسفہ، نفسیات، تاریخ، منطق، مذہب، کلچر اور تصوف پر بھی بہت کچھ لکھا۔ عائشہ صدیقی نے کہا کہ مولانا عبدالماجد نے سوانح اور سفرنامے بھی لکھے، منفرد انداز میں تفسیر قرآن لکھی۔ مختلف موضوعات پر انگریزی کتابوں کے ترجمے اردو میں کیے۔ قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں کیا، جو ایک ایسا کارنامہ ہے جسے کوئی معمولی استعداد رکھنے والا شخص انجام نہیں دے سکتا۔ سلمیٰ حجاب نے کہا کہ صحافت سے ان کا اٹوٹ رشتہ تھا جو ان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ وہ کوئی پیشہ ور صحافی نہیں تھے بلکہ اس میدان میں بھی ایک اصلاحی مقصد ہمیشہ ان کے ہم قدم رہا۔ سمینار میں کئی پرمغز مقالے پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 جنوری 2019

بہار

دوروزہ علمی مذاکرہ

پورنیہ: انسان کی شناخت آپسی ربط اور اتحاد سے ہی ممکن ہے، جو قوم اپنے ماضی کی تاریخ فراموش کردیتی ہے اس کا وجود مٹ جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ اور سابق استاد دارالعلوم بوجگاؤں مفتی سہراب عالم ندوی نے کیا۔ وہ دو روزہ علمی مذاکرہ برائے ابنائے قدیم دارالعلوم ضیاء الاسلام بوجگاؤں، قصبہ کی تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ نظامت ابنائے قدیم میں سے مولانا عمران الحق ندوی، مولانا خالد حبیب ندوی، ڈاکٹر آفتاب احمد ندوی، مولانا تنویز کی سلفی مدنی نے کی۔ تقریب میں مولانا توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کشن گنج کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مطیع الرحمٰن سلفی مدنی، آل انڈیا ملی کونسل مشرقی اترپردیش کے صدر مولانا طارق شفیق ندوی نے بطور مہمانان خصوصی شرکت کی۔ اس موقعے پر ابنائے قدیم کے ذریعے تیار شدہ 'قطرہ پہ گہر ہونے تک' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دارالعلوم سے متعلق احباب، اساتذہ کرام کے پیغامات ومشاہدات اور تقریباً 70 ابنائے قدیم کے تاثرات ہیں، جسے ابنائے قدیم نے تقریب میں پیش بھی کیا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر قمر شعبان ندوی نے کتاب کا مختصر تعارف کرایا۔ اس موقعے پر تقریباً 45 سابق اساتذہ اور موجودہ اساتذہ وملازمین کو اعزاز سے نوازا گیا۔ کلمات تشکر تقریب کے کنوینر شمیم اختر ندوی اور احرار الہدیٰ شمس ندوی نے ادا کیے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جنوری 2019

جشن اردو

پٹنہ: گذشتہ روز جب بہار کے ہردل عزیز وزیر تعلیم واردو دوست جناب کرشن نندن پرساد ورما نے 'بھاشا سنگم' کا خصوصی شمارہ دیکھا تو انہوں نے برجستہ کہا کہ میں اردو ڈائرکٹوریٹ کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوں اور

مجھے خوشی ہے کہ میں نے جشن اردو کے موقع پر جس طرح اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا اس کا عملی ثبوت بہار میں اس شعبہ کے ذریعہ پیش کیا جارہا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اردو کسی قوم کی بھاشا نہیں ہے، کسی ایک جماعت کی بھاشا نہیں ہے یہ پیاری زبان ہے اس میں ہم کوئی بات اتنے اثر دار طریقہ سے کہتے ہیں کہ فوراً وہ بات اثر کرتی ہے اور یہ خیال بنتا ہے کہ یہ آدمی واقعی کچھ جانتا ہے اور اچھا بولتا ہے اس لیے اردو کا پھیلاؤ ہو رہا ہے۔ انھوں نے اردو سے اپنے والہانہ رشتہ کے تحت اس بات پر بھی زور دیا کہ یہ زبان ہمیں تہذیب وتمدن سے اس قدر قریب رکھتی ہے کہ ہماری خود بخود صحت مند تربیت ہوجاتی ہے۔ آج امتیازی احمد کریمی صاحب اور ان کے رفقا اردو کی بقا کی سمت میں مثبت پیش رفت کررہے ہیں۔

اس موقعے پر افسانہ نگار و ماہر تعلیم ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ میں برسوں سے محسوس کررہا ہوں کہ اردو ڈائرکٹوریٹ نے مختلف اوقات میں جس طرح سے بہترین خدمات سے سبھوں کو مستفیض کیا ہے اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہمیں ایک بہترین سربراہ مل جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اردو کا فروغ نہ ہو۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر امتیاز احمد کریمی کی قائدانہ صلاحیت کا معترف ہوں کہ انھوں نے ایک انجمن کی طرح اردو کی جو خدمت کی ہے اس کی مثال آزاد ہندوستان میں کم کم ملتی ہے۔

پریس ریلیز: قاسم خورشید، پٹنہ، 21 جنوری 2019

عوامی اردو نفاذ کمیٹی کی تقریب

کیسریا: اردو زبان و ادب ہندوستان کی نہایت دلنشیں زبان ہے اور اردو زبان و ادب ہی ہماری تہذیب و ثقافت کی امین و ترجمان ہے۔ کسی بھی زبان و ادب میں مہارت دو دسترس حاصل کرنے کے لیے اردو کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ دنیا کی تمام اعلیٰ تعلیمات حاصل کرنے کے لیے اردو زبان و ادب میں قیمتی مواد موجود ہے اور اردو نصاب تعلیم کے ذریعے بھی ملک میں منعقدہ سبھی مقابلہ جاتی امتحانات میں ہم شرکت کر سکتے ہیں۔ مذکورہ باتیں مولانا سعید احمد قادری نے الفلاح ٹیوشن سینٹر بانس گھاٹ چکیا میں عوامی اردو نفاذ کمیٹی مشرقی چمپارن کے زیر اہتمام منعقدہ نشست سے خطاب کرتے ہوئے کہیں اور مزید بتایا کہ اردو کی اہمیت وافادیت سے آشنائی کی ضرورت ہے۔ اس کی تعلیم کے بغیر ہم کسی بھی شعبے میں کامیاب وکامران نہیں ہو سکتے کیونکہ بنیادی طور پر کسی بھی زبان کی درست ادائیگی کے لیے اردو زبان کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں ہے اس لیے عوام الناس کو باضابطہ طور پر ہم بیدار کریں۔ جبکہ آل انڈیا نوری ایجوکیشن مشن کے چیئر مین مولانا سید اکرم نوری نے کہا کہ اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان سمیت کئی ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس زبان میں روزگار کے بھی بہتر مواقع ہیں لیکن ہماری لاعلمی نے ہمیں اس سے کوسوں دور کر کے رکھا ہے اس لیے اس زبان کے تئیں ہمیں بیدار ہونا ہوگا۔ دوسرے مقررین نے بھی اردو کی بقا اور تحفظ کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔

روزنامہ 'تاثیر' بہار، 21 جنوری 2019

تلنگانہ

ادب گاہ کا اکتیسواں ورکشاپ

حیدر آباد: نو آموز قلمکاروں کو معیاری شاعری کے ساتھ معیاری نثر کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے، تاکہ شہر حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی ادبی روایتیں پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہ سکیں۔ ان خیالات کا اظہار ادب گاہ کے اکتیسویں ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید کمال نے کیا۔ انھوں نے فی البدیہہ مشاعرہ کا راست مشاہدہ کرنے کے بعد بے حد مسرت کے ساتھ کہا کہ اس طرح برجستہ فی البدیہہ طبع آزمائی کرنا یقیناً باصلاحیت فنکاروں کا کام ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی سعید حسین نے کہا کہ ہم نے بہت سے اجلاس اور ادبی محفلوں میں شرکت کی ہے مگر اس ورکشاپ اور مشاعرے میں آکر دلی مسرت ہو رہی ہے جہاں پختہ مشق اہل قلم کے ساتھ ساتھ نو مشق شعرا بھی اپنے فن کا کمال بہترین انداز میں پیش کرتے نظر آرہے ہیں۔ ورکشاپ کی ابتدا صدر ادب گاہ سردار سلیم کے درس سے ہوئی جس میں شاعری کے اسرار و رموز پر مفصل گفتگو کی گئی، بالخصوص حرف شناسی، الفاظ کی نشست و برخواست اور حروف علت کے گرنے دبنے کی کیفیات پر بات کی گئی۔ سردار علیم نے اپنے لیکچر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ سمجھایا کہ حروف علت کو کن الفاظ میں گرایا جا سکتا ہے اور کن الفاظ میں گرایا نہیں جا سکتا، لیکچر کے بعد فی البدیہہ مشاعرہ منعقد ہوا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، 8 جنوری 2019

عصر حاضر میں اردو رسائل کا معیار

حیدر آباد: زندہ قومیں ہر دور میں اپنی زبان و ثقافت کو باقی رکھنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کرتی ہیں۔ اردو چوں کہ ایک زندہ و تابندہ زبان ہے، اس کا اپنا وجود خود کسی سہارے کا محتاج نہیں کیونکہ آج بھی ناگفتہ بہ حالات میں اردو اپنی بے پناہ کشش کے باعث ایک جہان کو مسحور کیے ہوئے ہے۔ ان فکر انگیز و دور رس خیالات کا اظہار سرزمین حیدر آباد کی ممتاز و متحرک ادبی و ثقافتی تنظیم بزم فروغ اردو کے زیر اہتمام منعقدہ ایک علمی مذاکرہ بہ عنوان 'عصر حاضر میں اردو رسائل کا معیار' میں کیا گیا۔ سائبان بیرون فتح دروازہ میں ہوئی اس محفل کی صدارت صاحبزادہ مجتبیٰ فہیم مدیر رسالہ رنگ و بو نے کی۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو جریدہ نکالنا کسی جوئے شیر لانے سے کم نہیں کیونکہ اس کے خریدار بہت کم ہوئے ہیں اور اشتہارات برائے نام دیے جاتے ہیں۔ میں داعی محفل ڈاکٹر م ق سلیم صدر شعبہ اردو شاداں کالج کو اس اہم موضوع پر مذاکرہ منعقد کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے ڈاکٹر م ق سلیم نے کہا کہ چند سال قبل تک اردو کے معیاری رسائل ہمیں نظر آتے تھے مگر آج رسائل تو بہت نکل رہے ہیں مگر ان کا معیار باقی نہیں رہا۔ مدیران صرف مالی منفعت کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اردو کے کثیر الاشاعت رسائل میں 'شمع' 'باجی' 'ہلال' 'کھلونا' 'فلمی ستارے' وغیرہ کا شمار ہوتا ہے تو دوسری جانب بیسویں صدی جیسے رسالے شائع ہوا کرتے تھے جن کا اپنا ایک حلقہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے ذریعہ نئے لکھنے والے تیار ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ناظم علی نے شرکائے مذاکرہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ معیاری رسالے اور ادب انسان کو زندگی سے قریب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ آج اردو رسائل پڑھنے والے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ادبی ذوق تو نوجوان نسل میں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آرہا ہے۔ اردو رسائل کو دیگر زبانوں کے رسالوں کی طرح اشتہارات ملتے ہیں تو اردو جرائد بھی معیار کو ملحوظ رکھیں گے۔ مذاکرے سے خطاب کرتے ہوئے کالم نویس محبوب خان اصغر نے کہا کہ چند ایک رسائل کو چھوڑ کر آج تمام رسائل رسماً جاری کیے جا رہے ہیں۔ حیدر آباد میں زمانہ دراز سے کئی معیاری رسائل نکلتے رہے ہیں۔ ان میں سب رس اور شگوفہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر جہانگیر احساس نے کہا کہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اردو کی بقا و دوام کے لیے معیاری رسائل و اخبارات کو جاری رکھا جائے۔ ڈاکٹر عزیز سہیل نے اس مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ انٹرنیٹ و دیگر الیکٹرانک ذرائع نے اردو اخبارات و جرائد کو شدید نقصان پہنچایا کیونکہ لوگ آج اردو اخبار یا جریدہ خریدنے کے بجائے آن لائن پڑھنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اس موقع پر محمد آصف علی ہیڈ روبی نیوز چینل نے کہا کہ انٹرنیٹ کے اس دور میں اردو اخبارات و جرائد کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کیوں کہ جو لطف ہارڈ کاپی کو دیکھ کر پڑھنے میں آتا ہے وہ مزہ آن لائن میں نہیں ہے۔ محسن خان نے عصر حاضر میں 'اردو رسائل کا معیار' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ رسالے قوم کا اثاثہ اور ترجمان ہوتے ہیں۔ محسن خان نے سوال کیا کہ لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے اور لاکھوں دلوں پر حکمرانی کرنے والے یہ رسالے آخر کیوں بند ہو گئے؟ محسن خان نے اپنے مقالے میں کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ رسالوں کے ایڈیٹروں کو جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں لانی چاہئیں اور موجودہ دور کی نوجوان نسل کو پیش نظر رکھ کر رسائل کو ترتیب دینا چاہیے۔ اس موقعے پر صاحبزادہ میر وقار الدین علی خاں، محمد تمیز الدین نے بھی محفل سے خطاب کیا۔ جاوید علی افروز نے اس اہم مذاکرے کے انعقاد پر ڈاکٹر م ق سلیم کو مبارک باد پیش کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر م ق سلیم، صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، سائبان، بیرون فتح دروازہ، حیدر آباد، تلنگانہ، 2 فروری 2019

مہاراشٹر:

سائنسی نمائش کا انعقاد

سولاپور: طلبا میں سائنسی نقطۂ نظر اور تحقیقی صلاحیت کو پروان چڑھانے کے لیے سول اردو ہائی اسکول میں سائنسی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ مدرسہ ہذا کے صدر مدرس

جناب عبدالجبار شیخ کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا۔ طلبہ و طالبات نے کل 90 سائنسی نمائشی ماڈلس پیش کیے۔ اس میں ہائیڈرولک پاور پلانٹ، قطرہ قطرہ پاشی اسمارٹ سٹی، ہائیڈرولک لفٹ، بارش کے پانی کا احسن انتظام اے ٹی ایم مشین، بورویل مشین روم ہٹر، پروجیکٹر، پاور بینک آٹو مینک، کمپاؤنڈ لائٹ کنٹرول قابل ذکر ہیں۔ دوپہر کے سیشن میں منعقدہ جلسے کی صدارت صدر مدرس عبدالجبار شیخ نے کی۔ بطور مہمان صادقہ باغبان میڈم اور نیلوفر وڈوان میڈم نے شرکت کی۔ جلسے کی نظامت شکیل خیری نے بحسن وخوبی انجام دی۔ جج کے فرائض صادقہ میڈم اور نیلوفر میڈم نے ادا کیے۔ بہتر سائنسی ماڈلس کے لیے طلبا و طالبات کو انعامات سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' 5 جنوری 2019

ہریانہ:

پانی پت میں کل ہند مشاعرہ

ہریانہ: یوم جمہوریہ کے موقعے پر ہریانہ اردو اکادمی پنچکولہ، ہریانہ کے زیراہتمام ضلع انتظامیہ پانی پت کی جانب سے کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ ڈپٹی چیئرمین و ڈائرکٹر ہریانہ اردو اکادمی کی توجہ ضلعی سطح پر تقریبات منعقد کرانے کی طرف گامزن ہونے کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جشن یوم جمہوریہ کی مناسبت سے پوائنٹ سنسکرت اسکول، سمپ متل میگامال پانی پت میں منعقد اس تقریب کے مہمانان خصوصی و مہمانان ذی وقار میں کرشن لال پنوار ہریانہ روڈویز وزیر، محترمہ رینو شاہنواز حسین نئی دہلی، محترمہ کرن چوپڑا ڈائرکٹر پنجاب کیسری نئی دہلی، محترمہ روہتا ریوڑی، ممبر آف لجسلیٹو اسمبلی پانی پت شہری، مہیپال ڈھانڈا ممبر آف لجسلیٹو اسمبلی پانی پت نے شرکت کی۔

عرض گزاروں میں ڈائرکٹر ڈاکٹر چندر ترکھا و سمیدھا کٹاریہ کمشنر پانی پت کے نام شامل ہیں جنھوں نے گنگا جمنی تہذیب اور ملکی ثقافت کو بام عروج پر پہنچانے کا عزم کیا ہوا ہے اور ادب نوازی میں پیش پیش رہتے ہیں۔ مشاعرہ کے مدعو شعرا و شاعرات میں شین کاف نظام، ڈاکٹر مادھو کوشک، ڈاکٹر رانا گنوری، وگیان ورت، ڈاکٹر کمار پانی پتی، مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر کندن لال کندن اراولی، کے کے رشی، سراج پیکر، یوگیندر مدگل، ورہندر مدھر، تمیش پوتھ واری، اور سونیا نا گپال شامل تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 جنوری 2019

اعزاز و اکرام:

ذکیہ مشہدی

نئی دہلی: اردو کے ممتاز فکشن نگار اور مترجم ذکیہ مشہدی کو 'آخری سلام' ناول کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کے لیے

سال 2018 کا ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں ہوئی ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ کے دوران ہندوستان کی 24 زبانوں کے مترجمین کو ایوارڈ دیے جانے کے فیصلے کو منظوری دی گئی۔ ذکیہ مشہدی نے درجنوں علمی و ادبی کتابوں کے انگریزی، ہندی اور اردو میں ترجمے کیے ہیں جن میں ساہتیہ اکادمی کے لیے 'آخری سلام'، 'پکھیرو'، 'نیلا چاند' اور 'لداخ کا سایہ' کا اردو میں ترجمہ شامل ہے۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے 'پرائے چہرے'، 'تاریک راہوں کے مسافر'، 'صدائے بازگشت'، 'نقش ناتمام' اور 'یہ جہانِ رنگ و بو' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ گذشتہ دنوں جیوری کی میٹنگ میں ان کے نام کا فیصلہ اتفاق رائے سے ہوا۔

میٹنگ کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور معروف شاعر شین اشفاق، پروفیسر عتیق اللہ اور شموئل احمد شامل تھے۔ دیگر ایوارڈ یافتگان میں کشمیری کے لیے زماں آزردہ، میتھلی کے لیے صدر عالم گوہر، بنگالی کے لیے مبین الحق، تمل کے لیے کے ایم یوسف، ڈوگری کے لیے نرسنگھ دیو جموال، انگریزی کے لیے سوباشری کرشنا سوامی، ہندی کے لیے پربھارت ترپاٹھی، ملیالم کے لیے ایم لیلاوتی، پنجابی کے لیے ایل گرگ، راجستھانی کے لیے منوج کمار سوامی، سنسکرت کے لیے دیپک کمار شرما کے نام شامل ہیں۔ یہ ایوارڈز پچاس ہزار روپے اور امتیازی نشان پر مشتمل ہیں۔ تقسیم انعامات کی تقریب کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جنوری 2019

ڈاکٹر شائستہ خان بیدار

علی گڑھ: ڈاکٹر شائستہ خان بیدار کو خدا بخش لائبریری پٹنہ کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر شائستہ خان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں ڈپٹی لائبریرین کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر شائستہ بیدار کی ابتدائی تعلیم دہلی اور پٹنہ میں ہوئی۔ ڈاکٹر شائستہ بیدار خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر عابد رضا بیدار کی بیٹی ہیں۔ عابد رضا بیدار کا دور خدا بخش لائبریری پٹنہ

میں بحیثیت ڈائرکٹر لائبریری کی تاریخ میں سنہرے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ خدا بخش اورینٹل لائبریری میں ڈائرکٹر کا عہدہ گزشتہ 4 سال سے خالی تھا۔ مرکزی کابینہ کی تقرری کمیٹی نے ڈاکٹر شائستہ بیدار کی تقرری کو حال ہی میں منظوری دی ہے۔ مذکورہ تقرری تین سال کی مدت کے لیے ڈیپوٹیشن کی بنیاد پر عمل میں آئی ہے۔ لائبریری سائنس میں مشرقیات کی ماہر ہیں، مخطوطات شناسی اور ہند اسلامی مشرقیات میں علمی کاموں کے لیے اپنی مخصوص شناخت رکھتی ہیں، ہندوستان میں محفوظ مخطوطات کے بڑے ذخائر پر ان کی گہری نظر ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2019

ارشد فیروز

پٹنہ: گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ کو ایک لمبے انتظار کے بعد چیئرمین مل گیا ہے۔ محکمہ تعلیم میں انڈر سکریٹری ارشد فیروز نے لائبریری کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ اس وقت بہار اسٹیٹ مدرسہ بورڈ کے چیئرمین کا اضافی چارج بھی ان کے پاس ہے۔ 15 جنوری کو محکمہ تعلیم سے جاری مکتوب کے مطابق ارشد فیروز کو لائبریری کا کارگزار نامزد کیا گیا ہے۔ جون 2018 میں خالد مرزا کی مدت کار ختم ہو جانے کے بعد سے ہی یہ عہدہ خالی تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جنوری 2019

اختر کاظمی

بھیونڈی: اردو کے معروف سینئر صحافی اختر کاظمی کی 53 سالہ صحافتی خدمات کے اعتراف میں یومِ جمہوریہ کے

موقعے پر مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی ممبئی کے زیر اہتمام منعقدہ کل ہند مشاعرے کے اسٹیج پر مولانا ابوالکلام آزاد مالیاتی کارپوریشن حکومت مہاراشٹر کی جانب سے ممبئی پردیش بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر شری اشیش شیلار کے ہاتھوں اختر کاظمی کو بطور توصیفی اعزاز شال اور مومنٹو پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر مولانا آزاد اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کے چیئرمین شری حیدر اعظم اور خواجہ غریب نواز درگاہ کمیٹی اجمیر شریف کے فعال رکن جناب فاروق اعظم اور مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی کے اراکین وعہدیداران موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 جنوری 2019

جاوید وارثی

علی گڑھ: علی گڑھ میں ریاستی زرعی وصنعتی نمائش علی گڑھ میں معروف شاعر جاوید وارثی کو ان کی اردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اردو ہندی سمینار میں آزر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس سلسلے میں علی گڑھ کی مختلف علمی وادبی انجمنوں اور تنظیموں نے مسرت کا اظہار کیا۔ ہلال ہاؤس نگلہ ملاح سول لائن علی گڑھ میں ایک تہنیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت استاد الشعرا اور بزم نوید سخن کے سرپرست ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے علامہ قیصر اکادمی علی گڑھ کے بانی وصدر ڈاکٹر رضی امروہوی اور مہمان ذی وقار کی حیثیت سے انجمن گلشن ادب علی گڑھ کے سرپرست ڈاکٹر سرور مارہروی شامل ہوئے۔ نظامت سید بصیر الحسن وفا نقوی نے کی۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر ہلال نقوی نے پروگرام کا مقصد بتاتے ہوئے کہا کہ یہ اہل ادب اور علی گڑھ کے رہنے والوں کے لیے باعث مسرت ہے کہ علی گڑھ کی سرزمین سے وابستہ منفرد لب ولہجے کے شاعر جاوید وارثی کو علی گڑھ نمائش کے ایک بڑے پروگرام میں آزر ایوارڈ سے نوازا گیا اور بلاشبہ موصوف اس کے اہل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 فروری 2019

آفتاب نعمانی

نجیب آباد: ضلع مظفر نگر کے کھتولی کی جانب سے منعقد آل انڈیا مشاعرے میں نجیب آباد کے شاعر اور راشٹریہ سہارا کے بیورو چیف ڈاکٹر آفتاب احمد نعمانی کو مشاعرہ کمیٹی کی جانب سے اردو ادب کی خدمات کے عوض اعزاز سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر نعمانی اس سے قبل بھی دادری میں منعقد میراتھن مشاعرے میں شرکت کرکے نجیب آباد کا نام روشن کرچکے ہیں۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 4 فروری 2019

رسم اجرا:

ڈاکٹر ہاشم قدوائی: افکار و جہات

نئی دہلی: ''ڈاکٹر ہاشم قدوائی جیسے اصول پسند، باکردار اور بلند فکر لوگوں کی ضرورت آج زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کی ذہنی تربیت اور کردار سازی میں نمایاں کردار ادا کیا۔'' ان خیالات کا اظہار سابق گورنر سید سبط رضی نے مرحوم ڈاکٹر ہاشم قدوائی کی زندگی اور کارناموں پر مشتمل کتاب 'ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی: افکار و جہات' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر سلیم قدوائی کی مرتب کردہ اس کتاب میں اہم شخصیات کے دو درجن سے زائد مضامین ہیں۔ اس موقعے پر سابق ممبر پارلیمنٹ محمد ادیب نے کہا کہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی لکھنؤ اور علی گڑھ کی تہذیبی قدروں کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انھوں نے نئی نسل کی ذہنی اور علمی تربیت میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں اور کبھی اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس موقعے پر سابق مرکزی وزیر اور کانگریس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر شکیل احمد اور سابق وائس چانسلر پروفیسر جسپال سنگھ، سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 جنوری 2019

ڈاکٹر مہتاب آزاد

دیوبند: دیوبند کے معروف کوی وشاعر اور صحافی ڈاکٹر مہتاب آزاد کو سماجی وادبی تنظیم 'راشٹر کنکر اور دہلی پبلک لائبریری دہلی' کی جانب سے 'راشٹر بندھو اعزاز 2018' پدم شری ڈاکٹر رما کانت شکل، ڈاکٹر رام شرن گوڑ صدر دہلی پبلک لائبریری بورڈ، ڈاکٹر ونود ببر، سابق رکن اسمبلی گوری شنکر اور سماجی خدمت گار محترمہ ششی تیاگی کے ہاتھوں انھیں یہ ایوارڈ دیا گیا۔ ڈاکٹر مہتاب آزاد کو یہ ایوارڈ دیے جانے پر مقامی ادبی اور سماجی تنظیموں کے ذمے داران، قلمکاروں، کویوں اور شاعروں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سینئر صحافی اور سماجی خدمت گار اشوک گپتا نے ڈاکٹر مہتاب آزاد کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ مہتاب آزاد آہستہ آہستہ مگر مضبوطی کے ساتھ ادبی سفر پر رواں دواں ہیں، ڈاکٹر مہتاب آزاد نوجوان نسل کے طور پر دیوبند کی ادبی خدمات میں اہم رول ادا کررہے ہیں۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خوشی کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 16 جنوری 2019

ایلین

نئی دہلی: اردو کے مقبول ومعروف شاعر ڈاکٹر فریاد آزر کے پانچویں شعری مجموعہ 'ایلین' کا اجرا عالمی کتاب میلے کے آخری روز این سی پی یو ایل کے پویلین میں عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمٰن کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس سے پہلے موصوف کے شعری مجموعے 'خزاں میرا موسم، قسطوں میں گزرتی زندگی، بچوں کا مشاعرہ اور کچھ دن گلوبل گاؤں میں اردو کی شعری دنیا میں ایک نئے شعری دور کی آمد کر تمہید بن کر مقبول ہوچکے ہیں۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین عبدالرحمٰن نے کہا کہ آزر کی شاعری مجھے اس لیے بھی متاثر کرتی ہے کہ جس عمر میں شعرا عموماً عشق وعاشقی کی حدود سے آگے نہیں نکل پاتے اس نوجوانی کی عمر میں ڈاکٹر فریاد آزر نے قومی اور عالمی پیمانے پر ہورہی ظلم وزیادتی کے خلاف اپنی شاعری کو استعمال کیا۔ اس کے علاوہ اپنی عمر کے ہر موڑ پر آنے والے سماجی مسائل کو انھوں نے اپنے اشعار کے موضوع بنائے۔ صحافی جاوید رحمانی نے کہا کہ ڈاکٹر آزر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صدیوں سے چلے آرہے گھسے پٹے مواد کو اپنی شاعری میں بالکل جگہ نہیں دیتے ہیں بلکہ ہمیشہ نئے نئے موضوعات کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر فریاد آزر کے منتخب کلام کے ساتھ یہ محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 جنوری 2019

نگارستانِ اردو

مراد آباد: معروف مصنف ومحقق اور راشٹرپتی ایوارڈ و امیر خسرو وغیرہ متعدد پروقار اعزازات سے سرفراز ڈاکٹر معراج الحسن کے تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل تازہ تصنیف نگارستان اردو کا اجرا گورنمنٹ انٹر کالج مرادآباد میں اولین ایلومینائی کانفرنس کے دوران عمل میں آیا۔ اس رسم اجرا میں جوائنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات ڈاکٹر مہندر دیوڈی آئی او ایس پردیپ کمار دریدی اسرو دہرادون کے ڈائرکٹر

بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے شائع ہونے والا ششماہی ریسرچ جرنل 'دستک' کا اجرا

ظفر انور کی کتاب 'دلی جوایک شہر ہے' کے اجرا کا منظر

پرکاش چوہان کمشنر کسٹم جی ایس ٹی دہلی انل کمار مشرا المورٹہ کے چیف میڈیکل آفیسر جگ موہن سینی، سی اے اجیت کمار اگروال، منٹو سرعلی گڑھ کے پرنسپل فیصل نفیس، گورنمنٹ انٹر کالج کے پرنسپل محمد عظیم مدھوودون ڈاکٹر شویتا کوٹھیا، نثار احمد انصاری نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض جی آئی سی رام نگر کے لیکچرار سنجیو شرما نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 جنوری 2019

درخشاں

نئی دهلی: غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین اولیا میں ماہر تعلیم محمد الیاس ملک کے شعری مجموعہ 'درخشاں' کا اجرا عمل میں آیا۔ یوپی کے سابق وزیر ذہین ملک کی صدارت میں منعقد تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جے ڈی (ایس) کے سکریٹری جنرل کنور دانش علی، مہمان ذی وقار کے طور پر سابق رکن پارلیمنٹ محمد سالم انصاری، عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ، پروفیسر سلیم قدوائی، زیڈ کے فیضان ایڈوکیٹ ودیگر نے شرکت کی۔ اس موقعے پر عالمی اردو ٹرسٹ کے سربراہ عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ نے تخلیق اور تخلیق کار کی معاشرے میں کیا اہمیت وافادیت ہے اس پر روشنی ڈالی اور کہا کہ تخلیق کار کی معاشرے میں اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دنیا سے رخصت ہونے کے باوجود اپنی تخلیق کے سبب زندہ رہتا ہے۔ سالم انصاری اور صحافی وشاعر ڈاکٹر اسد رضا وغیرہ نے اپنے خیالات پیش کیے۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض امیر امروہوی اور انجینئر خالد علیگ نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 جنوری 2019

ششماہی ریسرچ جرنل 'دستک' کا اجرا

رانچی: جامعاتی سطح پر نکلنے والے رسائل میں شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی سے شائع ہونے والا ششماہی ریسرچ جرنل 'دستک' نے علمی وادبی حلقے میں اپنے پہلے شمارے سے ایک نئی پیش رفت کی ہے اور علاحدہ شناخت قائم کی ہے۔ یہ ہمارے لیے خوشی اور باعث افتخار ہے کہ اس کے مدیر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی ہیں جو ہمارے عزیز شاگرد اور شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی کے ایک ذہین اور تعمیری فکر رکھنے والے طالب علم رہے ہیں۔ اس رسالے کی ترتیب وتنظیم اور مشمولات ان کی ادبی، فکری اور تنظیمی صلاحیتوں کی ترجمان ہے۔ بلاشبہ اس رسالے میں طلبا، اساتذہ اور سنجیدہ قاری کے لیے وافر مواد، معیاری مقالات ومضامین کی شکل میں موجود ہیں۔ اس کے اداریے اور مضامین نئے اذہان کی ذہن سازی کا حکم رکھتے ہیں۔ متذکرہ خیالات کا اظہار ریسرچ جرنل دستک کے رسم اجرا کی تقریب میں مہمان خصوصی پروفیسر احمد سجاد نے کیا، انھوں نے مزید فرمایا کہ تازہ شمارہ جو قاضی عبدالودود پر مشتمل ہے وہ یقیناً قاضی صاحب کی شخصیت اور تحقیقی خدمات کی افہام وتفہیم میں معاون ثابت ہوگا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر منظر حسین، ڈاکٹر جمشید قمر، پروفیسر ابوذر عثمانی نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔ رسالہ کے مدیر صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے دستک کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہمارا بنیادی مقصد اردو طلبا میں ادب کی جوت جگانا، ان میں شعرفہمی اور ادب فہمی کا شعور پیدا کرنا ہے۔ صدارتی خطبہ پروفیسر شہناز رعنا نے پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 جنوری 2019

دلی جوایک شہر ہے

نئی دهلی: اردو کے ممتاز صحافی، کئی کتابوں کے مصنف اور شاعر ظفر انور کی نئی کتاب 'دہلی جوایک شہر ہے' کی تقریب رونمائی میں شرکا نے ظفر انور کی مخلص شخصیت اور ذمے دار تخلیقی کارناموں کو سراہا۔ اس موقعے پر یہ بات خاص کر محسوس کی گئی کہ وہ ادب اور صحافت کی بے لوث خدمت بڑے پیمانے پر کر رہے ہیں۔ شاعروں اور صحافیوں کی انجمن اردو برادری کے صدر دفتر واقع جوشی کالونی میں منعقد ایک تقریب کی صدارت کرتے ہوئے آل انڈیا مومن کانفرنس کے صدر ایڈوکیٹ فیروز احمد انصاری نے کہا کہ اس طرح کی ادبی محفلوں سے سماجی تحریکات کو طاقت ملتی ہے۔ کیونکہ ادب پر بات میں سماج کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ہوتا ہے اور وہ بات سامنے ابھر کر آتی ہے جو عام طور پر ہماری توجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہندوستان کو جوڑنے والی زبان ہے اور اس کا قلمکار جو بھی کام کرتا ہے وہ ملک میں اتحاد واتفاق کو بڑھاوا دینے والے کام ہیں۔ این ایم ڈی ایف سی کے سابق چیئرمین قاری محمد میاں مظہری نے کہا کہ ظفر انور نے 'دہلی کے لوگ' کے نام سے ایک نئی کتاب تحریر کی اور اس میں دہلی کی اہم شخصیات مثلاً مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ اور مولانا اخلاق حسین قاسمی جیسے لوگوں پر بھی مضامین لکھے۔ تحریک مزاحمت کے صدر ڈاکٹر سید مسعود علی نے کہا کہ اردو ایسی زبان ہے جو کسی بھی حال میں نفرت نہیں سکھلاتی اور اردو کا ادیب وصحافی صرف محبت، امن اور بھائی چارے کو فروغ دینے کا کام کرتا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 جنوری 2019

اردو شاعری

نئی دهلی: بین الاقوامی کتاب میلے میں ایم آر پبلی کیشنز کے زیر اہتمام پروفیسر ابن کنول کی کتاب 'اردو شاعری' کا اجرا فرماتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے استاد پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ پروفیسر ابن کنول کو اردو دنیا ایک افسانہ نگار کے طور پر جانتی ہے اور ان کی شہرت وعظمت ان کے افسانوں کی وجہ سے ہی ہے لیکن ان کی اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ایک افسانہ نگار جب تنقید لکھتا ہے تو اس کی تنقید میں بھی تخلیقیت کی جھلک ملتی ہے، انھوں نے کہا کہ اس کتاب کی ورق گردانی سے اندازہ ہوا کہ تقریباً تمام مشہور ومعروف شعرا پر انھوں نے مضامین قلم بند کیے ہیں، اور اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ تمام مضامین بہت ہی عام فہم اور سادہ زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اردو شاعری کے مصنف اور دہلی یونیورسٹی کے سینئر استاد پروفیسر ابن کنول نے اپنی کتاب

کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں کلاسیکل شعرا افضل پانی پتی، ولی دکنی، میر، نظیر اکبرآبادی، مصحفی، غالب، مومن کے علاوہ اقبال، حسرت، فراق، مخدوم، فیض، ن م راشد اور کیفی اعظمی تک چودہ مشہور و معروف شعرا پر مضامین موجود ہیں، تقریباً تمام مضامین میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ شعرا کے کلام کی خوبیوں اور ان کی شاعری پر گفتگو کے ساتھ ساتھ مختصر طور پر ان کی زندگی کو بھی پیش کیا جائے تا کہ شعرا کے کلام اور اس کے پس منظر کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 12 جنوری 2019

دوسرا جسم

پٹنہ: عتیق انظر کی شاعری میں جہاں بے وطنی کا درد جھلکتا ہے وہیں ان کی شاعری میں عصر حاضر کے مسائل، معاشرتی حس اور ژولیدہ زلف کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ یہ بات ان کا دوسرا شعری مجموعہ 'دوسرا جسم' کا اجرا کرتے ہوئے بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری اور معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری نے کہی۔ انھوں نے عتیق انظر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان کا تعلق بنارس سے ہے لیکن وہ 32 برسوں سے قطر کے محکمہ داخلہ سے وابستہ ہیں۔ قطر کی بے حد فعال تنظیم 'کاروانِ اردو قطر' کے بانی و صدر کی حیثیت سے اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نت نئے مسائل کو جگہ دی ہے اور انھوں نے معاشرتی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بے وطنی کے شکار افراد اور اپنوں سے دور رہنے والے لوگوں کے درد و فرقت کو بخوبی بیان کیا ہے۔ مسٹر نوری نے کہا کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'پہچان' 1994 میں شائع ہوا تھا اور دوسرا شعری مجموعہ 'دوسرا جسم' ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 15 جنوری 2019

وفیات:

کرشنا سوبتی

نئی دہلی: ہندی کی معروف ادیبہ کرشنا سوبتی کا 25 جنوری کو نئی دہلی کے پرائیوٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 93 برس کی تھیں۔

سوبتی 18 فروری 1925 میں گجرات- پنجاب صوبہ میں پیدا ہوئی تھیں، جو اب پاکستان میں ہے۔ تقسیم وطن کے دوران ان کا کنبہ ہندوستان آ گیا تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم دہلی اور شملہ میں حاصل کی۔ 2015 میں ملک میں عدم رواداری سے ناراض ہوکر انھوں نے اپنا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ واپس لوٹا دیا تھا۔ 1950 میں کہانی 'لاما' سے ادبی سفر شروع کرنے والی سوبتی عورت کی آزادی اور انصاف کے لیے آواز بلند کرتی تھیں۔ انھوں نے وقت اور سماج کو مرکز میں رکھ کر اپنی تخلیقات میں ایک عہد کو جیا ہے۔ ان کے ناول 'مترومرجانی' اور 'زندگی نامہ' کو ہندی کے آفاقی ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ سوبتی نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کویتاؤں سے کیا تھا، لیکن بعد میں وہ فکشن کی طرف مائل ہوگئیں، جس میں انھیں کئی ایوارڈ ملے۔ سوبتی کو 1980 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جنوری 2019

اقبال مجید

بھوپال: ہندوستان کے مشہور و معروف ادیب و افسانہ نگار اقبال مجید کا 18 جنوری کو بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ اقبال مجید بھوپال اردو اکادمی کے ڈائرکٹر بھی رہے۔

انھوں نے اردو میں متعدد کہانیاں اور ڈرامے لکھنے کے ساتھ ہی اردو ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کی۔ ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے لیے انھیں کئی قومی اور علاقائی سطح کے اعزازات سے نوازا گیا۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے ہوئے متعدد کتابیں سپرد قلم کیں۔ آگ کے پاس بیٹھی عورت، ایک حلفیہ بیان، تماشہ گھر، دو بھیگے ہوئے لوگ، شہر بدنصیب، قصہ رنگ شکستہ، نمک اور 'کسی بھی دن جیسی' کتابیں انھوں نے تصنیف کیں۔ قابل ذکر ہے کہ اقبال مجید اپنی کہانیوں اور افسانوں کے سلسلہ میں بڑے حساس تھے۔ اقبال مجید کی کہانیاں اور افسانے جدید عہد کی عکاس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں اور افسانوں میں ہمیشہ ادب کے تقاضوں کا پاس ولحاظ رکھا۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقہ سوگوار ہے اور ان کے انتقال کو زبان و ادب کا بڑا خسارہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اقبال مجید کی کہانیاں اور افسانے جدید عہد کے عکاس ہیں۔ اقبال مجید نے بھوپال کے بنگلہ نمبر 2، سورج فارم ہاؤس میں آخری سانسیں لیں اور دوپہر بعد اولڈ سیفیہ کالج میں واقع قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جنوری 2019

ظہور الدین

نئی دھلی: برصغیر کے ممتاز ادیب پروفیسر ظہور الدین کا 2 فروری 2019 کو جموں میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین

ریہاڑی قبرستان جموں میں کی گئی۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور اہلیہ ہیں۔ ان کے انتقال سے اردو زبان و ادب کو بڑا نقصان ہوا ہے۔ انھوں نے برسوں اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ ان کا شمار جموں وکشمیر کے مشہور و معروف ادیبوں، صحافیوں او ر دانشوروں میں ہوتا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین نے ڈرامانگاری، تنقید نگاری، ترجمہ نگاری اور صحافت نگاری میں ایک خاص شناخت قائم کی تھی۔ ان کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں جن میں جدید ادبی و تنقیدی نظریات، کہانی کا ارتقا، تعبیر و تاویل وغیرہ سرفہرست ہیں۔ وہ دوبار صدر شعبہ اردو کے علاوہ جموں یونیورسٹی کے رجسٹرار اور کنٹرولر امتحانات کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ انھیں اتر پردیش اردو اکادمی اور جموں وکشمیر کلچرل اکادمی کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 فروری 2019

یونس دہلوی

نئی دھلی: مقبول عام فلمی اور ادبی ماہنامہ 'شمع' کے سابق ایڈیٹر محمد یونس دہلوی کا گڑگاؤں میں طویل علالت کے بعد 7 فروری 2019 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 89 سال کے تھے۔

پسماندگان میں اہلیہ زینت کوثر دہلوی کے علاوہ ایک بیٹی سعدیہ دہلوی اور بیٹا وسیم دہلوی شامل ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بھائیوں ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ یونس دہلوی 'شمع' کے بانی حافظ محمد یوسف دہلوی کے بڑے بیٹے تھے اور انھوں نے 'شمع' کو مقبول عام رسالہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے ادارے سے اپنے زمانے کے معروف جریدے بانو، شبستاں، کھلونا، مجرم اور ہندی میں 'سشما' بھی شائع

ہوتے تھے۔ 'شمع' کو ادبی معموں کے سبب بھی خاص مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ وہ آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ وہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایڈورٹائزنگ اور پبلشنگ انڈسٹریز میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ وہ انڈین نیوز پیپر سوسائٹی (آئی این ایس) کے صدر کے علاوہ آڈٹ بیورو آف سرکولیشن (اے بی سی) کے ایگزیکیٹو ممبر بھی رہے۔ یونس دہلوی کو دہلی کی عیدگاہ کے نزدیک شیدی پورہ قبرستان میں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کردیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 فروری 2019

جاوید علی خان

نئی دہلی: آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے سینئر اناؤنسر جاوید علی خان کا 24 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ اطلاعات کے مطابق جاوید علی خاں ظہر کی نماز ادا کررہے تھے، اسی اثنا میں حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم

انتہائی خوش خلق اور ہر دل عزیز شخصیت کے حامل تھے اور وہ آل انڈیا ریڈیو اردو سروس سے گذشتہ 40 سال سے وابستہ تھے۔ انھیں اناؤنسنگ میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ قومی دنوں اور خاص مواقع پر انھیں اناؤنسنگ کی ذمے داری سونپی جاتی تھی۔ جاوید علی کے پسماندگان میں ایک بیٹی اور اہلیہ ہیں۔ ان کی نماز جنازہ بروز جمعہ صبح 10 بجے دائی والی مسجد میں ادا کی گئی او تدفین دہلی گیٹ قبرستان میں ہوئی۔ آواز کے جادوگر جاوید علی خاں کے اچانک انتقال سے آل انڈیا ریڈیو اردو سروس کے ملازمین اور کارکنان انتہائی دکھ اور صدمے میں ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جنوری 2019

ڈاکٹر نسیم اقتدار علی

شاہجہاں پور: آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی پہلی خاتون ممبر و ادیبہ اور سماجی کارکن ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کو 21 جنوری کو بعد نماز ظہر محلّہ باڑوز اول واقع عثمان باغ میں غمگین ماحول میں سپردخاک کردیا گیا۔ اس دوران شہر کی ملی، سماجی، علمی، مذہبی شخصیات نے آخری رسوم میں شرکت کی اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کا 82 برس کی عمر میں 19 جنوری کو انتقال ہوگیا

تھا۔ ان کے انتقال کی خبر سے ادبی و ملی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ لکھنؤ سے ان کا جسد خاکی لایا گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کو اپنے آبائی وطن شاہجہاں پور میں ان کے قائم شدہ آمنہ میموریل اسکول پبلک ہائی اسکول کے صحن میں بعد نماز ظہر جنازہ ادا کی گئی اور متصل عثمان باغ کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سرگرم مسلم خاتون تھیں۔ ان کے دل میں خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ انھوں نے اپنی والدہ آمنہ بیگم کے نام سے آمنہ میموریل اسکول قائم کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھیں اردو زبان و ادب سے گہرا شغف تھا۔ 2014 میں مضامین کے دو مجموعے 'دیدہ و شنیدہ' اور 'دھوپ چھاؤں چہرے' شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ وہ کئی ادبی اور سماجی تنظیموں سے بھی وابستہ تھیں۔ پسماندگان میں ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا عبداللہ ہے۔ ان کی بیٹی حمزہ قریشی دہلی کے انگریزی اخبار کی صحافی اور ملک کے سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی کی اہلیہ ہیں۔ نسیم اقتدار علی کے والد عزیز الرحمٰن خاں ڈپٹی کمشنر رہنے کے علاوہ شاہجہاں پور نگر پالیکا کے چیئرمین رہے۔ ساتھ ہی گاندھی فیض عام کالج منتظمہ کمیٹی کے 27 برس صدر رہے۔ نسیم اقتدار علی کی شادی آنولہ بریلی کے انجینئر اقتدار علی خاں سے 1953 میں ہوئی تھی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 جنوری 2019

پروفیسر محمد قمرالدین خاں

کٹک: معروف ماہر تعلیم، برہمپور یونیورسٹی کے سابق

وائس چانسلر پروفیسر محمد قمر الدین خاں 16 جنوری 2019 کی صبح کٹک میں 81 سال کی عمر میں عارضہ قلب کے سبب انتقال کرگئے۔ پروفیسر خان کی پیدائش 1938 کو کٹک (اڑیشا) میں ہوئی۔ اسکول اور کالج کے امتحانات انھوں نے اعلیٰ درجے میں پاس کیے۔ وہ اُتکل یونیورسٹی کے پہلے اسکالر ہیں جنھیں انگریزی لٹریچر میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ صوبہ اُڑیشا کے مشہور راونشا کالج میں بحیثیت صدر شعبۂ انگریزی انھوں نے تیس سال تک فرائض انجام دیے۔ ان کے بیشتر تحقیقی و تنقیدی مقالات قومی اور بین الاقوامی انگریزی رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ صوبہ اُڑیشا کے محکمۂ نصاب تعلیم و اشاعت کے ڈائریکٹر ہونے کا بھی انھیں شرف حاصل تھا۔ برہم پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہنے کے دوران انھوں نے یونیورسٹی کی کامیابی کے لیے بہت سے تعمیری پروجیکٹ تیار کیے اور وہاں پانچ انجینئرنگ اور ٹیکنیکل کالج قائم کیے۔ 1998 میں پروفیسر محمد قمر الدین خاں کو پروفیسر ایمریٹس (انگریزی) مقرر کیا گیا۔ انھوں نے شہر کٹک کے بہت سے تعلیمی اداروں میں بحیثیت صدر کے فرائض انجام دیے۔ اڑیسہ اردو اکادمی کے بانی ممبر ہونے کے ناطے صوبہ اُڑیشا میں اردو کے فروغ و اشاعت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ کئی سال تک وہ آل انڈیا ایسوسی ایشن فار انگلش اسٹڈیز کے وائس چیئرمین رہے اور اپنی رہنمائی میں متعدد سالانہ کانفرنس کا انعقاد کیا۔ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد میں کچھ عرصے تک بحیثیت مشیرِ اعلیٰ فرائض انجام دیتے رہے۔ سرِ دست وہ بحیثیت نوڈل آفیسر برائے اُڑیشا مختلف پروجیکٹ پر خدمات انجام دے رہے تھے اور انھیں کی محنت، لگن، کوشش سے گزشتہ 5 ستمبر 2018 کو وزیر اعلیٰ نوین پٹنائک کے ہاتھوں مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کی کٹک برانچ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اُن کی اردو تصنیف 'مغربی نشاۃِ ثانیہ پر مشرق کے ادبی و تہذیبی اثرات' سال 2016 میں منظرِ عام پر آئی اور ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی اور اس کتاب پر انھیں اتر پردیش اردو اکادمی سے خصوصی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پریس ریلیز: اطہر عزیز، ممبئی، 21 جنوری 2019

قاضی احتشام بچھرایونی

بچھراؤں: معروف شاعر قاضی احتشام بچھرایونی کا طویل علالت کے بعد 84 سال کی عمر میں 12 جنوری کو انتقال

ہوگیا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ قاضی صاحب کے بڑی تعداد میں شاگرد بھی ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ 'کیف غزل'

منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکا ہے۔ قاضی صاحب کی شاعری کا سفر منظر ہلدوری سے شروع ہوا۔ ان کے بعد رئیس نیازی بچھرایونی اور اپنے زمانے کے مشہور شاعر کیف بھوپالی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ قاضی صاحب کے انتقال پر ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ سرکردہ شخصیات نے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2019

علیم اللہ صدیقی

لکھنؤ: یش بھارتی ایوارڈ یافتہ، اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق سپرنٹنڈنٹ علیم اللہ صدیقی کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ان کا انتقال 7 جنوری کی شب میں تقریباً گیارہ بجے ہوا۔ مرحوم بہرائچ واقع اپنی سسرال ایک تقریب میں شامل ہونے کے لیے گئے جہاں انھیں سانس لینے میں دقت محسوس ہوئی، اسپتال لے جاتے وقت ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

8 جنوری کو بعد نماز ظہر ان کی تدفین عیش باغ قبرستان میں عمل میں آئی۔ مرحوم کی عمر تقریباً 65 برس تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ ایک بیٹا نعیم اللہ شامل ہے۔ انتقال کی خبر سے ادبی و سیاسی حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ علیم اللہ صدیقی نے اردو اکیڈمی میں 32 سال اپنی خدمات انجام دیں اور 2011 میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ مرحوم گیہوں کے ڈنٹھل سے ایسی فنکاری کرتے تھے کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا تھا۔ انھوں نے کعبۃ اللہ، روضہ اقدس، تاج محل سمیت کئی تاریخی عمارتوں کو گیہوں کے ڈنٹھل کا استعمال کرکے کینوس پر پیسٹ کیا۔ انھیں اردو اور عربی کیلی گرافی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ان کی خدمات اور فنکاری کو دیکھتے ہوئے انھیں 2015 میں یش بھارتی اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 9 جنوری 2019

ڈاکٹر میمونہ وحید

حیدرآباد: حیدرآباد کی ممتاز ادیبہ و نامور نقاد ڈاکٹر میمونہ وحید اہلیہ جناب محمد مسعود علی بنت محمد وحیدالدین حسن ساکن اے سی گارڈ کا 16 جنوری 2019 کو چار بجے شام انتقال ہوگیا۔ تدفین درگاہ قادری چمن میں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر میمونہ وحید نے صدر شعبہ اردو (عثمانیہ) پرنسپل آرٹس کالج، ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ کے عہدوں پر خدمات انجام دی ہیں۔ وہ آرٹس کالج کی پہلی خاتون پرنسپل تھیں۔ ڈاکٹر میمونہ وحید ڈاکٹر محمد یوسف الدین حسن (فرح اسپتال) جہاں نما کی ہمشیرہ تھیں۔ نماز جنازہ میں ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی اور ڈاکٹر میمونہ وحید کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مزید تفصیلات فون نمبر 9484649206 پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 جنوری 2019

رئیس احمد وسیم

ہاپوڑ: رئیس احمد وسیم ہاپوڑی، جس نے تقریباً چالیس سالہ زندگی میں اردو ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ گذشتہ کچھ عرصے سے دل کے بیمار تھے۔ اسی مرض میں وہ ادبی دنیا کو داغ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کی شناخت علاقہ میں اچھی خاصی تھی۔ ان کی شاعری بہت پسند کی جاتی تھی۔ تحت اللفظ میں پڑھنے کا ان کا لب و لہجہ جداگانہ تھا جو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ ان کی تدفین قبرستان برادرِ سلمانی ہاپوڑ میں ہوئی۔ جنازہ میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد شاعری کی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اس موقعے پر استاد شاعر الیاس جالب نے گہرے غم کا اظہار کیا۔ واضح رہے کہ فروغ اردو زبان ٹرسٹ ہاپوڑ کے زیر اہتمام ماہانہ شعری نشست میں انھوں نے کئی بار شرکت کی اور اچھی شاعری سے نوازا۔ غم کی گھڑی میں فروغ اردو زبان ٹرسٹ ان کے اقارب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 17 جنوری 2019

شوکت علی ہاشمی

نئی دہلی: مجاہد آزادی شوکت علی ہاشمی کا 3 فروری 2019 کو 97 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ انھوں نے حویلی اعظم خاں میں واقع اپنی رہائش گاہ پر آخری سانس لی۔ شوکت علی ہاشمی نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دہلی میں پمفلٹ کے ذریعے وہ انگریزوں کے مظالم سے عوام کو بیدار کرنے کی سعی کرتے رہے۔ اس پاداش میں انھیں متعدد بار جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ آزادی کے بعد حکومت کی جانب سے مجاہدین آزادی کو ملنے والے 'سامرپتر' اعزاز سے انھیں نوازا گیا۔ مرحوم کے پسماندگان میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب ترکمان گیٹ پر واقع مسجد درگاہ فیض الٰہی میں ادا کی گئی، جبکہ سیکڑوں سوگواران کی موجودگی میں تدفین دہلی گیٹ قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی آخری رسومات میں سرکردہ سماجی، سیاسی، علمی اور ادبی شخصیات نے شرکت کرکے انھیں خراج عقیدت پیش کی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 4 فروری 2019

خراج عقیدت:

اقبال مجید اور ڈاکٹر ریحان انصاری

ممبئی: شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی میں افسانہ نگار اقبال مجید اور اردو زبان و ادب کے خادم ڈاکٹر ریحان انصاری کے انتقال پر تعزیتی نشست ہوئی۔ اس نشست میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر صاحب علی نے مرحومین کی شخصیت اور اردو زبان و ادب کے سلسلے میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اقبال مجید کی فکشن نگاری کی انفرادیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا لیکن تحریک کے سکہ بند تخلیقی رویہ کے دائرے میں محصور نہ رہتے ہوئے ایک ایسے فکشن نگار کے طور پر اپنی شناخت بنائی جس کے یہاں تخلیقی تنوع اور ہمہ گیریت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کے فکشن میں انسانی وجود کے درون میں پوشیدہ نفسیاتی و جذباتی اسرار کی گرہ کشائی معاصر سماجی رویوں اور تہذیبی روایتوں کے تناظر میں نظر آتی ہے۔ پروفیسر صاحب علی نے ڈاکٹر ریحان انصاری کے ناگہانی انتقال کو شعبہ اردو کا ذاتی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ مرحوم اس شعبہ سے اردو رسم الخط کے موضوع پر پی ایچ ڈی کررہے تھے اور شعبے کے ادبی اور کلچرل پروگراموں میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر ریحان انصاری اگرچہ پیشے کے اعتبار سے طبیب تھے لیکن اردو زبان و ادب کے ساتھ ان کی والہانہ وابستگی اظہر من الشمس ہے۔ انھوں نے جدید تکنیکی سہولت سے استفادہ کرتے ہوئے اردو رسم الخط کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے فیض نستعلیق کے نام سے اردو فونٹ ایجاد کرکے کمپیوٹر میں اردو ٹائپنگ کو تنوع عطا کیا۔ پروفیسر صاحب علی نے اقبال مجید اور ڈاکٹر ریحان انصاری کے انتقال کو اردو زبان و ادب کا بڑا نقصان قرار دیا اور کہا کہ ان مرحومین کی زبان و ادب سے متعلق خدمات ایک مدت تک یاد رکھی جائیں گی۔ اس کے علاوہ دوسرے شرکا نے بھی دونوں مرحومین کو خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 22 جنوری 2019

محسنہ شوکت سلطان

اعظم گڑھ: شبلی نیشنل کالج کے سابق پرنسپل مرحوم شوکت سلطان کی اہلیہ اور ڈاکٹر سلمان سلطان کی والدہ اور علامہ شبلی نعمانی کی پوتی محسنہ شوکت سلطان کے انتقال پر کالج کیمپس میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر غیاث اسد خاں نے کی۔ اس موقعے پر پرنسپل نے محسنہ شوکت سلطان کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھیں اس کالج کے بانی علامہ شبلی نعمانی کی پوتی ہونے کا شرف حاصل تھا اور وہی خاندان شبلی کی آخری چشم و چراغ تھیں، اس وجہ سے یہ خبر مزید اندوہناک ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مرحومہ کا انتقال پاکستان میں مقیم ان کی بیٹی کے یہاں ہونے کی وجہ سے خبر دیر سے لیکن دل دہلا دینے والی ملی۔ ہم تمام لوگ ڈاکٹر سلمان سلطان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شباب الدین نے کہا کہ مرحومہ علامہ شبلی کی سگی پوتی اور علامہ شبلی کے سلسلے کی اخری کڑی اور بڑے مرتبے کی خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کی پرورش بڑی ریاضت کے ساتھ کر کے انھیں اعلیٰ تعلیم سے سرفراز کیا۔ اس موقعے پر دوسرے احباب نے بھی تعزیتی پیغامات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 جنوری 2019

بزمِ کیف

پٹنہ: دبستانِ عظیم آباد کے معروف شاعر محمد یاسین کیف عظیم آبادی کی برسی کے موقعے پر 'بزمِ کیف' کی ایک یادگاری ادبی نشست محمد آصف نواز و ڈاکٹر زرنگار یاسمین کے دولت کدے پر 25 جنوری 2019 کو منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی، انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ کیف عظیم آبادی واردات قلبی کے بہترین اظہار پہ قادر ہیں، جب یہ اظہار سامعین و قارئین کے احساس کا حصہ بن جاتا ہے تو مقبول شاعری وجود میں آتی ہے بزم کیف کے صدر پروفیسر اسرائیل رضا نے تعارفی کلمات میں کہا کہ کیف عظیم آبادی کو غزلوں نے سنوارا اور مشاعروں نے اس طرح اچھالا کہ ان کی شہرت و مقبولیت سمندر پار تک پہنچ گئی۔ انھوں نے زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کو کچھ اس طرح شعری حسن کا پیکر عطا کیا کہ کلاسیکیت اور جدیدیت باہم گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہے، اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیف کی شاعری میں کلاسیکیت اور جدیدیت کی حسین آمیزش پائی جاتی ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر اسلم آزاد نے اس موقعے پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیف میرے دل میں رہیں گے۔ ان کی سادگی، خلوص اور اپنائیت اکثر یاد آتی ہے۔ مشہور فکشن نگار و مہمان ذی وقار پروفیسر عبدالصمد نے بزم کیف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ضروری تھا کہ کوئی ایسی بزم جو شعر و ادب کی بھی محفل آراستہ کرے اور تعلیم و تربیت کے شعبے میں بھی کام کرے، میں اس کام کے لیے ہر طرح تعاون دینے کے لیے تیار ہوں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے بزم کیف کے تحت ہونے والے پروگرام کی روداد بیان کی۔ اس موقعے پر بزم کیف کے ڈائرکٹر آصف نواز نے پروفیسر عبدالصمد، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر اسلم آزاد، فرزانہ اسلم کو شال اوڑھا کر عزت افزائی کی۔ مشتاق احمد نوری، سابق سکریٹری بہار اردو اکادمی، ڈاکٹر جاوید حیات، صدر شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی نے بھی کیف سے متعلق اپنی یادوں کو شیئر کیا۔ اس موقعے پر ایک مخصوص شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی اور نظامت فخرالدین عارفی نے کی۔ اخیر میں ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: آصف نواز، پٹنہ 26 جنوری 2019

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.......................... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

وحشت کلکتوی (مونوگراف)

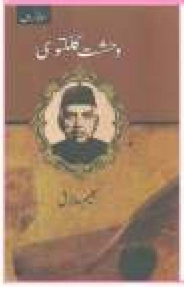

مصنف: کلیم حاذق

صفحات: 140

قیمت: 82 روپے

بیگم سلطان جہاں (مونوگراف)

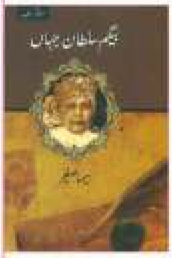

مصنف: سیما صغیر

صفحات: 144

قیمت: 83 روپے

خواجہ حیدر علی آتش (مونوگراف)

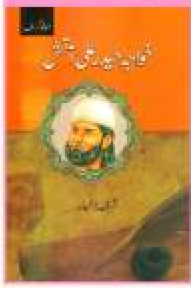

مصنف: شرف النہار

صفحات: 105

قیمت: 70 روپے

غلام رسول نازکی

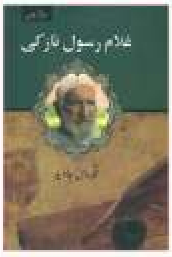

مصنف: قدوس جاوید

صفحات: 87

قیمت: 65 روپے

ساجد رشید (مونوگراف)

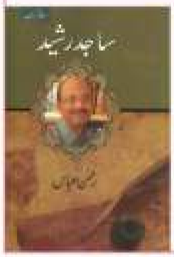

مصنف: رحمٰن عباس

صفحات: 123

قیمت: 77 روپے

رشید حسن خاں (مونوگراف)

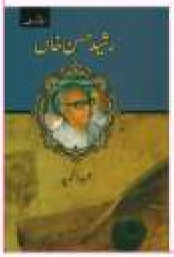

مصنف: عبدالحمید

صفحات: 122

قیمت: 75 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)

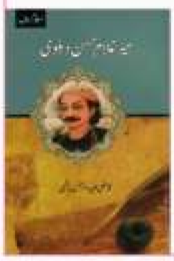

مصنف: قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

صفحات: 126

قیمت: 77 روپے

حسن نعیم (مونوگراف)

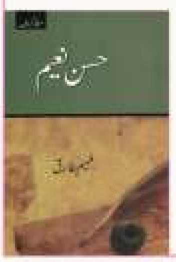

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 143

قیمت: 85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, March-2019, Vol.21, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/02/2019**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025